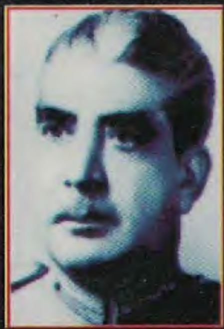
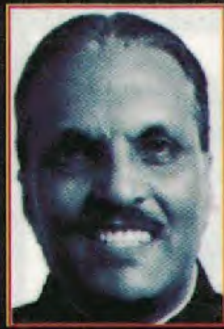
   

جو میں نے دیکھا

پاکستانی سیاست اور حکمرانی کی اندرونی کہانی

راؤ رشید



جو میں نے دیکھا

پاکستانی سیاست اور حکمرانی کی اندرونی کہانی

راؤ رشید

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

نام کتاب۔ جو میں نے دیکھا مصنف۔ راؤ رشید
اشاعت۔ جنوری 2010ء ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-8455-60-0

قیمت-/280 روپے

اہتمام:
فرخ سہیل گوئندی

JUMHOORI PUBLICATIONS
2-Aiwan-e-Tijarat Road Lahore, Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:jumhoori@yahoo.com

انتساب

ان کارکنان تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کے نام جنہوں نے 1977ء سے لے کر 1988ء تک جنرل ضیاء کے ظالمانہ فوجی نظام کے خلاف عظیم جدوجہد کی۔ جس کی راہ میں انہوں نے بے مثال اور انمٹ قربانیاں دیں جو جمہوریت کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے پھانسی کے تختہ پر جھول گئے۔ جن کی کھال فوجی عدالتوں کے حکم پر کوڑوں سے ادھیڑ دی گئی۔ کئی جو طویل نظر بندی کے دوران اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ جن کے کاروبار تباہ ہوئے۔ جو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جو ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ جن کی جدوجہد آج بھی جمہوریت کے دلدادہ پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

فہرست

تعارف

راؤ رشید جیسے انسان زندہ معاشروں کی شناخت ہوتے ہیں۔ جو اپنی زندگی، اصولوں، ایمانداری، جرأت، ہمت اور انسان دوستی کی بنیادوں پر گزارتے ہیں اور اس کے عوض کئی مادی مفادات تو درکنار، حکومتی، ریاستی بلکہ معاشرے سے Reward کے بھی خواستگار نہیں ہوتے۔ راؤ رشید اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر بڑی کم عمری میں پاکستان کے اہم سرکاری عہدوں پر پہنچ گئے۔ 1977ء میں ملک میں ایک ایسی فوجی آمریت وارد ہوئی جس کے بادل آج تک نہیں چھٹے، اسی فوجی آمریت نے پاکستان کے عوام کے منتخب راہنما جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پابند سلاسل کر دیا اور ان کو ریاستی سطح پر قتل کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ اس فوجی آمر ضیاء الحق کو پاکستان کے طاقتور طبقات کے علاوہ دنیا کی طاقتور قوتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ عوامی حلقوں کے علاوہ حکومتی ایوانوں میں کوئی بھی اس آمر کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ پاکستان میں جبر اور خوف کی جو فضا جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں قائم کی پاکستان میں اس کی نظیر نہیں ملتی، ظلم اور جبر کی اس فضا میں راؤ رشید کو دبانے اور خریدنے کے لیے ضیاء الحق نے ہر سطح پر کوششیں کیں، تاکہ ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان کی تاریخ سے جسمانی سطح پر صاف کر دیا جائے۔ ضیاء آمریت نے اس سلسلے میں جن اشخاص سے سب سے پہلے رابطہ کیا راؤ رشید ان میں سر فہرست تھے۔ راؤ رشید نے ضیاء آمریت کی پیشکشوں کو رد کرتے ہوئے سچائی کا راستہ اپنایا۔ اور اس کی پاداش میں نہ صرف وہ اپنے سرکاری عہدے سے ہٹا دیئے گئے بلکہ ان کو پابند سلاسل بھی کر دیا گیا۔ یہاں سے ایک نئے راؤ رشید نے جنم لیا۔ جب تحریک بحالی جمہوریت (MRD) کا آغاز کیا گیا تو راؤ رشید اس عوامی جدوجہد کے روح رواں کے طور پر سرگرم نظر آئے۔ ان کا یہ کردار پاکستان کی جمہوری اور عوامی تاریخ میں انمٹ کردار ہے۔ راؤ رشید کمٹمنٹ کی عظیم مثال ثابت ہوئے۔ 1988ء میں وہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت

میں مشیر خاص نامزد کیے گئے لیکن بعد میں حکومت سے اس بنیاد پر مستعفی ہو گئے کہ ہمیں عوام نے کرپشن کے لیے نہیں چنا۔اس کے بعد جب مرتضٰی بھٹو پاکستان تشریف لائے تو وہ ان کے آخری سانسوں تک ان کی جدوجہد میں شامل رہے۔

راؤ رشید پاکستان کی سیاست میں ایمانداری، اصول پسندی اور وفاداری کی اپنی ایک مثال ہیں۔زیر نظر کتاب سیاسی وحکومتی ایوانوں کے اندر تشکیل ان سازشوں اور حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے جن سے زیادہ تر عوام کو اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔راؤ رشید ان حقائق کو عوام کی امانت تصور کرتے ہیں اور عوام کو آگاہ کرتے ہیں کہ حکومت وسیاست کے ایوانوں میں کیسی کیسی سازشیں کی اور چالیں چلی جاتی ہیں۔راؤ رشید کی زیر نظر کتاب پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

6 مئی 2004ء

کیوں، کہاں اور کیسے؟

جون 1978ء کے ایک غیر معمولی طور پر گرم دن میں نے خود کو بدنامِ زمانہ اٹک جیل کی ایک کوٹھڑی میں قید پایا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ میں نے 25 سال پہلے 1953ء میں عین اسی ضلع سے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ میں اس جیل کے نزدیک ہی رہتا تھا اور دفتر جاتے ہوئے ہر صبح اس کے سامنے سے گزرتا تھا۔ میں اس وقت نوجوان ہوتا تھا اور پولیس افسر کی وردی میں میری شخصیت نہایت دلکش لگتی تھی۔ راہگیر مجھے مرعوبیت اور رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے تاہم میں ان پر بمشکل نگاہ ڈالتا تھا کیونکہ میرا سر تو ساتویں آسمان کو چھو رہا ہوتا تھا۔ میں اپنے تازہ حاصل کردہ فخر اور غرور کے عالم میں عام انسانوں پر دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

میں خود کو اس بدقسمت صورتِ حال میں جو پا رہا تھا تو اس کی کہانی کسی یونانی المیئے سے کم اثر آفریں نہیں ہے۔ میں اپنے کیریئر کے آخری برس میں اختیارات اور استحقاق کی اس بلندی پر پہنچ گیا تھا کہ جہاں تک رسائی پاکستان کے کسی حکومتی ملازم کے لیے عام طور پر ممکن نہیں۔ میں افسر شاہی کے نظامِ مراتب کے سب سے اونچے درجے یعنی بائیسویں گریڈ میں تھا اور وزیرِاعظم بھٹو کے خصوصی سیکرٹری نیز ان کے بااعتماد فرد کی حیثیت سے ملک میں ان کے بعد دوسرا بااختیار ترین شخص بن گیا تھا۔

جب چار اور پانچ جولائی 1977ء کی درمیانی شب پاکستانی فوج نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا تو مجھے بھی مسٹر بھٹو کے ساتھ گرفتار کر کے مارشل لا ضابطوں کے تحت قید میں ڈال دیا۔ تقریباً گیارہ ماہ حراست یا نظر بندی میں رکھا گیا۔ اس دوران بھٹو پر نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور بدنامِ زمانہ مسعود محمود سمیت دو وعدہ معاف گواہوں اور ایف ایس ایف کے چار دوسرے افسروں کے اعترافی بیانات کی روشنی میں لاہور ہائیکورٹ نے انہیں سزائے موت سنا دی تھی۔

یہ قتل اس وقت ہوا تھا، جب میں آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ قید کے دوران فوجی حکام نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مقدمے کے سرکاری گواہ کے طور پر پیش ہو جاؤں اور استغاثہ کی تائید کروں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ میں استغاثہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے دفاع میں گواہ کے طور پر پیش ہونے کو تیار ہوں۔ تاہم ایسا نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے مقدمے کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

چونکہ مجھے مسٹر بھٹو کو پھانسنے کے واسطے تیار کیے گئے جال کے لیے خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اس لیے مجھے اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک عدالت نے انہیں خطاوار قرار دے کر سزائے موت نہیں دے دی۔ آخر اپریل 1978ء میں مجھے رہا کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، جس کے ساتھ میرا بیانِ حلفی منسلک تھا، جس نے استغاثے کے موقف کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

راولپنڈی میں سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سے پہلے میں لاہور گیا اور ایک دوست کے گھر ٹھہرا۔ وہاں ایک نوجوان مجھے ملنے آیا۔ وہ رانا افتخار کا چھوٹا بھائی تھا۔ رانا افتخار ایف ایس ایف کا ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ اس مقدمۂ قتل کا ایک ملزم تھا اور اس نے ہائی کورٹ میں اعترافی بیان دیا تھا جس کی بنیاد پر اسے بھی دو دیگر ملزمان کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی۔ نوجوان نے مجھے بتایا کہ اس کا بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ آیا ہے اور گھر کے باہر کھڑا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس مقصد سے آیا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے اور وہ میری مدد لینے آیا ہے۔

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا بھائی ایف ایس ایف میں سب انسپکٹر تھا۔ مارشل لا نافذ ہونے کے فوراً بعد اسے محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، اس کے ساتھ ایف ایس ایف کے دیگر کئی افسروں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا جن میں ڈائریکٹر جنرل اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بھی شامل تھے۔ ایک دن اس کے بھائی اور دو دوسرے گرفتار سب انسپکٹروں کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا، جہاں انہیں جنرل چشتی کے سامنے پیش کیا گیا، جو اس زمانے میں سی ایم ایل اے کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس نے انہیں کہا کہ وہ پاکستان کے دشمن بھٹو کو پھانسی دینا چاہتے ہیں۔ ڈی جی ایف ایس ایف اور اس کا ڈپٹی پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے احکامات کے تحت نواب محمد احمد خان کو قتل کروایا تھا اور انہیں معافی دے دی گئی ہے۔ اگر وہ بھی مسٹر بھٹو کو پھانسی چڑھانے میں فوجی حکام کی مدد کرے گا تو اس کی جان بھی بچ جائے گی۔ اگر اس کا بھائی اور اس کے ساتھ دو دیگر گرفتار شدہ سب انسپکٹر بھی

اعتراف کرلیں اوراس کہانی کی تائید کریں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے حکم پر محمد احمد خان پر گولیاں چلائی تھیں تو انہیں معافی دے دی جائے گی یا معمولی سزائیں دی جائیں گی، جنہیں آخرِ کار معاف کر دیا جائے گا۔ اگر وہ ان کے احکامات پر عمل کریں گے تو انہیں ایف ایس ایف ہی میں رہنے دیا جائے گا، ترقی اور اراضی دی جائے گی۔ اگر انہوں نے عمل نہیں کیا تو انہیں محمد احمد خان کے قتل کا ذمہ دار قرار دے کر پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ مولانا طفیل محمد نے جو کہ اس کے بھائی کے ساتھی ملزم سب انسپکٹر رانا ارشد کا ہمسایہ تھا، ضمانت دی۔

چونکہ یہ وعدہ پاکستانی فوج کا ایک جنرل کر رہا تھا اس لیے انہوں نے اس پر بھروسہ کر لیا، اس کے علاوہ مولانا طفیل نے بھی ضمانت دی تھی، جو کہ جنرل ضیا کا ماموں مشہور تھا۔ ان کے خاندان کو امید تھی کہ مقدمے کے اختتام پر اس کے بھائی کو رہا کر دیا جائے گا لیکن جب انہوں نے سنا کہ نہ صرف اسے رہا نہیں کیا گیا بلکہ مسٹر بھٹو کے ساتھ سزائے موت سنا دی گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگا کہ میں اس کے بھائی کی جان بچانے کے لیے کچھ کروں۔ مجھے اس بے چارے پر بڑا ترس آیا لیکن میں اس آخری مرحلے پر ان کے لیے کچھ بھی کرنے سے خود کو قاصر پا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اگلے دن آئے۔

میں نے اپنے ایک دو وکیل دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر دھوکے کا شکار بننے والے تمام لوگ سپریم کورٹ میں ایک حلفیہ بیان جمع کروا دیں تو انہیں رہائی مل سکتی ہے۔

میں نے نوجوان کو یہی ہدایت کی۔ اس نے پوچھا کیا میں اسے کسی اچھے وکیل سے ملوا سکتا ہوں؟ اس زمانے میں سپیشل برانچ کے افسر جیپ میں ہر وقت ہر جگہ میرا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ میں ان سے بچ بچا کر رات کو دیر گئے اسے مشہور وکیل عابد حسن منٹو کے گھر لے گیا۔ وہ مقدمہ لینے پر راضی ہو گئے۔ اس نے اسے ایک سادہ پاور آف اٹارنی دیا اور کہا کہ وہ راولپنڈی جیل میں قید اپنے بھائی سے اس پر دستخط کروا لائے۔ جب وہ نوجوان جیل میں اپنے بھائی سے ملا، اس وقت تک مارشل لا حکام کو سن گن مل چکی تھی۔ حکام بہت زیادہ چوکس تھے۔ انہوں نے نوجوان اور اس کے باپ کو پکڑ لیا اور انہیں زبانی کلامی ڈرایا بھی اور لالچ بھی دیا تا کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں۔ جنرل چشتی نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ آ جانے کے بعد ہی ایسا ممکن ہے۔ وہ لالچ میں آ گئے۔ اس نوجوان کو ایف ایس ایف میں براہِ راست اے ایس آئی لگا دیا گیا اور اس کے باپ کا منہ بند کرنے کے لیے

آدھا مربع اراضی دے دی گئی۔

جب اگلے دن میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سننے کے لیے گیا تو میں نے باپ اور بیٹے کو کمرۂ عدالت میں وکلائے استغاثہ اعجاز حسین بٹالوی اور ایس اے رحمٰن کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں خرید لیا گیا ہے۔

وقفے کے دوران کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ پولیس میری کار کی نگرانی کر رہی ہے۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ سماعت ملتوی ہونے کے بعد میں باہر نکلا تو دیکھا کہ وردی پوش پولیس والوں سے بھری ایک اور جیپ میری کار کے نزدیک موجود ہے۔ جب میں اپنے گھر جا رہا تھا تو اس جیپ نے آگے آ کر میرا راستہ روک لیا۔ ایک افسر جیپ سے اترا اور مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد ایک کاغذ نکالا۔ وہ تین ماہ کے لیے میری گرفتاری اور اٹک جیل میں قید رکھنے کا حکم نامہ تھا۔ یہ امر واضح تھا کہ وہ مجھے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ میں ان کے منصوبوں کو ناکام نہ بنا سکوں۔

جیل میں مجھے ''شاہی احاطہ'' میں رکھا گیا، جہاں برطانوی عہدِ حکومت میں تاجِ برطانیہ کے ''مہمانوں'' کو رکھا جاتا تھا دوسرے لوگوں کے علاوہ خان عبدالغفار خان کو بھی وہاں کچھ عرصہ رکھا گیا تھا۔ اس سیل میں دو ایک جیسے کمرے تھے، جو دوسری بیرکوں سے کافی دور اور بالکل الگ تھلگ تھے۔ مجھے قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔

ایک رات خوفناک طوفانِ بادوباراں نے مجھے جگا دیا۔ ایسا لگتا تھا فطرت سخت غصے میں تھی۔ ہوا ضرور سو میل فی گھنٹہ سے زیادہ کی رفتار سے چل رہی ہو گی۔ بارش کے تھپیڑے سیل کے دروازے سے ٹکرا رہے تھے اور بجلی کی چمک مسلسل کمرے میں آ رہی تھی اور رات کو دن بنا رہی تھی۔ بادلوں کی مسلسل گرج سے کان بہرے ہوئے جا رہے تھے۔ سیل کے باہر یوکلپٹس کا ایک گھنا درخت موجود تھا۔ ہوا کے زور سے وہ بری طرح لہرا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کمزور چھت پر گر نہ جائے اور میں اسی میں دفن ہو جاؤں۔ طوفان گھنٹوں جاری رہا۔

میں تنہائی کی موت سے ڈرا ہوا لیٹا تھا کہ مجھے خیال آیا میرے سینے میں بہت سے راز ہیں اور اگر میں اچانک موت کا شکار بن گیا تو وہ بھی دفن ہو جائیں گے۔ اس وقت تک جیل آنا جانا میرا تقریباً معمول بن گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں وقت نکال کر تفصیل سے اپنی کہانی لکھ ڈالوں۔

اس رات میں نے سوچا کہ اپنے تجربات کو ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر رہا ہوں۔ رہا

ہونے پر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ ڈکٹیشن لینے کے لیے کوئی بااعتماد فرد ڈھونڈ دے۔ یہ کام کئی صحافیوں نے کیا، جو کہ مسلسل کام کرنے سے قاصر رہے۔ آخر مسٹر منیر احمد منیر نے ایک خام مسودہ مکمل کرلیا۔ ہمارے درمیان طے پاچکا تھا کہ وہ اسے شائع نہیں کرے گا اور مسودہ مجھے دے گا تاکہ میں جہاں ضروری ہو وہاں تبدیلیاں کرلوں اور اسے جامع اور قابلِ مطالعہ بنانے کے لیے اس میں اضافہ و ترمیم کر لوں۔ وہ سونے کا سوداگر ثابت ہوا اور اس نے دیکھا کہ وہ سونے کی کان پاچکا ہے۔ جب میں دوبارہ جیل گیا تو اس نے وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجھے بتائے بغیر اور میری منظوری لیے بغیر اسے خام صورت ہی میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔

مجھے تب اس کا پتا چلا جب میں ایک دن دفتر گیا اور دیکھا کہ سارے اردو اخبارات نے میری کہانی کی بنیاد پر سلگتی ہوئی سرخیاں لگائی ہوئی تھیں۔ اس بلا اجازت چھاپی جانے والی کتاب نے ملک میں طوفان برپا کردیا۔ یہ اردو کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب قرار پائی اور اس کی سینکڑوں ہزاروں جلدیں فروخت ہوئیں۔ اس کے تین ایڈیشن بہت کم وقت میں یکے بعد دیگرے شائع کیے گئے اور بہت سے غیر قانونی ایڈیشن بھی شائع کیے گئے، ایک تو ہندوستان میں بھی شائع ہوا۔ منیر نے خوب روپیہ کمایا لیکن مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ میں نے اس کے خلاف دیوانی مقدمہ دائر کیا لیکن انصاف نہیں پا سکا۔

کتاب کی مقبولیت دیکھ کر صحافیوں کے بہروپ میں کام کرنے والے بہت سے دھوکے بازوں نے مجھ سے اس کتاب کا مصدقہ ایڈیشن چھاپنے کی اجازت مانگی لیکن "دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے" کے مصداق میں نے انہیں انکار کردیا۔ آخر میرے دوست فرخ سہیل گوئندی نے اس کتاب کو چھاپنے کی پیشکش کی۔ انہوں نے حال ہی میں اپنی جہاں گردی کی زندگی ترک کی ہے اور پرستان میں شادی کرکے آئے ہیں۔ انہوں نے پبلشنگ کو اپنا مستقل پیشہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم دونوں پی پی پی کے منحرف اراکین کی حیثیت سے یکساں نظریات کے حامل ہیں اور میں ان سے خوب واقف ہوں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے میری کتاب Snobs and Spices بھی شائع کی تھی اور اپنا کام بہت عمدگی سے انجام دیا تھا۔ میں ان کی دیانتداری پر پختہ یقین رکھتا ہوں، اسی لیے میں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ان پر بھروسہ کیا ہے۔

میرے نام سے پہلے شائع ہونے والی کتاب میں واقعات، کمپوزنگ، ہجوں اور گرامر کی اتنی غلطیاں تھیں کہ مجھے اسے اپنی کتاب مانتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی تھی۔ اب میں نے اس پر نظرِ ثانی

کی ہے، اسے تبدیل کیا ہے، اس میں ترامیم کی ہیں اور اپنی تحریر کو بہتر بنایا ہے، جہاں ضروری تھا گرامر اور ہجوں کی اغلاط نیز اسے واقعاتی غلطیوں سے پاک کیا ہے۔ یہ میری کتاب ہے، ایک نئی کتاب، جسے میری منظوری سے شائع کیا جارہا ہے۔ میں اس کے مواد کی ذمہ داری لیتا ہوں اور اس میں موجود تمام واقعات اور تلخ حقائق کے سو فیصد سچا ہونے کی ضمانت دیتا ہوں۔

راؤ رشید

مارچ 2004ء

بچپن تعلیم علیگڑھ یونیورسٹی

ہمارا قصبہ کلانور (مشرقی پنجاب) مسلم راجپوتوں کا مرکز تھا۔ بڑے سکہ بند قسم کے راجپوت تھے۔ انہوں نے اپنے خون کی بڑی حفاظت کی تھی۔ وہ بڑی چھان بین سے شادیاں کرتے تھے۔ ماں کی طرف سے بھی اور والد کی طرف سے بھی۔ معاملہ ذرا سا بھی ادھر اُدھر نظر آتا تو وہ رشتہ نہیں کرتے تھے۔ س لحاظ سے انہوں نے اپنا خون صحیح رکھا ہوا تھا۔ بلکہ جو آس پاس کے یا دور دراز کے بھی راجپوت تھے، اپنی اصلیت کو سند کے طور پر پھر یوں پیش کرتے تھے کہ میری ماں کلانور کی تھی یا ہمارا رشتہ کلانور میں ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی راجپوتیت میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا تھا۔

کلانور بہت بڑا قصبہ تھا۔ کوئی دس ہزار کے قریب آبادی تھی...... میرا خیال ہے کہ آدھی سے زیادہ آبادی ہم مسلمان راجپوتوں کی تھی۔ زمین کی ملکیت ساری کی ساری مسلمان راجپوتوں کی تھی۔ یہاں تک کہ جو بڑے بڑے سیٹھ تھے...... جن کا کاروبار کلکتہ یا دور دراز علاقوں میں تھا، کروڑ پتی تھے لیکن جس زمین پر ان کے مکان بنے ہوئے تھے، وہ مسلمان راجپوتوں کی ملکیت ہوتی تھی اور ٹوکن کے طور پر وہ معمولی سا کرایہ دیا کرتے تھے، ایک روپیہ یا سوا روپیہ سال۔ جب ہندوؤں کی شادی بیاہ ہوتے تھے، تو وہ اپنے بیٹے کو گھوڑے پر چڑھا کے راجپوت مالک کے پاس سلام کے لیے لاتے تھے۔ اور وہ کچھ مٹھائیاں اور اس طرح کی اور چیزیں بھی لاتے تھے۔ یہ ان کی ایک رسم تھی کہ اس کے بغیر ان کی شادی مکمل نہیں ہوتی تھی۔ یہی ایک موقع ہوتا تھا جب کسی ہندو کو ہماری گلیوں میں گھوڑے پر چڑھنے کی اجازت تھی۔ ورنہ ہمارے گاؤں میں کسی غیر راجپوت کو گھوڑے پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہندو راجپوتوں سے ہمارے تعلقات تھے، برادریاں تھیں۔ پنچائتوں میں مسلمان اور ہندو اکٹھے بیٹھ کے فیصلہ کرتے تھے۔ تحریک پاکستان سے پہلے وہاں تعصب ہندو مسلمان کا نہیں تھا، راجپوت اور غیر راجپوت کا تھا۔ راجپوت اپنے آپ کو بڑا سپیریئر (بڑھیا) سمجھتے تھے اور اس لحاظ سے تھے بھی کہ

ساری ملکیت ان کی تھی۔ باقی جو قومیں تھیں ان کی پوزیشن ثانوی تھی۔ مزارے تھے یا پھر کمی تھے مثلاً کوئی کمہار کوئی موچی کوئی بھنگی تھے۔ اس طرح سے وہاں کے جو ساہوکار تھے، بنیئے تھے، پیسے کے لحاظ سے تو وہ بڑے آسودہ حال تھے، لیکن جہاں تک معاشرے میں ان کی سماجی حیثیت کا تعلق ہے وہ ان بیچاروں کی کچھ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس پوزیشن کو قبول بھی کیا ہوا تھا۔

راجپوت زیادہ تر فوج میں ہوتے تھے اور فوج میں بھی رسالے میں یعنی کیولری میں۔ اگر کسی گھر میں چار بیٹے تھے تو چاروں کے چاروں رسالے میں تھے۔ بزرگ بتایا کرتے تھے کہ پرانے زمانے میں جوان اپنا گھوڑا خود خریدتا تھا۔ پھر تین سال کے بعد تین مہینے کی فرلو پر گاؤں آیا کرتے تھے رسالے کے پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ جوان ایک ہی وقت میں اپنے گھوڑوں سمیت گاؤں میں موجود ہوتے تھے۔ پھر شادیوں پر، عید پر، بکرا عید پر، نیزہ بازی کے، پولو کے، گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے۔ بس یہی فوجی قسم کا ماحول تھا۔ باقی کسی بزنس میں یا کسی اور سروس میں ہمارے لوگ نہیں ہوتے تھے، اس کا ایک فائدہ بھی تھا کہ اس معاشرے میں نظم و ضبط تھا۔ نقصان یہ تھا کہ بڑی تنگ نظری تھی۔ اس لحاظ سے کہ سارے ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتے تھے۔ جس سے وہ باہر نہیں نکلتے تھے پھر وہاں ہماری برادری نے ایک سکول قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ چونکہ کلانور اس برادری کا ایک طرح سے مرکز تھا۔ اس لیے مسلم راجپوت ہائی سکول وہیں قائم ہوا۔ اس کی وجہ سے ہمارے لڑکوں میں، نوجوانوں میں، تعلیم کافی عام ہوگئی اور ہماری برادری کے جتنے بھی تعلیم یافتہ لوگ آپ کو نظر آتے ہیں۔ وہ سب کے سب اسی سکول کے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی وہیں سے فسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ ہم کل چار لڑکے تھے۔ جن کی فسٹ ڈویژن آئی۔ باقی ہمارے ساتھی سیکنڈ ڈویژن اور تھرڈ ڈویژن میں تھے۔ پھر میں علی گڑھ چلا گیا۔ میرے جتنے بھی کلاس فیلوز تھے ان سب میں میرا خیال ہے کہ میں نے ہی ایم اے اور ایل ایل بی کیا۔ باقی کسی نے کیا بھی تو زیادہ سے زیادہ ایف اے کیا۔

اس سلسلے میں اپنے بھائی راؤ سخاوت علی خاں مرحوم کا ذکر کروں گا۔ جو مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ رہے اور جن کی وجہ سے مجھے بھی اپنے بچپن میں وہاں کے سیاسی حالات دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔

میرے والد کا انتقال ہوا تو ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ سارا بوجھ والدہ پر پڑ گیا۔ بھائی راؤ سخاوت علی خان فوج میں تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ والدہ مرحومہ جب اتنے بڑے کنبے کی کفالت کے بوجھ سے تنگ آ کر رو رو کر بھائی مرحوم کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتیں تو ہم سب بہن بھائی بھی ہاتھ اٹھا کر ان کی دعاؤں میں شریک ہو جاتے تھے۔ چنانچہ والدہ کے اصرار پر اور اپنے کمانڈنگ افسر کے منع کرنے کے

باوجود بھائی صاحب فوجی ملازمت چھوڑ کر واپس آ گئے مجھے وہ لمحہ آج بھی اسی طرح یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ چوڑا چکلا 44 انچ کا سینہ کشادہ پیشانی، موٹی موٹی آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، سرخ بلیزر جس پر پیتل کے چمکتے ہوئے بٹن لگے تھے وہ انہوں نے پہن رکھا تھا۔ بے حد وجیہہ لگ رہے تھے والد مرحوم کا خلا تھا اس لیے میں ان سے منتھی ہو گیا۔ واپسی پر وہ سکول ٹیچر ہو گئے۔ انہیں مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ایک ذاتی لائبریری بنائی جس میں انگریزی اور اردو کی بے شمار کتابیں تھیں۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ، خاص طور سے ملکی سیاست سے اپنے آپ کو مکمل طور پر باخبر رکھتے تھے۔ رسالوں میں ''ریاست'' ''نیرنگ خیال'' اور ''نگار'' اخبارات میں مدینہ، زمیندار، اور 'انجام' وغیرہ باقاعدگی سے منگواتے تھے۔ میرے لیے پھول اور نونہال پر منگواتے۔ جب میں بڑا ہوا تو 'لندن نیوز' اور 'سپیکٹیٹر' جیسے رسالے بھی پڑھنے کو ملے بعد میں ریڈرز ڈائجسٹ اور 'ٹائم' ادب اور تنقید میں بھائی مرحوم نیاز فتح پوری سے بے حد متاثر تھے۔ مذہب میں بھی ان کی آزاد خیالی کے قائل تھے اور خود بھی ہر مسئلے پر نئے اور فطری انداز میں سوچتے تھے۔ میں چھوٹا ہی تھا تو مجھے بھی ادبی بحث میں گھسیٹتے۔ غالب اور مومن کا موازنہ کرتے۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علیخاں وغیرہ کی انقلابی شاعری سے مجھے انہوں نے ہی متعارف کرایا۔ نہرو کے 'اندرا کے نام خطوط'' گاندھی' اور 'ہٹلر' کی سوانح عمریاں انہی کی وساطت سے میں نے بچپن میں پڑھ ڈالیں۔ انہیں بے شمار شعر یاد تھے۔ جو اکثر گنگناتے رہتے۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو ایک شعر بہت گنگناتے تھے۔

جس نے دیا ہے درد دل
اس کا خدا بھلا کرے

میں اس چوٹ سے واقف نہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ ہر درد اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔ میں نے پوچھ لیا کہ بھائی صاحب درد تو خدا ہی نے دیا ہے۔ پھر خدا خدا کا کیسے بھلا کرے گا۔ ٹھٹھک گئے کچھ دیر میری طرف تکتے رہے۔ پیار سے گال پر ہاتھ پھیرا۔ کہا کہ یہ تمہیں کبھی پتہ چلے گا کہ درد کہاں سے ملتا ہے۔ لیکن جو دوست ملنے آتا اسے قصہ سناتے اور کہتے دیکھو میرا بھائی کتنا ذہین ہے۔ کیا سوال پوچھا ہے۔

ایک دفعہ ہم دہلی میں تھے۔ پتہ چلا کہ مولانا ظفر علی خاں آئے ہوئے ہیں۔ ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہ جامع مسجد کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ تعارف کرایا۔ پھر ان کی شاعری کا تذکرہ آیا۔ بھائی مرحوم نے مولانا کی نظمیں جو انہیں خاص طور پر پسند تھیں۔ سنانا شروع کیں۔ مولانا کا اتنا کلام بھائی مرحوم کو یاد تھا کہ مولانا خود حیران رہ گئے۔ بہت متاثر ہوئے اور خوش بھی بہت دیر تک بٹھائے

رکھا۔ کہا سخاوت میرا کلام جتنا تمہیں یاد ہے مجھے بھی نہیں۔

انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں بچپن سے ہی حصہ لیا اور ہر آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ میٹرک میں تھے کہ ڈسٹرکٹ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری نامزد ہوئے۔ ان دنوں پیدا ہونے والے ایک بھائی کا نام انہوں نے خلافت تجویز کیا تھا۔ خلافت کا دور ختم ہوا تو گاندھی اور نہرو سے متاثر رہے۔ ہمیشہ کھدر پہنتے تھے اور ہمیں بھی پہناتے تھے۔ اس مناسبت سے سکول میں لڑکے طنزاً مجھے بھی گاندھی کہتے تھے۔

مجھے یاد ہے سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان صاحب ہمارے گاؤں آئے۔ بھائی مرحوم نے اپنے چند ہم خیالوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ پولیس نے گاؤں میں چند حواریوں سے ان کے خلاف مظاہرہ کرایا۔ جس کا بھائی صاحب نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بعد میں نہرو اور پھر سبھاش چندر بوس کو گاؤں بلایا۔ سبھاش چندر بوس کی آمد مجھے یاد ہے۔ بے حد خوش شکل اور خوش رنگ انسان تھا۔ دودھ کا سا سپید کھدر زیب تن تھا۔ سبھاش چندر بوس اور گاندھی میں کشمکش ان دونوں زوروں پر تھی۔ بھائی مرحوم کی دلی ہمدردی بوس کے ساتھ تھی۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو روزمرہ کے حالات و واقعات میں ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ مجھے بھی باخبر رکھتے اور بحث مباحثہ کرتے۔ نیشنلسٹ اور محکوم ہونے کی مناسبت سے انگریزوں کی ہر شکست پر خوش ہوتے۔ جوش کی انقلابی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ جو لطف لے کر پڑھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کا شعر اکثر گنگناتے۔

فتح انگلش کی ہوتی ہے
قدم جرمن کا بڑھتا ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا برصغیر کے مسلمان قائداعظمؒ کے پرچم تلے جمع ہو رہے تھے۔ بھائی مرحوم بھی پاکستان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ خان قیوم اور میاں افتخار الدین وغیرہ نے مسلم لیگ میں بعد میں شمولیت اختیار کی۔ بھائی صاحب ڈسٹرکٹ رہتک مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اسی دوران فرقہ دارانہ کشیدگی شروع ہو گئی۔ گاؤں گاؤں جاتے۔ لوگوں کی ہمت بندھاتے، میری چھٹیاں تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ ساری فضا آلودہ تھی۔ ہُو کا عالم تھا جیسے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ ہمارے یہاں کشیدگی برادریوں میں ہوتی تھی۔ مذہب کی بنیاد پر نہیں۔ لیکن جیسے جیسے پاکستان کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ ہندو مسلمانوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ ایک گاؤں میں ہندو راجپوت لڑکوں نے

مسجد کو آگ لگا دی۔ ان کے بزرگوں کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک پنچایت کی۔ جس میں ہندو مسلمان راجپوت سب ہی شریک ہوئے۔ ہندو راجپوت بزرگوں نے معافی مانگی۔ مسجد کی مرمت کا ذمہ اٹھایا۔ لہٰذا پھر سے بھائی چارے کا ماحول بن گیا۔ وہاں کسی ہندو بزرگ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ دیا کہ ہم ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ایک انقلاب آیا تھا کہ علیحدہ علیحدہ راستوں پر چل نکلے تھے۔ اب پھر ایک انقلاب آ کھڑا ہے۔ کیوں نہ پھر اکٹھے ہو جائیں۔ آپ لوگ اپنا خون چھوڑ کر کہاں دوسرے ملک جائیں گے۔ یہ دعوت کمال خلوص اور سادگی سے دی گئی لیکن روایتی پنچایت کا اپنا رکھ رکھاؤ ہوتا تھا۔ وہاں صلح کی باتیں ہوتی تھیں۔ دوٹوک بات کر کے دل شکنی نہیں کی جاتی تھی بشرطیکہ بات میں خلوص ہو کتنی ہی ناواجب کیوں نہ ہو چنانچہ ہمارے کچھ بزرگوں نے جو عقیدہ کے تو بہت پکے تھے۔ مگر پنچائتی روایت بھی عزیز تھی۔ اٹھ کر کہہ دیا کہ بھائیو سوچ کر جواب دیں گے۔ بھائی مرحوم فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے بزرگوں سے کہا کہ کیا دین بدلنے کو تیار ہو، جواب ملا نہیں۔ بھائی مرحوم نے کہا کہ پھر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے اور پھر فوراً ہی پنچائیت میں جواب دیا کہ دین دونوں کو عزیز ہے نہ ہم بدلیں گے، نہ آپ سے توقع رکھتے ہیں۔ خود اپنے بزرگوں کی سادگی پر بہت محظوظ ہوئے اور ہمیشہ اس واقعہ کو یاد کر کے ہنستے تھے۔

بھائی مرحوم نے قائداعظمؒ کی آواز پر لبیک کہہ کر گرفتاری پیش کی۔ فیروز پور جیل لے جائے گئے۔ بتاتے تھے کہ کلائی چوڑی تھی اور ہتھکڑی چھوٹی۔ اس لیے راستہ بہت تکلیف میں گزرا۔

جیل میں نواب ممدوٹ، میاں افتخار الدین۔ میاں ممتاز دولتانہ، مولانا عبدالستار نیازی، ڈاکٹر عبدالوحید خاں اور علامہ علاؤالدین صدیقی غرضیکہ پنجاب مسلم لیگ کے سب لیڈر موجود تھے۔ بھائی مرحوم میں احساس کمتری کا نشان تک نہ تھا۔ نہ دولت سے مرعوب ہوتے تھے نہ عہدہ سے۔ مطالعہ کسی سے کم نہ تھا۔ بہت جلد ہر ایک سے گھل مل جاتے تھے۔ ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ قید پکنک میں تبدیل کر دی۔ چنانچہ جیل میں بہت مقبول ہو گئے شعر و شاعری وہاں بھی جاری رکھی۔ دو مشقتی ملے ہوئے تھے۔ ایک بہت لاغر دوسرا فربہ۔ چنانچہ انہوں نے موٹے کا نام ''جیل میں آنے سے پہلے'' اور پتلے کا نام ''جیل میں آنے کے بعد'' رکھ دیئے۔ یہ نام اتنا مقبول ہوئے کہ سب لوگ ان کے اصلی نام بھول گئے اور بھائی مرحوم کے دیئے نام سے پہچانے جانے لگے۔ ویسے تو سب سے مراسم تھے۔ لیکن فیروز سنز والے ڈاکٹر وحید سے بہت دوستی ہو گئی۔ جو آخر وقت تک قائم رہی۔ مسلمان جیلر بھی بہت دوست بن گیا۔ اس سے پاکستان بننے کے بعد بھی ملاقاتیں رہیں۔ جیل سے چھوٹے تو ملکی حالات بہت دگرگوں تھے۔ پاکستان بنتے ہی گرفتاریوں کے وارنٹ نکل آئے۔ بمشکل چھپ چھپا کر پاکستان پہنچے۔ ہندو افسر ہاتھ ملتے رہے گئے۔

بہرحال یہ تھا وہاں کا سیاسی ماحول۔ بھائی صاحب مرحوم کی سرگرمیوں کا ذکر اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا اور ان سرگرمیوں اور ماحول کو زیادہ قریب سے دیکھتا رہا۔ جس میں بھائی صاحب ملوث تھے میرے متعلق انہوں نے ہمیشہ اونچے ہی محل بنائے۔ ہمارے بزرگوں کی سوچ تو اس سے آگے نہیں جاتی تھی کہ میٹرک کر کے ملازمت کر لو۔ لیکن میں ابھی بچہ ہی تھا کہ بھائی صاحب نے اعلان کر دیا کہ میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجوں گا۔ میں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا۔ تو بھائی صاحب بہت خوش ہوئے اور مجھے علی گڑھ بھجوا دیا۔

میں وہاں چھ سال رہا۔ اس وقت پاکستان موومنٹ زوروں پر تھی۔ قائداعظمؒ ہر سال علی گڑھ آیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے لڑکے پاکستان موومنٹ میں پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں شملہ کانفرنس ہوئی کیبنٹ مشن پلان آیا قائداعظمؒ نے 'ڈان' اخبار جاری کیا۔ علی گڑھ کے زبیری نام کے ایک سٹوڈنٹ نے ''پاکستان ٹائمز'' کے نام سے ایک چھوٹا سا ہفتہ وار اخبار شروع کیا۔ پھر جب میاں افتخار الدین نے مسلم لیگ جائن کی تو وہ علی گڑھ آئے۔ انہیں یہ نام بڑا پسند آیا۔ انہوں نے اس لڑکے سے خرید کے پاکستان ٹائمز کے نام سے لاہور سے انگریزی اخبار جاری کیا۔ پھر 46ء کے جو الیکشن تھے، اس میں قائداعظمؒ کی اپیل پر علی گڑھ یونیورسٹی بند ہوگئی۔ ہم سب لڑکے پورے ہندوستان میں پھیل گئے پاکستان کے لیے علی گڑھ کے لڑکوں نے بڑا کام کیا۔ جب پاکستان بنا چھٹیاں تھیں۔ اس وقت میں اپنے گاؤں (کلانور) میں تھا۔

ہمارا ایک نوکر شیڈولڈ کاسٹ ہندو تھا ہمارے ہاں جو راجپوت غریب ہوتے تھے ان میں بھی نسلی تفاخر کا بڑا احساس پایا جاتا تھا ہندو جو تھے خاص طور سے شیڈولڈ کاسٹ ہماری بڑی عزت کرتے تھے۔ نیچے بیٹھتے تھے اور راجپوتوں کو ججمان کہتے تھے، یہ عزت کا ایک لفظ تھا میرا خیال ہے یہ گیارہ یا بارہ اگست کا دن تھا۔ وہ نوکر بڑا اچھا آدمی تھا۔ بڑا محنتی تھا میں چارپائی پر بیٹھا تھا وہ میرے پاس آ کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ججمان آج فلاں آدمی آیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ 15 اگست کو کھیر پکانی ہے۔'' میں نے اس سے پوچھا ''کس لیے کھیر پکانی ہے'' وہ کہنے لگا ''جی! وہ کہتا تھا ہم آزاد ہو گئے ہیں ہم انگریزوں سے ہی آزاد نہیں ہوئے بلکہ مسلمانوں سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔''

وہاں مقامی طور پر مسلمان راجپوتوں کی معتبری تھی جب ایک شیڈولڈ کاسٹ ہندو نے مجھے کہا کہ ہم آپ لوگوں سے بھی آزاد ہو گئے ہیں تو مجھے اچانک شاک سا ہوا کہ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ اس معاشرے کے ہم عادی تھے۔ حالانکہ میں بالکل نوجوان تھا لیکن میں بھی اس چیز کو قبول نہ کر سکا کہ معاشرے میں اتنی بڑی تبدیلی آزادی کی وجہ سے آئی ہے، بہرحال، فسادات پنجاب میں تو شروع تھے

لیکن ان کے اثرات ہمارے علاقے تک ابھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ پھر چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچا مجھے یاد ہے۔ چاندنی چوک میں سکھوں کا ایک گوردوارہ ہے۔ وہ سکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ سڑکوں پر کھڑے تھے۔ ان کا کوئی سکھ لیڈر تقریر کر رہا تھا۔ وہ لوگ بڑے سنجیدہ تھے اور بڑے غصے میں بھی تھے وہ لیڈر تقریر بڑی جوشیلی کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ دیکھو بھائیو! کتنا ظلم ہے کہ اس ملک میں جو ہمارے غلام تھے ہندو اور مسلمان ہندوؤں کو بھی ملک مل گیا۔ مسلمانوں کو بھی آزاد ملک مل گیا اور ہم جنہوں نے سو سال حکومت کی۔ (پنجاب پر) وہ کہیں کے بھی نہیں رہے کوئی ایسی جگہ نہیں جس کو ہم اپنا کہہ سکیں مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس وقت سکھوں کو یہ احساس تھا کہ آزادی جو ملی ہے وہ ان کے نزدیک سے ہو کے گزر گئی ہے۔ اس لیے کہ ان کی لیڈر شپ اپنے مسئلے کو صحیح طور پر حل نہیں کر سکی۔

اس کے بعد میں تو دہلی سے علی گڑھ چلا گیا لیکن میرا ایک دوست دہلی میں ٹھہر گیا۔ اگلے روز دہلی میں فساد شروع ہو گیا میرا وہ دوست جب علی گڑھ پہنچا تو اس نے بتایا کہ وہاں سے اس کا زندہ بچ نکلنا ایک معجزہ ہے وہ اس طرح کہ اس کا بھائی پولیس میں اے ایس آئی تھا۔ وہ لوگ سکھوں ہندوؤں کے محلے میں رہتے تھے۔ اس نے بتایا کہ میں سویا ہوا تھا۔ اچانک شور بلند ہوا۔ ایک دم سے میں اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو سکھ کرپانیں لہراتے ہوئے اس گلی میں داخل ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں مارو مسلوں کو مسلوں کو مارو وہ مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر قتل کر رہے تھے۔ میں چھت پر چڑھ گیا وہاں سے دوسرے گھر میں چھلانگ لگا دی اور بھاگ کر تھانے پہنچ گیا جو نزدیک ہی تھا اس طرح میری جان بچی ورنہ مارا جاتا۔"

میرا بھی ارادہ اس کے پاس ٹھہرنے کا تھا۔ اتفاق تھا کہ میں اس سے پہلے علی گڑھ پہنچ گیا۔

ہوتے ہوتے فسادات کے اثرات یوپی تک بھی پہنچ گئے۔ ٹرین کا سفر بڑا غیر محفوظ ہو گیا۔ سکھ مختلف پارٹیوں کی صورت میں ٹرینوں میں سفر کرتے تھے۔ مسلمانوں کو چُن چُن کے نکال لیتے تھے اور ایک ایک کر کے ہلاک کر دیتے تھے چونکہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لڑکوں نے پاکستان کی جدوجہد میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس لیے ہندوؤں کو کھٹکتے تھے اور وہ اس تاک میں تھے کہ کس طرح ان لڑکوں سے اس کا بدلہ لیا جائے لیکن ہماری تعداد بہت زیادہ تھی۔ میرا خیال ہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں پانچ چھ ہزار لڑکے تھے اور سارے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ہم نے اپنی حفاظت کے بندوبست کیے۔ ہر رات پہرے کا اہتمام کیا لیکن ہم اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اور یہی خطرہ رہتا تھا کہ آج حملہ ہوا۔ کل حملہ ہوا۔ پولیس وغیرہ سے یا ان کی ایڈمنسٹریشن سے ہمیں کوئی امید نہیں تھی۔ اس لیے کہ حالات اس قسم کے تھے۔ ٹینشن اتنی زیادہ تھی ہندو افسروں کو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

اس دوران میں سروجنی نائیڈو یوپی کی گورنر مقرر ہوئیں۔ ان کا تعلق حیدرآباد (دکن) سے

تھا۔ ویسے بھی بڑی لبرل عورت تھیں۔ ہمارے ایک پروفیسر ہوتے تھے ہادی حسن صاحب وہ بھی حیدر آباد کے تھے ان کے سروجنی نائیڈو سے بڑے پرانے مراسم تھے۔ وہ انہیں اپنا بیٹا کہا کرتی تھیں۔ تو ہادی حسن صاحب سروجنی نائیڈو کے پاس گئے اور اسے کہا کہ آپ علی گڑھ تشریف لائیں۔ اس لیے کہ وہاں لڑکوں میں عدم تحفظ کا بڑا احساس پایا جاتا ہے۔ آپ گورنر ہیں۔ آپ کے جانے سے انتظامیہ کو احساس ہوگا کہ لڑکوں کی حفاظت کرنا اس کی ذمہ داری ہے مجھے یاد ہے کہ سروجنی نائیڈو وہاں آئیں پہلے ہادی حسن صاحب نے تقریر کی وہ بھی اپنے زمانے کے بہت اچھے اوریٹر (خطیب) تھے۔ انہوں نے بڑی اچھی اور رواں انگریزی میں تقریر کی۔ اس کے بعد سروجنی نائیڈو کھڑی ہوئیں۔ وہ بڑی خوبصورت انگریزی بولتی تھیں۔ بڑی اچھی ان کی آواز تھی۔ انہوں نے پروفیسر صاحب کی تقریر کا بڑا اچھا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کسی کی مجال نہیں کہ آپکا بال بھی بیکا کرے اور یہ کہ انہوں نے ڈی سی کو ایس پی کو انتظامیہ سب کو ہدایات دی ہیں کہ لڑکوں کو کوئی گزند نہ پہنچے ان کے آنے سے ہماری بڑی ہمت بندھی اور عدم تحفظ کا احساس بھی بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی لیڈر شپ میں جو منافرت تھی سروجنی نائیڈو ٹائپ کے لوگ اس سے متاثر نہیں ہوئے وہ سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ صحیح معنوں میں سیکولر ذہن، ان کے بارے میں یہ بالکل احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہیں اور ہندوؤں کے لیڈر ہیں۔

اس کے بعد فروری یا مارچ 48ء میں ہماری کانووکیشن ہوئی۔ اس میں نہرو آئے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ اس سے ایک سال پہلے مارچ 47ء میں جو کانووکیشن ہوئی تھی اس میں لیاقت علی خاں آئے تھے وہ اس وقت عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے جو دوسرے ممبر تھے سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی وہ بھی آئے تھے۔ 1948ء میں جو کانووکیشن ہوئی اس میں نہرو آئے میں اس وقت لا فائنل میں تھا۔ پنڈت جی کے ساتھ ہمارا ایک گروپ فوٹو بھی ہوا۔ اس کی کاپی میرے پاس ہے لیکن یہ ایک بڑی ڈرامائی تبدیلی تھی کہ ایک سال لیاقت علی آئے اور اس سے اگلے سال نہرو۔ یہ ساری تاریخ کا ایک طرح سے نچوڑ تھا۔

میں نے وہاں سے ایم اے کا امتحان دیا۔ لا کا امتحان دیا اس دوران کافی مہینوں تک مجھے اپنے خاندان کے لوگوں کا اپنے بہن بھائیوں کا کوئی پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں۔ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کوئی خط و کتابت بھی نہیں ہوتی تھی جو خرچہ وغیرہ تھا وہ بھی نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یونیورسٹی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہاں ایک فیملی کی طرح سے لوگ رہتے تھے۔ اگر وقتی طور پر کوئی مصیبت پڑی ہے تو سب مل کے اس کا حل نکالتے تھے۔

کوئی پانچ چھ مہینے کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پتہ چلا کہ ہمارے گھر والے

پاکستان میں رینالہ خورد میں سیٹل ہوئے ہیں۔ رابطہ ہوا پیسے آئے تو وہ جمع ہو گئے۔

میرا ایک دوست تھا۔ اس کے بھی رشتے دار پاکستان میں تھے۔ امتحان دے کے ہم دہلی پہنچے۔ زاہد حسین صاحب پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ ان کے نام ہم ایک خط لائے کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح جلدی سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان پہنچا دیں ہم زاہد حسین صاحب سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں کوشش کروں گا۔ وہاں ایک بلڈنگ لی ہوئی تھی۔ جہاں پاکستان جانے والے ٹھہرے ہوئے تھے مثلاً بہت سارے گورنمنٹ افسران تھے۔ بہت سارے اور لوگ تھے۔ جو پاکستان آنا چاہتے تھے۔ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں مہینوں سے وہاں پڑے ہوئے تھے۔ وہاں ایک صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہوائی جہاز کا انتظار کرتے کرتے آپ کو مہینے لگ جائیں گے۔ اس دوران میں آپ کے پاس جو پیسہ ہے۔ وہ خرچ ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ آپ ٹرین کے ذریعے چلے جائیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ مشورہ تو واقعی صحیح ہے' پھر ہم ٹرین پر آگرے سے ہوتے ہوئے کھوکھرا پار کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے۔

راستے بھر ہمیں عدم تحفظ کا احساس تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک سفر محفوظ نہیں تھا چونکہ ہم نے پتلون قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان ہیں۔ ہم لوگ بھی بڑے محتاط تھے کسی طرح سے سفر مکمل کیا' کھوکھرا پار سے جو پہلے سٹیشن تھا۔ وہاں ریاست بیکانیر یا جودھ پور کا بارڈر پڑتا تھا۔ وہاں کا کسٹم انسپکٹر شکل وصورت سے بھی اور لباس سے بھی بالکل راجپوت لگتا تھا۔ اس نے ہمارے لوگوں کی طرح ٹیڑھا صافا باندھا ہوا تھا۔ ہندو تھا۔ لیکن اس کا سلوک بڑا اچھا تھا۔ اس نے کسی کی خاص چیکنگ وغیرہ بھی نہیں کی۔ البتہ عورتوں کی طرف سے بڑا شور پڑ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں جو کسٹم انسپکٹر ہے وہ سکھ ہے اور پاکستان سے آئی ہے۔ وہاں اس کے خاندان کے لوگ مارے گئے ہیں۔ اس لیے جو پاکستان جا رہے ہیں وہ خاص طور سے ان کو بڑا تنگ کرتی ہے۔ بہرحال کسٹم کا چیک ختم ہوا ہم پاکستان میں داخل ہوئے' ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب جان محفوظ ہے پھر حیدرآباد سے ہوتے ہوئے ہم رینالہ خورد پہنچے۔

جس طرح سے پاکستان کی تحریک آہستہ آہستہ چلی اور بڑھی' ہمارے علاقے میں بھی ہندو مسلمان کا تعصب شروع ہو گیا لیکن راجپوتوں نے بہت حد تک اس کا اثر نہیں لیا۔ ہمارے ہاں ہندو راجپوتوں کے علاوہ زیادہ تعداد جاٹوں کی تھی۔ سر چھوٹو رام جو سر سکندر حیات کی کابینہ میں وزیر مال رہے تھے' وہ جاٹ تھے' وہ ان کے لیڈر رہا کرتے تھے۔ وہ رہتک کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے جاٹوں کی بہت خدمت کی تھی۔ ان میں خود اعتمادی بہت بڑھائی۔ ان کی مالی حالت بھی بڑی اچھی تھی وزیر مال ہونے کی وجہ سے انہیں بنیوں کے قرضوں سے نجات دلائی۔ چھوٹو رام کی وجہ سے جاٹ بڑے جارح ہو

گئے تھے اور جب پاکستان کی تحریک چلی تو ان کی جارحیت اور بڑھی۔ ہم جو مسلمان راجپوت تھے' ان کے خلاف زیادہ تھے جب ہمارے لوگوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو ایسا تھا کہ مثلاً ایک گاؤں ہے۔ اس کے پانچ پانچ' چھ چھ میل تک مسلمانوں کا کوئی گاؤں نہیں ہے' بلکہ آٹھ آٹھ' نو نو میل تک سب ہندوؤں کی آبادی میں گھرے ہوئے تھے۔ جاٹوں کی آبادی سے لوگ رات کے اندھیروں میں نکلے۔ اپنی حفاظت کرتے ہوئے لڑتے مرتے ہوئے ہندو راجپوتوں کو جب علم ہوتا کہ اس طرح سے فلاں گاؤں کے مسلمان راجپوت اپنا گاؤں چھوڑ کے جا رہے ہیں تو وہ خود آ کے ہمارے لوگوں کی حفاظت کرتے وہ کہتے تھے کہ اگر خدانخواستہ راجپوت کی بے عزتی ہوئی' چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، جاٹ تو یہی کہیں گے ناں کہ ہم راجپوتوں کی لڑکی اٹھا کے لے آئے۔ اس لیے وہ خود آ کے ہمارے آدمیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ اس لیے ہماری قوم کے قافلے جس طرف سے بھی گزرے سکھوں یا ہندوؤں کو زبردستی کوئی لڑکی یا عورت اٹھانے یا حملہ کرنے کی جرات نہ ہوئی' حالانکہ پاکستان کی طرف سے سب سے لمبا سفر ہمارے لوگوں نے کیا' اس لیے کہ ہم تو بالکل آخری کونے میں تھے۔ ہمارے لوگ آئے بھی بڑے آرگنائز طریقے سے' اس لیے کہ سارے فوجی لوگ تھے' کوئی ریٹائرڈ' کوئی سروس میں۔

ہمارے علاقے میں جتنی بزنس تھی۔ ساری ہندوؤں کے پاس تھی۔ ہمارے لوگ تنخواہ دار ملازم تھے۔ ٹھیک ہے' معتبری تو ہماری تھی لیکن جہاں تک معیشت کا تعلق تھا' اونچے مکانوں اور اونچی دکانوں کا معاملہ تھا وہ تو ساری ہندوؤں کی تھیں' جائیداد کے سارے مالک ہندوؤں کے مقروض ہوتے تھے بلکہ اس میں جتنا بھی زراعت پیشہ طبقہ تھا ان میں ہندو جاٹ بھی تھے' وہ بنیوں کے مقروض ہوتے تھے۔

❖

سرکاری ملازمت۔ پولس سروس

ہمارے بھائی راؤ سخاوت علی خاں کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اس لحاظ سے کہ وہ ڈسٹرکٹ رہتک مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ تھے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے۔ مسلم لیگ کے صوبائی لیڈروں سے ذاتی طور پر واقف تھے' ویسے بھی بڑے حق پرست تھے' بات ہر ایک کے منہ پر کہتے تھے' ان کی صاف گوئی کا ہر شخص معترف تھا اور ڈرتا بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں انگلینڈ چلا جاؤں اور پی ایچ ڈی کرلوں یا کسی اور مضمون میں ایم اے کی ڈگری لے لوں۔ اس زمانے میں مرحوم شیخ کرامت علی پنجاب کے وزیر تعلیم تھے' وہ بھی بھائی صاحب کے دوست تھے' ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ راؤ صاحب آپ کیوں اتنا خرچہ کرتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے بے شمار لوگ باہر جا رہے ہیں' انہیں بھی بھیجنے کی کوشش کریں گے' پھر شیخ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے بیٹے آپ نے ایم اے کیا ہے' آپ لیکچرار کیوں نہیں ہو جاتے پھر ہم آپ کو سکالرشپ دے دیں گے چنانچہ انہوں نے وہیں اپنے دفتر میں ڈائریکٹر ایجوکیشن کو بلایا' شریف صاحب ہوتے تھے' بعد میں وہ مرکز میں ایجوکیشن سیکرٹری رہے' شیخ صاحب نے ان سے کہا' شریف صاحب یہ ہمارے راؤ صاحب کے بھائی ہیں' آپ ان کو لیکچرار لگا دیں' شریف صاحب نے مجھے کہا' آپ کل میرے پاس آ جائیں اگلے روز جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) میں لیکچررشپ کا اپوائنٹمنٹ لیٹر دے دیا۔ وہاں سے پھر میں نے مقابلے کے امتحان کی تیاری کی امتحان دیا' اگست یا ستمبر 50ء میں رزلٹ آ گیا۔ میں پولیس میں سلیکٹ ہو گیا' 1951ء جنوری کی تین تاریخ تھی جب میں سارداٹریننگ کالج پہنچا۔ یہ کالج مشرقی پاکستان میں تھا ایک سال کی ٹریننگ تھی وہاں سے ہماری پنجاب میں الاٹمنٹ ہوئی ہم چار آدمی تھے میں تھا قاضی اعظم تھے صاحبزادہ رؤف علی تھے اسلم حیات تھے یوں پولیس کیریر کا آغاز ہوا۔

میری پہلی پوسٹنگ لاہور میں ہوئی۔ ایک سال کی پریکٹیکل ٹریننگ تھی پہلے پولیس لائن میں

رہا پھر ہمارے ایس ایس پی صاحب نے مجھے انارکلی کا حلقہ دے دیا۔ ان کا فلسفہ تھا کہ کام سیکھتے بھی جاؤ اور کام کرتے بھی جاؤ۔

بطور ایس پی میرا پہلا تبادلہ 1956 میں قلات ہوا۔ مجھے شوق تھا کہ میں جہاں بھی جاتا وہاں کے پرانے گزیٹئر جو انگریزوں نے مرتب کرائے تھے وہ نکلوا کے اس علاقے کی ساری تاریخ اور جغرافیہ خاص طور سے وہاں کے رسم ورواج اور مختلف برادریوں' خاندانوں' گروہوں اور قبائل کی تاریخ کا مطالعہ کرتا۔ یہ میرا ایک خاص شوق رہا پھر دور دراز کے علاقے دیکھنے کا بھی بڑا شوق رہا' جہاں لوگ نہیں جاتے تھے' میری کوشش ہوتی کہ وہاں کی ایک ایک انچ دیکھ سکوں مثلاً میں بلوچستان میں رہا تو جب لوگ قلات کی یا بلوچستان کی بات کرتے ہیں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کس سلسلے میں اور کس سیاق وسباق میں بات ہو رہی ہے پھر وہاں کی جو شخصیتیں تھیں عطاء اللہ مینگل' بزنجو' جام صاحب لس بیلہ اور خان آف قلات وغیرہ ان سے میری ذاتی واقفیت تھی۔

تحریک پاکستان کے دوران خان آف قلات قائداعظمؒ کے معتقدین میں شمار ہوتے تھے۔ قائداعظمؒ ان کے ہاں بھی قیام فرماتے رہے بلکہ خان صاحب نے اپنی فوج میں سے کچھ لوگ قائداعظمؒ کی حفاظت پر مامور کر رکھے تھے جب میں قلات گیا تو اس وقت وہاں ایک اے ایس آئی درانی تھا جو خان آف قلات کی طرف سے قائداعظمؒ کا باڈی گارڈ رہ چکا تھا۔ خان صاحب نے مسلم لیگ کی مالی امداد بھی کی تھی۔ قائداعظمؒ کے ساتھ وہ بہت اچھی گفتگو کر لیتے تھے' گورمانی صاحب کی طرح ان کی زبان میں بھی بڑی شیرینی تھی بڑی مٹھاس تھی جب بات کرتے تھے تو اپنائیت کا احساس ہوتا تھا یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ انہیں قائداعظمؒ کا یہاں تک اعتماد حاصل تھا کہ قائداعظمؒ انہیں اپنا بیٹا کہا کرتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ قائداعظمؒ کے ساتھ اس قدر تعلقات کے باعث ریاست قلات فوری طور سے پاکستان کے ساتھ الحاق کر لے گی لیکن جب قیام پاکستان کا منصوبہ منظور ہو گیا تو خان صاحب کا دل کچھ بے ایمان ہو گیا اس موقع پر خان صاحب نے لیت ولعل سے کام لیا۔ مجھے کچھ ایسے لگتا ہے کہ یا تو انہیں غلط مشورہ دیا گیا یا پھر اس قسم کے جاگیرداروں اور نوابوں کے دماغ میں ایک کیڑا تو ہوتا ہی ہے خان صاحب کو اس قسم کی آزادی کے خواب نظر آئے ہوں گے کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ قلات سٹیٹ بھی ایک آزاد ملک ہو چنانچہ جب تقسیم ہند کی تجویز منظور ہو گئی اور پاکستان کا قیام یقینی ہو گیا خان آف قلات نے عجیب ڈپلومیٹک کھیل شروع کر دیا افغانستان' ایران' ہندوستان اور انگریزوں سے گفت وشنید شروع کر دی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ اختیارات اور خودمختاری کونسی حکومت دے گی مثلاً انہوں نے ایران کی حکومت کو چٹھی لکھی کہ روایتاً قلات ایرانی سلطنت کا ایک صوبہ رہا ہے اب میری خواہش ہے کہ پرانے تعلقات اور پرانے رشتے دوبارہ

استوار ہوں' دوسری طرف انہوں نے کابل حکومت سے بھی گفت وشنید شروع کردی تھی خان آف قلات کے کابل کے ساتھ خصوصی مراسم تھے خان صاحب کی بیگم افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کی فسٹ کزن تھیں پھر انہوں نے اپنا ایک مشن ہندوستان بھیجا جس کے لیڈر میر غوث بخش بزنجو تھے' ان کا فنانس منسٹر ایک ہندو ہوتا تھا وہ بھی اس مشن میں تھا۔ ایک دو آدمی اور تھے۔ یہ مشن اس پروگرام کے ساتھ ہندوستان گیا کہ قلات کو ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے' وہاں نہرو اور پٹیل سے تو ان کی ملاقات نہ ہو سکی مولانا ابوالکلام آزاد سے البتہ ہو گئی اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد تعصب سے پاک گفتگو کرتے تھے حالانکہ مسلمان انہیں بہت بُرے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ جب بزنجو وغیرہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے اور انہیں کہا کہ ہماری ملاقات نہرو اور پٹیل سے کرائیں ہم اس طرح سے قلات کو ہندوستان میں شامل کرنا چاہتے ہیں مولانا نے انہیں کہا آپ لوگوں کا دماغ خراب ہے آپ کا ملک بن گیا ہے اب آپ آرام سے وہاں بیٹھیں یہ کیا فضول سی باتیں آپ نے شروع کردی ہیں چنانچہ یہ لوگ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آئے۔

ایران والوں نے بھی خان صاحب کو گھاس نہ ڈالی۔ کابل سے ان کی گفتگو رہی اور وہ مختلف موقعوں پر ان کی امداد بھی کرتے رہے کچھ عرصے کے بعد جب قلات میں گڑ بڑ ہوئی تو خان آف قلات کا چھوٹا بھائی شہزادہ عبدالکریم بھاگ کر کابل چلا گیا۔

اس طرح سے انگریزوں کے ساتھ بھی انہوں نے گفت وشنید کی اور کہا کہ قلات سلطنت برطانیہ کا ہی حصہ رہے یہ رابطہ خان صاحب نے اپنے انگریز وزیر اعظم مسٹر فیل (Mr. Fell) کے ذریعے قائم کیا۔

قلات کے دو حصے ہیں ایک سراوان' مطلب اوپر کا حصہ' دوسرے جھالاوان' یعنی نیچے کا حصہ۔ سردار غوث بخش رئیسانی سراوان کے چیف تھے' سردار دوداخاں زرک زئی جھالاوان کے چیف سردار تھے' جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو خان آف قلات نے سرداروں کا جرگہ بلایا ان سب نے فیصلہ کیا کہ قلات ایک آزاد مملکت ہے اور جمعہ کے دن خطبے میں خان آف قلات نے اعلان کیا کہ قلات آج سے آزاد مملکت ہے۔

رئیسانی کا مجھے معلوم نہیں کیونکہ رئیسانی روایتاً ہمیشہ پاکستان کے وفادار رہے ہیں بہرحال' باقی سرداروں کے مشورے سے انہوں نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ خان آف قلات کے نام کا مسجدوں میں خطبہ بھی پڑھا جانے لگا۔ پھر انہوں نے دو ایوان بھی بنائے' ایوان بالا اور ایوان زیریں یعنی ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز سردار جو تھے' وہ ہاؤس آف لارڈز کے ممبر تھے عوام میں سے کچھ لوگ

انہوں نے منتخب کر کے انہیں ہاؤس آف کامنز کا ممبر بنا دیا۔ان کا خطاب تھا عالی جاہ مجھے اس کا اس طرح سے علم ہوا کہ جب 56ء میں وہاں گیا تو خضدار جو آج کل قلات کا صدر مقام ہے وہاں پتہ چلا کہ عالی جاہ کر کے کوئی عرضی نویس ہے اور سیاست میں بڑا پیش پیش ہے میں نے پوچھا' عالی جاہ اس کا نام ہے جواب ملا کہ موصوف قلات کے ایوان زیریں کے ممبر ہوا کرتے تھے' اس حوالے سے یہ ان کا خطاب تھا۔

بہر حال' جب پاکستان بن گیا تو باقی ریاستیں تو پاکستان میں شامل ہو گئیں لیکن خان آف قلات لیت ولعل کرتے رہے' قائداعظمؒ کو یہ تاثر دیتے رہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں قائداعظمؒ کے ان کے ساتھ مراسم تھے ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی بات نہیں ٹالے گا سردیوں میں ایک سبی دربار ہوتا تھا قائداعظمؒ نے وہاں آنا تھا' قائداعظمؒ سبی پہنچے تو خان آف قلات سبی سے بارہ میل دور اپنے سرمائی صدر مقام ڈاڈر میں تھے وہاں ان کا سرمائی محل بھی تھا' سبی دربار سے ایک شام پہلے خان صاحب نے کہلا بھیجا کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں کرنل شاہ سٹیٹس اور فرنٹیر ریجن کے سیکرٹری تھے انہیں خان صاحب کے پاس بھیجا گیا کہ وہ دیکھیں ان کا کیا حال ہے مطلب یہ کہ کہیں وہ مکر تو نہیں کر رہے کرنل شاہ نے واپس آ کر بتایا کہ وہ تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔

مکران کا یہ ہوا کہ قلات نے اس کے اصلی حکمران کو ہٹا کے براہ راست اپنی عملداری میں لے لیا تھا۔اب وہاں خان آف قلات کا چھوٹا بھائی شہزادہ عبدالکریم گورنر تھا حکومت پاکستان نے یہ کیا کہ جو مکران کا پرانا حکمران تھا اور وہ خان آف قلات کا بہنوئی بھی تھا لیکن ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے اس کو وہاں کا دوبارہ حکمران بنا دیا اس نے مکران کی پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔لس بیلہ خاران اور مکران کے اعلان شمولیت سے قلات دوسری دنیا سے کٹ گیا' قلات گھیرے میں آ گیا پھر گھبراہٹ میں خان آف قلات نے دیکھا کہ اب کوئی چارہ نہیں ہے تو انہوں نے غیر مشروط شمولیت کر لی لیکن شہزادہ عبدالکریم نے ناراض ہو کر بغاوت کر دی وہ مکران سے قلات آ گیا وہاں قبائل اور سٹیٹ فورس کے کچھ آدمیوں کو لے کے پہاڑوں پر چڑھ گیا کہ حکومت پاکستان کے خلاف جدوجہد کروں گا۔قلات کو آزاد کراؤں گا۔قائداعظمؒ نے حکم دیا کہ فوج جائے اور اسے گرفتار کرے کوئٹہ سے کچھ فوج وہاں گئی ان کے انگریز وزیراعظم مسٹر فیل نے محسوس کیا کہ ان کے پاس نہ اتنے ہتھیار ہیں نہ اتنے آدمی ہیں کہ فوج کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ وہ خود اس کے پاس پہاڑوں پر گیا اور ان کو سمجھا بجھا کے لے آیا اس طرح سے شروع شروع میں خان آف قلات کی طرف سے پاکستان اور قائداعظمؒ کے لیے خاصے پرابلم پیدا کیے گئے ورنہ اگر خان آف قلات ٹھیک رہتے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ قائداعظمؒ انہیں کوئی اہم ذمہ داری سونپتے ہو سکتا ہے قائداعظمؒ کے بعد وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہوتے۔

جب میں وہاں گیا تو وہاں کا سسٹم بڑا عجیب تھا وہ یہ کہ پولیس برائے نام تھی جو خان آف

قلات کی ریاستی فوج تھی اس کو انہوں نے بغیر کسی ٹریننگ کے پولیس بنا دیا ہوا تھا ان کے عہدے وہی تھے نظام بھی وہی تھا مثلاً قلات سٹیٹ کے بعد بلوچستان سٹیٹس یونین بنی۔ ریاستوں کو اکٹھا کر کے انہوں نے خان آف قلات کو اس کا پریذیڈنٹ بنا دیا تھا اور باقی کونسل آف رولرز کے ممبر تھے' لس بیلہ' خاران اور مکران پھر ان کا ایک وزیر اعظم ہوتا تھا جسے عام طور پر حکومت پاکستان نامزد کرتی تھی پھر انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس علاقے کو بھی پاکستان کے دوسرے حصوں کے نظام کے ساتھ ملایا جائے اصل میں قلات کا نظام یہ تھا کہ وہاں پولیس کوئی نہیں ہوتی تھی قبائل کا اندرونی نظم ونسق تو سرداروں کے حوالے تھا مثلاً مینگل قبائل کا سردار عطاء اللہ مینگل تھا اس میں جو بھی جھگڑے ہوتے تھے وہ کسی عدالت وغیرہ میں نہیں جاتے تھے وہ سردار طے کیا کرتے تھے اس کے ساتھ ساتھ یہ تھا کہ ان کا جو شرعی نظام تھا یا جو Customary Law (رواجی قانون) تھا' یا قلات پینل کوڈ تھا (تعزیرات قلات) جس طرح پاکستان پینل کوڈ (تعزیرات پاکستان) ہے لیکن وہ پاکستان پینل کوڈ سے بہت مختلف تھا' بغیر تھانوں کے وہاں تحصیلیں اور سب تحصیلیں ہوتی تھیں مثلاً یہ کہ اگر کوئی جرم ہو جائے تو تحصیلدار یا نائب تحصیلدار اس کا نوٹس لیتا تھا وہی تفتیش کرتا تھا وہی پھر مقدمے کی کارروائی سنتا تھا وہی پھر سزا دیتا تھا اس کی امداد کے لیے لیویز ہوتی تھیں لیویز اس طرح سے کہ ہر سردار کے علاقے میں اسی قبیلے کے لوگوں کو وہ لیویز کے طور پر رکھ لیتے تھے ان کو ماہانہ کوئی تنخواہ بھی ملتی تھی لیویز تحصیل دار کے ماتحت ہوتی تھیں اسی سے وہ امن عامہ برقرار رکھتے تھے۔

بلوچستان سٹیٹس یونین کے بعد انہوں نے جو پولیس بنائی اس کے لیے وہ فرنٹیئر سے ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی لے گئے اس کو انہوں نے کمشنر پولیس بنا دیا لیکن پولیس کا امن عامہ سے کوئی تعلق نہیں تھا تحصیل یا سب تحصیل میں ایک جوڈیشل حوالات ہوتا تھا جہاں زیر سماعت مقدمات کے قیدی رکھے جاتے تھے ان کی حفاظت کے لیے پولیس وہاں مامور تھی یا پھر خزانے کی حفاظت کے لیے پولیس مامور ہوتی تھی۔ اُس کا جرائم سے اور تفتیش سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جب میں وہاں پہنچا' میں نے دیکھا کہ امن عامہ نہیں بلکہ حوالات' خزانے اور بڑے بڑے افسروں کی حفاظت پولیس کی ذمہ داری ہے چونکہ پولیس کا خان آف قلات کی فوج سے پہلے تعلق تھا وہ فوج سے ہی پولیس میں تبدیل ہو گئے تھے خان صاحب کے ہی پروردہ تھے اس لیے پولیس میں خان صاحب کا کافی عمل دخل تھا پھر یہ کہ خان صاحب کی اپنی گارڈ بھی پولیس کے بتیس یا چالیس آدمیوں پر مشتمل تھی ایک انسپکٹر تھا ایک اے ایس آئی تھا باقی سپاہی تھے۔

میں نے دیکھا کہ ون یونٹ کے خلاف بڑا جذبہ تھا بڑی ناراضگی تھی خاص طور سے خان کو پسند

نہیں تھا کہ اس کا علاقہ ون یونٹ میں جذب ہو اور ان کی ساری اہمیت ختم ہو جائے چھوٹے صوبوں مثلاً سندھ اور سرحد میں جو ناراضگی تھی وہی ناراضگی بلوچستان میں بھی تھی پھر انہیں یہ شکوہ بھی تھا کہ اب پنجاب سے افسران آنا شروع ہو گئے میرا تقرر بھی اسی سلسلے میں تھا اس سے ان کی ناراضگی اور زیادہ ہو گئی۔

ایک روز مجھے فون آیا' کہا گیا کہ خان آف قلات کے محل سے فون آیا ہے وہ آدمی مانگ رہے ہیں میں نے پوچھا وہ کس قسم کے آدمی مانگ رہے ہیں جواب ملا' پولیس کے آدمی مانگ رہے ہیں میں نے پوچھا وہ کیوں جواب ملا خیمے سکھانے ہیں میں نے کہا یہ کونسا پولیس کا کام ہے کہ وہ لوگوں کے خیمے سکھائے' پھر فون آیا کہ ہم خیرات دے رہے ہیں' پولیس کے آدمی بھیج دو۔

ون یونٹ کے خلاف سب سے زیادہ ناراضگی خان آف قلات اور ان کے آس پاس کے لوگوں میں تھی' پولیس کے ہمارے آدمی جو خان صاحب کی حفاظت کرتے تھے وہ حکومت پاکستان کو بُرا بھلا کہتے گالیاں دیتے اور تنخواہ بھی وہ حکومت پاکستان سے وصول کرتے میں نے پھر آہستہ آہستہ ان پر کنٹرول شروع کیا میں نے ایگریمنٹ دیکھا کہ یہ تو پتہ کروں کہ خان آف قلات کی حفاظت پر جو پولیس لگی ہوئی ہے وہ کس شرط کے تحت لگی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ جب ون یونٹ کا ایگریمنٹ ہوا قلات کی پاکستان میں شمولیت کا ایگریمنٹ تو اس کے مطابق کہ خان آف قلات خاص تعداد میں کسٹم فری چیزیں منگوا سکیں گے۔ سات لاکھ یا آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ انہیں ملے گا جو پرسنل جائیداد تھی وہ علیحدہ کر کے ان کو دے دی گئی جو گارد ہو گی وہ پولیس میں سے ہو گی لیکن پولیس کو وہ تنخواہ دیں گے چار سال سے کسی نے خان صاحب کو تنخواہ کا بل نہیں بھیجا تھا۔ اسی طرح دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کے پاس بھی پولیس کی گارد تھی لیکن تنخواہ کسی نے ان سے وصول نہیں کی تھی چنانچہ میں نے چار سال کا اکٹھا بل بنایا اور سارے سابق حکمرانوں کو بھیج دیا کہ اتنی آپ کے پاس گارد ہے اور ایگریمنٹ کے تحت آپ کو ان کی تنخواہ دینی چاہیے تھی خاران اور لس بیلہ کے حکمرانوں نے تو گھبرا کے پولیس واپس کر دی کہ انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں اس طرح مکران نے بھی واپس کر دی لیکن خان آف قلات نے وہ بل واپس کر دیا کہ آپ مجھے براہ راست نہیں لکھ سکتے۔ آپ مجھے منسٹری آف سٹیٹس اینڈ فرنٹیئر ریجن کے ذریعہ لکھیں بات ان کی ٹھیک تھی چنانچہ میں نے حکومت پاکستان کو بل بھیج دیا کہ یہ آپ خان صاحب کو بھجوائیں۔ اس کے بعد پھر میں نے سوچا کہ یہ کس طرح ظاہر ہو کہ جو پولیس گارد ہے وہ خان کی گارد نہیں' ہماری پولیس کا ایک حصہ ہے چنانچہ میں نے یہ کیا کہ تیس چالیس آدمیوں پر مشتمل اسی طرح کی ایک اور گارد تیار کی خان صاحب کوئٹہ میں تھے اور ان کی ساری گارد بھی وہاں گئی ہوئی تھی میں نے کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ تین چار سال سے ہیں انہوں نے پولیس ٹریننگ بھی نہیں کی یہ بھول بھال گئے ہیں ان کو آپ واپس بھیج دیں میں آپ کو نئے

آدمی بھجوار ہا ہوں جو ٹرینڈ ہیں اور میں ہر سال اس طرح سے تبدیلی کیا کروں گا۔ یہ بات خان صاحب کو بالکل پسند نہ آئی انہوں نے کہا میں تو اس طرح سے گارڈ نہیں بدلوں گا وہ لوگ بھی بپھرے ہوئے تھے کہنے لگے ہم تو بالکل واپس نہیں جائیں گے میں نے کہا یہ تو ڈسپلن کا معاملہ ہے حکم تو میرا چلنا چاہیے خان صاحب کی تو وہ حفاظت پر مامور ہیں میں ان کے خلاف کیس رجسٹر کرتا ہوں جب بھی وہ خان کے محل سے باہر نکلیں انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلے گا اس سے وہ بہت گھبرائے پھر مجھے پیغام ملا کہ خان صاحب کہتے ہیں کہ یہ سارے لوگ ریزائن کرنا چاہتے ہیں اور میری ذاتی ملازمت میں رہنا چاہتے ہیں آپ ان کا استعفیٰ منظور کر لیں چنانچہ ان سب کی طرف سے ایک عرضی لکھی گئی اور سب کا مشترکہ استعفیٰ میرے پاس بھجوا دیا گیا میں نے کہا اس طرح استعفیٰ دینا تو پولیس ضابطے کے خلاف ہے یہ ایک ایک کر کے استعفیٰ دیں میرے پاس آئیں میں ان کے استعفیٰ منظور کروں تو پھر یہ فارغ سمجھے جائیں گے چنانچہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایک کر کے کوئٹے سے قلات آتے تھے آ کے مجھے سلیوٹ کرتے تھے مجھے اپنا استعفیٰ دیتے تھے میں ان کا استعفیٰ منظور کرتا تھا وہ پھر سلیوٹ کرتے تھے اور واپس چلے جاتے تھے اس طرح سے میں نے یہ تاثر دیا کہ پولیس ایک نظم کے تحت ہے وہ خان صاحب کے ذاتی ملازم نہیں چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے وہاں دوسری گارد نہ بھیجی گئی۔ وہ ایک بوجھ تھا ختم ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان صاحب ذاتی طور پر میرے سخت خلاف ہو گئے اور یہ پروپیگنڈا شروع ہو گیا کہ میں نے بلوچیوں کی بڑی بے عزتی کی ہے ہم اس کو جان سے ماردیں گے بلکہ یہ ہوا کہ قلات میں میرا جو سرکاری گھر تھا وہاں ایک گارد تھی وہ بھی وہیں کی تھی ایک کھڑکی میں سے کسی نے ایک چٹھی پھینکی جس میں دھمکی دی ہوئی تھی کہ ہم تمہیں اور تمہارے بچوں کو ختم کر دیں گے اس بات کی میں نے کوئی خاص پرواہ نہیں کی۔

خان صاحب کی ریاست ان سے چلی گئی وہ آئندہ کبھی خود مختار نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ کچھ نہ کچھ پرابلم پیدا کرتے رہے شہزادہ عبدالکریم جیل سے واپس آ گئے تھے انہوں نے اور خان صاحب نے کچھ قبائلیوں سے آہستہ آہستہ رابطہ شروع کر دیا مجھے پتہ چلا کہ خان صاحب کی جو ریاستی فوج تھی وہ تو ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے جو ہتھیار تھے وہ خان صاحب کے پاس ہی رہے ان کے محل میں بہت بڑا اسلحہ خانہ تھا اس میں بارود کا سٹاک تھا رائفلیں تھیں توپیں تھیں مجھے پتہ چلا کہ وہ اسلحہ آہستہ آہستہ قبائل میں تقسیم کر رہے ہیں تاکہ گڑبڑ کر سکیں چنانچہ میں نے گورنمنٹ کو رپورٹ لکھی کہ اس طرح سے مجھے اطلاعات ملی ہیں جواب آیا کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے میں نے کہا ثبوت تو میرے پاس یہ ہے کہ اگر مجھے اجازت دیں تو میں جا کے محل کی تلاشی لوں اور وہ ہتھیار قبضے میں لے کر آپ کو دکھا دوں لیکن محل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خان صاحب کو یہ ڈپلومیٹک سہولت حاصل تھی کہ پولیس ان کے محل میں نہیں جا سکتی تھی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں قلات شہر میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا نزدیک ہی کرنل یوسف کا دفتر تھا کہ اچانک بہت بڑا دھماکہ ہوا جس سے ہمارے سارے دفتر ہل گئے ہم گھبرا کے باہر نکلے تو دیکھا کہ خان صاحب کے محل سے زبردست دھواں نکل رہا ہے میں اور کرنل یوسف بھاگ کے وہاں گئے جس کمرے میں دھماکہ ہوا تھا اس کی چھت اڑ گئی بیچارے دو تین مزدور تھے ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہ چلا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں وہاں پر موجود پولیس گارد کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ اسلحہ خانے میں بے شمار بندوقیں' توپیں اور یونیفارم وغیرہ پڑی ہوئی تھیں میں نے اپنے دفتر سے کہا کہ اس کے خفیہ طور پر فوٹو لیے جائیں پھر میں نے کرنل یوسف صاحب سے کہا کہ آپ فوری طور پر ایک مجسٹریٹ سے انکوائری کرائیں' اگر آپ نے موقعہ دیا تو وہ کئی کہانیاں گھڑ لیں گے انکوائری ہوئی تو وہاں کام کرنے والوں نے بتایا کہ ہم خان صاحب کے حکم سے بارود بوریوں میں بھر بھر کے رات کے وقت ٹاور میں رکھ دیتے تھے رات کی تاریکی میں قبائلی آتے تھے اور بارود اٹھا کر لے جاتے تھے بارود کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا لیکن نمی کی وجہ سے نیچے بارود کی جو تہہ جم گئی تھی حکم ہوا کہ اسے کدال سے کھود کے نکالو وہاں خان صاحب کا ایک کارندہ اور دو تین مزدور کام کر رہے تھے انہوں نے بارود پر کدال مارا وہ سخت تھا سپارک پیدا ہوا سارا اسٹاک ایک دم بلاسٹ ہو گیا۔"

ثابت ہو گیا کہ میری رپورٹ درست تھی۔ گورنمنٹ کو رپورٹ گئی کہ خان صاحب اس طرح سے اپنا اسلحہ و بارود تقسیم کر رہے تھے اس پر خان صاحب بہت گھبرائے انہوں نے کہا کہ اب ان کے خلاف بڑی سخت کارروائی ہوگی' اعلان ہو گیا کہ خان صاحب انگلینڈ جا رہے ہیں اب وہ واپس نہیں آئیں گے وہ اپنے اور بیوی بچوں کے پاسپورٹ لے کر کراچی چلے گئے وہاں سے انہوں نے لندن جانا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد واپس کوئٹہ پہنچ گئے ہم لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ پھر اچانک اطلاع ملی کہ کمشنر معیز الدین نے خان صاحب کی دعوت کی ہے اس پر بھی ہمیں بڑی حیرت ہوئی' کہ ضرور اس میں کوئی راز ہے کیونکہ معیز الدین بڑے موقع شناس آدمی تھے جب تک خان آف قلات زیر عتاب رہے تو انہوں نے ان سے کوئی تعلق واسطہ نہ رکھا حالانکہ وہ کوئٹہ میں ہوتے تھے۔

ہوا یہ کہ جب خان صاحب کراچی پہنچے تو سکندر مرزا (صدر پاکستان) نے ان کو بلایا یہ میں بڑی اہم بات کرنے لگا ہوں کہ اس ملک کے خلاف جو سازشیں ہوتی رہی ہیں ان کی ہسٹری یہاں سے شروع ہوتی ہے جو آزاد کشمیر میں بھی پہنچی ہوا یہ کہ سکندر مرزا کو رپورٹیں مل چکی تھیں کہ خان صاحب کے پاس ہتھیار ہیں وہ اس طرح قبائلیوں میں تقسیم کر رہے ہیں تو جب خان صاحب کراچی پہنچے ان کا پروگرام تھا کہ وہ لندن بھاگ جائیں گے اور اس کے بعد واپس نہیں آئیں گے لیکن سکندر مرزا نے انہیں کھانے پر

بلالیا اس نے اپنے لیے ایک موقعہ دیکھا اس زمانے میں سکندر مرزا کی یہ بڑی خواہش تھی کہ کس طرح وہ اس ملک کے تاحیات سربراہ بنیں اور پوری طرح ڈکٹیٹر بن جائیں۔ ان کے ذہن میں مختلف سکیمیں تھیں ایک تو انہوں نے انقلابی کونسل کا نظریہ دیا تھا کہ اس طرح سے کونسل ہوگی اس کے وہ سربراہ ہوں گے۔ بہرحال' وہ اس موقعہ کی تلاش میں تھے کہ کسی طرح سے جواز بنے' اور وہ پارلیمنٹ کو ڈسمس کر دیں' سیاستدانوں کو ڈسمس کر دیں اور خود اک مستقل ڈکٹیٹر کے طور پر ملک اور قوم پر مسلط ہو جائیں خان آف قلات کو انہوں نے کھانے پر بلایا اور ان سے مل کر سازش تیار کی اس نے خان صاحب سے کہا کہ آپ قلات میں گڑبڑ کریں وہاں گڑبڑ ہوگی میرے لیے موقعہ ہوگا کہ سول گورنمنٹ کو ڈسمس کر دوں گا کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہیں پھر میں ڈکٹیٹر بن جاؤں گا۔

درحقیقت 56ء میں ہی انہوں نے اس کی تیاری شروع کر دی تھی چنانچہ خان صاحب نے سوچا یہ تو بڑی اچھی بات ہے جو میں چاہتا ہوں وہی سکندر مرزا صاحب چاہتے ہیں۔

سکندر مرزا نے ان سے کہا کہ اس کے بدلے میں تمہیں گورمانی کی جگہ ویسٹ پاکستان کا گورنر بنا دوں گا۔ اس بات کی بھنک معیز الدین صاحب کو پڑ گئی' کہ خان صاحب ویسٹ پاکستان کے گورنر بن رہے ہیں تو اچانک وہ خان صاحب کے بڑے منظور نظر ہو گئے اور ان کو اور ان کی بیوی کو کھانے پر بلایا۔

❖

آزاد کشمیر

اسی دوران میں میرا تبادلہ آزاد کشمیر ہو گیا۔ جب میں آزاد کشمیر پہنچا تو ایک ماہ بعد پتہ چلا کہ خان آف قلات نے بغاوت کر دی ہے اور ان کے لڑکے محل میں آدمی اور اسلحہ لے کر بیٹھ گئے ہیں پہلے پولیس گئی پھر فوج گئی فائرنگ ہوئی لوگ مرے، خان صاحب کو انہوں نے پکڑ کے مری میں نظر بند کر دیا قلات میں حالات کافی خراب ہو گئے۔ لیکن اتنے نہیں کہ قابو سے باہر ہو جاتے مطلب یہ کہ سکندر مرزا کی مرضی کے مطابق حالات خراب نہیں ہوئے تھے۔ معمولی جھڑپیں ہوئیں۔ خان صاحب نے جو وعدے کیے تھے کہ میں یہ کر دوں گا میں وہ کردوں گا سارے قلات میں آگ لگی ہوگی وہ بات نہ ہوئی جس سے سکندر مرزا اپنی ڈکٹیٹرشپ مسلط نہ کر سکے۔

بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اصل میں جو بھی پالیسیاں بنتی ہیں وہ اسلام آباد میں بنتی ہیں یا جو بھی گورنمنٹ کا صدر مقام رہا۔ پہلے کراچی تھا پھر اسلام آباد ہو گیا جو لوگ پالیسی بناتے ہیں ان کو اس علاقے کا، وہاں کے رسم و رواج کا، ان لوگوں کی ذہنیت کا، ان لوگوں کی سوچ کا، کوئی اندازہ نہیں ہوتا وہ ہر چیز کو لا اینڈ آرڈر کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بہت سارے مسئلے ایسے ہیں کہ اگر پالیسی بنانے والوں کی واقفیت اس علاقے سے اور ان لوگوں سے ہو تو پھر یہ مسئلے پیدا ہی نہ ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ انگریزوں نے اتنی کامیابی سے دو سو سال حکومت کی خاص طور سے ان علاقوں پر جو قبائلی ہیں لوگ ابھی تک انہیں یاد کرتے ہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ انسانوں کے مسئلے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں ان کی سوچ کا پتہ ہوتا تھا مسائل کا پتہ ہوتا تھا ان سے ذاتی تعلقات ہوتے تھے اور اگر کوئی بات ہوتی تھی ان کو فوراً پتہ چل جاتا تھا اور وہ مل بیٹھ کے بات کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے تھے اس کے برعکس ہمارے جو لوگ وزارت خارجہ میں ہیں یا وزارت داخلہ میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ کاغذی کارروائی کے ماہر ہیں۔ انہوں نے اپنے دفتروں سے باہر نکل کے کبھی نہیں دیکھا

بلوچستان کے لوگوں کا انہیں پتہ نہیں انہیں یہ علم نہیں کہ پنجاب اور بلوچستان کے لوگوں کی سوچ میں کیا فرق ہے جب میں وہاں گیا تو یہی دیکھا کہ عام بلوچی بڑے اچھے مسلمان ہیں اچھے پاکستانی ہیں لیکن ان کا اپنا ایک نظام ہے اور وہ ہے قبائلی نظام۔ وہ لوگ بہت پسماندہ اور قدامت پسند ہیں اور جو بھی غیر مانوس لوگ اور غیر مانوس ماحول ہوتا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے۔

بہت سے لوگ پہاڑوں میں الگ تھلگ زندگیاں گزارتے ہیں انہیں سوائے سرداروں کے یا اپنے لوگوں کے' دوسروں سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوتی لیکن اگر آپ ان کے رسم و رواج اور ان کی سوچ کی قدر کریں اور انہیں انسان کا درجہ دیں یہ نہ سمجھیں کہ یہ جاہل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کے دل نہ جیت سکیں میرے پاس وہاں ایک جیپ تھی میں اکثر اس میں سفر کرتا تھا وہاں کا جو ماحول تھا وہاں امن عامہ کی جو صورت حال تھی وہ سرحد اور پنجاب سے کہیں بہتر تھی نہ وہاں چوریاں ہوتی تھیں نہ وہاں ڈاکے پڑتے تھے نہ راستے میں کوئی لوٹتا تھا اب جو میں بلوچستان کے حالات سنتا ہوں تو بڑا حیران ہوتا ہوں اس لیے کہ جتنا عرصہ میں وہاں رہا مجھے لا اینڈ آرڈر کا کوئی پرابلم نظر نہیں آیا۔ وہاں چونکہ تعلیم کم تھی اور تعلیم وہاں ہوتی بھی مشکل ہے۔ قلات کے زمانے میں بھی جب وہ ریاست تھی جو ٹیچر تھے کلرک تھے افسر تھے وہ سب باہر سے لائے جاتے تھے۔ حکومت کے کارندے چھوٹے ہوں یا بڑے انگریز کے زمانے سے لے کر میرا خیال ہے کہ اب تک یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے کہ وہ ہمیشہ سے لائے جاتے رہے مثلاً قلات کا وزیراعظم انگریز ہوا کرتا تھا دوسرے بڑے بڑے عہدوں پر بھی انگریز تھے۔ انگریزوں کے بعد پٹھان جانا شروع ہوئے بہت سارے پنجابی وہاں گئے۔ وہاں کے سیکرٹریٹ میں بھی پنجاب' فرنٹیئر' کراچی کے افسر تھے۔ ایک طرح سے حکومت کا سارا عنصر باہر کے لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا جو لوگ باہر کے ہوتے تھے' زیادہ تر ریٹائرڈ لوگ ہوتے تھے یا اپنی عمر کے آخری حصے میں ہوتے تھے ان کو یہ شوق بھی نہیں تھا کہ لوگوں میں جا کے گھل مل جائیں یا باہر نکل کے ان کے مسائل سمجھیں یا لوگوں سے سماجی تعلقات رکھیں۔ بلوچوں کے رہنے سہنے اور دوسرے طور طریقوں میں بڑا فرق تھا وہ پردے کے سخت پابند تھے بڑے قدامت پسند تھے اور جو پڑھے لکھے لوگ وہاں جاتے تھے ظاہر ہے کہ ان کا رہنا سہنا ان کی لڑکیوں کا' بیویوں کا' گھر کا ماحول ان سے بالکل مختلف تھا وہاں ملکی اور غیر ملکی کا مطلب یہ تھا بلوچی اور غیر بلوچی اس کی تمیز وہ کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ غیر ملکی کہہ کے وہ پاکستان کو اپنا حصہ نہیں سمجھتے تھے ملک کا تصور ان کے لیے بڑا محدود تھا مثلاً یہ کہ جو کسان جس ایریا میں رہتا ہے اس کے لیے وہ اس کا ملک ہے اور جو باہر کا ہو وہ اس کے لیے غیر ملکی تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بلوچستان کو اپنا سمجھتے ہیں اور پاکستان کو غیر ملک سمجھتے ہیں وہ ان کی اپنی ایک محدود سوچ تھی۔ اس کا اس بڑی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اصل میں پرو پاکستان اور انٹی پاکستان تو بعد کی بات ہے جس طرح مجھے وہاں لا اینڈ آرڈر کا کوئی پرابلم نظر نہیں آیا اس طرح مجھے وہاں کوئی سیاسی پرابلم بھی نظر نہیں آیا۔ بزنجو اور مینگل وغیرہ سے میری ذاتی دوستیاں تھیں اس وقت بھی تھیں اب بھی ہیں۔ ابھی بزنجو صاحب آئے تھے میں ان سے ملنے گیا دو تین گھنٹے گپیں ماریں عطاء اللہ مینگل صاحب کے ساتھ بھی جب موقع ہوتا تھا کراچی میں یا کوئٹہ میں ان سے ملاقات رہتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ ان کی اپنی سیاست ہے اپنا ایک نظریہ ہے لیکن ہم مل بیٹھ تو سکتے ہیں گفت وشنید ہو سکتی ہے انڈرسٹینڈنگ ہو سکتی ہے لیکن اگر زبردستی کی جائے تو وہ بڑے خوددار لوگ ہیں پھر وہ پرواہ نہیں کرتے اور وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ صرف طاقت کے ذریعے سے اپنا نظریہ منوایا جاسکتا ہے یا یہ کہ وہ کسی طرح سے کم تر ہیں یا یہ کہ ان کا پاکستان میں حق کم ہے' ان کو پتہ ہے کیا کرنا ہے کس طرح سے کرنا ہے میرا خیال ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی تعلیم کے زور سے یا مہارت کے زور سے یا طاقت کے زور سے یا تعداد کے زور سے اپنا حکم رسوخ یا سوچ ان پر مسلط کرے۔

1954ء تک بلوچستان سٹیٹس یونین تھی اس کے بعد ڈویژن بنی۔ کرنل یوسف وہاں کے کمشنر بنے بعد میں بیچارے مشہور بھی ہوئے بدنام بھی ہوئے لیکن میں نے اپنے ملک میں ان سے بہتر افسر آج تک نہیں دیکھا؛ نہایت فرض شناس جفاکش اور محنتی اور ہر انسان کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھ کے حل کرتے تھے چونکہ شروع سے ہی پولیٹیکل سروس میں رہے انہیں انگریزوں کی ٹریننگ ملی تھی انہوں نے انگریزوں کے ساتھ سروس بھی کی تھی قلات میں وہ بہت کامیاب رہے اور جب تک وہ وہاں رہے کوئی سیاسی یا لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا نہ ہوا۔ خان آف قلات کا حال یہ تھا کہ وہ کرنل یوسف سے اتنا گھبراتے تھے کہ وہ قلات میں واپس نہیں آئے کوئٹہ میں ہی رہے جس روز کرنل یوسف کا تبادلہ ہوا صورت یہ تھی کہ کرنل صاحب قلات سے کوئٹہ پہنچ رہے تھے اور خان آف قلات کوئٹے سے قلات پہنچ رہے تھے اتنا ان سے گھبراتے تھے۔ کرنل یوسف کی جگہ ایم ایچ صوفی صاحب آئے یہ سول سروس کے افسر تھے ویسے شریف آدمی تھے لیکن بہت ہی محتاط اور کاغذی کارروائی کے ماہر۔

صوفی صاحب کی آمد سے وہاں کے مسائل شروع ہوئے میں صوفی صاحب کا اتنا قصور نہیں سمجھتا جتنا کہ نواب کالا باغ کا تھا جب کالا باغ مغربی پاکستان کے گورنر بنے تب سے وہاں کے مسائل شروع ہوئے۔

وہ اس طرح کہ کالا باغ کی ایک ذہنیت تھی کہ اپنے آپ کو بڑا مضبوط ایڈمنسٹریٹر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک وہ ہیں کسی کو مجال نہیں ہونی چاہیے کہ وہ سر اونچا کر کے چلے اس کا صرف انہی کو حق ہے یہ ان کی سرشت میں شامل تھا کہ شریف آدمی خاص طور سے خوددار آدمی کی پگڑی اچھالی جائے۔

ان کے خیالات اور فلاسفی ان کے علاقے کالا باغ میں تو کامیاب ہو سکتی تھی ضروری نہیں تھا کہ وہ قلات یا بلوچستان کے علاقے میں بھی کامیاب ثابت ہوتی لیکن انہوں نے اپنی وہی فلاسفی مسلط کرنے کی کوشش کی جو سیاسی مسائل تھے انہیں امن عامہ کے مسئلے کے طور پر ڈیل کیا جس سے آہستہ آہستہ نفرت پھیلتی گئی پہلے پولیس نے پھر فوج نے مختلف جگہوں پر سختیاں کیں اس سے خون خرابے ہوئے لوگ مرے نفرت بڑھتی رہی وہ بیج اب تک کڑوا پھل دے رہا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد بلوچستان کے مسئلے کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک تو پاکستان بننے سے کالا باغ کی گورنری تک' دوسرے کالا باغ کے بعد سے اب تک۔ کالا باغ سے پہلے مسائل کا جو حل تھا وہ سیاسی حل تھا اس لیے کہ جو افسران وہاں متعین رہے وہ زیادہ تر پولیٹیکل سروس سے تھے انہیں پولیٹیکل ٹریننگ تھی انہوں نے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ سرداروں سے قبائل سے اور خان سے ڈیل کیا اور ہر مسئلے کا پُرامن سیاسی حل تلاش کرنے کی کوشش کی مثلاً آغا عبدالحمید وہاں رہے ہیں کھرل صاحب تھے راجہ احمد خان ہی ساری عمر وہاں گزر گئی۔ وہاں کبھی فوج کشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، مسئلے اٹھتے تھے لیکن جلد ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کبھی حکومت نے نرمی برت لی کبھی حکومت نے اپنا رویہ سخت کر لیا لیکن جب 58ء میں مارشل لا لگا اور کالا باغ کا وقت آیا تو اس وقت فوج کشی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک ختم نہیں ہو سکا۔

یہ کہنا تو بڑا مشکل ہے کہ اس وقت جو سویلین گورنمنٹ ہوتی وہ کیا حکمت عملی اختیار کرتی لیکن یہ بات میں کہوں گا کہ جو بھی کوئی سیاسی صورتحال حال ہو بین الاقوامی ہو یا اندرونی ہو ایک سیاسی دماغ اس کو بہتر طور سے حل کر سکتا ہے۔ فوجی دماغ اس سچوایشن کو حل نہیں کر سکتا' اس لیے کہ ان کی ٹریننگ نہیں ہوتی۔ جس لائن' جس سوچ پر وہ لگ جائیں' اس سوچ سے ادھر ادھر ہونا ان کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کے نزدیک رائے عامہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنی حکمت عملی رائے عامہ کے مطابق ملے بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی مسئلہ میں بھٹو صاحب یا کوئی سویلین سربراہ ہوتا تو کیا کرتا لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ ہر حالت میں ایک آمر مطلق حکمران کو اقتدار سے اتنا پیار ہوتا ہے کہ ڈوبتے ہوئے بھی وہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اور ہو تو کہے کہ میری جان چھوٹے' چلو میں اقتدار کسی اور کے حوالے کرتا ہوں لیکن آمر مطلق کو اقتدار اتنا پیارا ہوتا ہے کہ ملک ڈوب رہا ہے تو ڈوبے خود بچ جائے۔

❖

K.L.M

اگست 1957ء میں میں I.G آزاد کشمیر ہو کر گیا۔ فوری بعد کے ایل ایم یعنی کشمیر لبریشن موومنٹ کا اعلان ہوا۔ تجویز یہ تھی کہ آزاد کشمیر کے نہتے لوگ سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں گے وہ بیشک وہاں گرفتار ہو جائیں لیکن اس تعداد میں جائیں کہ مقبوضہ کشمیر کی آبادی اٹھ کھڑی ہو اور حالات اس قدر بگڑ جائیں کہ ہندوستانی گورنمنٹ مجبور ہو جائے اور اسے کچھ نہ کچھ سمجھوتہ کرنا پڑے۔ تجویز بہت اچھی تھی اگر اس کے ساتھ نیک نیتی بھی شامل ہوتی۔ میں یہ کرتا تھا کہ جتھے آتے تو انہیں پکڑ کے جیلوں میں بند کرنے کی بجائے گاڑی میں بھر کے پندرہ بیس میل دور ادھر ادھر چھوڑ دیتا مانسہرہ' بالاکوٹ وغیرہ ان بیچاروں کو پیدل واپس آنا پڑتا۔ یہ جو پہاڑی علاقے کے لوگ ہوتے ہیں' ان کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے انہیں پہاڑوں پر بیشک دن بھر چلا لیں سڑک پر وہ نہیں چل سکتے دو دن میں تحریک ختم ہوگئی صدر پاکستان سکندر مرزا اس وقت نتھیا گلی میں تھے آئی جی پنجاب اے بی اعوان نے مری سے مجھے آزاد کشمیر فون کیا کہ آ کے مجھ سے ملو میں مری پہنچا تو مجھ سے پوچھنے لگے بھئی آزاد کشمیر کی کیا پچوایشن ہے میں نے کہا' پچوایشن کنٹرول میں ہے کہنے لگے' کیا مطلب؟ میں نے بتایا کہ رضا کاروں کے ساتھ ہم نے اس طرح سے ڈیل کیا۔ دو دن میں موومنٹ ختم ہوگئی تو وہ کہنے لگے' کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ نے موومنٹ ختم کرنی ہے میں نے کہا مجھے تو یہی حکم ہے کہ اس موومنٹ کو ختم کرنا ہے کہنے لگے نہیں' میں تو نتھیا گلی پریذیڈنٹ سے مل کے آیا ہوں وہ تو کہہ رہے تھے کہ غلام عباس بکواس کرتا تھا کہ وہ اس موومنٹ کو مہینوں چلائے گا اتنے لاکھ رضا کار دے گا مگر یہ تو دو دن میں ختم ہوگئی۔ اعوان صاحب نے کہا کہ پریذیڈنٹ اس بات سے بہت ناراض تھے۔

اس وقت میں یہ سمجھا تھا کہ یہ انڈیا پر اثر ڈالنا چاہتے تھے۔ اس لیے نالاں ہیں کہ یہ موومنٹ اتنی جلدی ختم کیوں ہوگئی لیکن اصل بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایک سازش تھی جس میں صدر

پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا' بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کشمیری لیڈر چودھری غلام عباس اور صدر کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب شامل تھے۔

سکندر مرزا کے کہنے پر خان آف قلات نے جو گڑبڑ شروع کی وہ تو ناکام ہو گئی تھی اس لیے سکندر مرزا کی یہ خواہش پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی کہ وہ سول گورنمنٹ کو ڈسمس کر کے پاکستان کے مختار کل بن جائیں' اب انہوں نے آزاد کشمیر کا رخ کیا اس وقت آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم تھے ادھر مرکز میں فیروز خاں نون وزیر اعظم تھے وہ سردار ابراہیم کو سپورٹ کرتے تھے چنانچہ سکندر مرزا نے چودھری غلام عباس کو پکڑا اور پکڑا قدرت اللہ شہاب کے ذریعے کیونکہ شہاب صاحب چودھری صاحب کے خاص معتمد تھے اور یہ دونوں جموں کے تھے۔

سازش یہ تیار کی گئی کہ آزاد کشمیر میں حالات اس قدر خراب کر دیئے جائیں کہ ان پر قابو نہ ہو سکے اور حکومت پاکستان ناکام ہو جائے پھر سکندر مرزا سردار ابراہیم کو ڈسمس کر دیں گے اور ادھر پاکستان میں بھی ایمر جنسی نافذ کر کے سویلین حکومت کو ڈسمس کر کے خود ڈکٹیٹر بن جائیں گے چنانچہ اسی ضمن میں کشمیر لبریشن موومنٹ کا اعلان ہوا کہ جتھے سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر جائیں گے۔ چودھری غلام عباس نے سکندر مرزا اور ایوب خان کو یقین دلایا کہ وہ اتنے لاکھ آدمی بھیجیں گے اصل سازش تو آزاد کشمیر میں گڑبڑ پیدا کرنے کی تھی لیکن اعلان یہ کر چکے تھے کہ رضا کار سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوں گے اس ضمن میں سکندر مرزا اور ایوب خان نے چودھری صاحب کو یقین دلایا کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کو سیز فائر لائن کراس نہیں کرنے دیں گے لیکن آپ آزاد کشمیر میں جذبات ابھاریں ہم آپ کا آدمی آزاد کشمیر میں صدر بنا دیں گے۔

اس وقت کرنل یوسف کشمیر افیئر ز کے انچارج تھے۔ راولپنڈی میں بیٹھتے تھے کراچی میں میٹنگ ہوئی اس میں سردار ابراہیم اور کرنل یوسف بھی تھے' وہاں فیصلہ یہ ہوا کہ جو جتھے سیز فائر لائن کراس کرنا چاہیں گے پاکستان گورنمنٹ انہیں روکے گی نہیں' وہ جاتے ہیں تو جاتے رہیں کیونکہ اگر روکیں گے تو آزاد کشمیر میں گڑبڑ ہو گی یہ تجویز فیروز خان نون کی تھی جو سردار ابراہیم کے ساتھ تھے۔ اس فیصلے پر سکندر مرزا اور ایوب خان بہت گھبرائے کہ ہم اعلان کر چکے ہیں اب تو جانا ہی پڑے گا۔

پہلا جتھہ سردار عبدالقیوم نے لیڈ کرنا تھا کہ وہ سیز فائر لائن کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں جائیں گے' ہمیں آرڈر تھا کہ جاتے ہیں تو جانے دیں' لیکن سکندر مرزا اور ایوب خان نے چودھری غلام عباس کو یقین دلایا تھا کہ ہم نہیں جانے دیں گے اب سردار عبدالقیوم پہلا جتھہ لے کر چلے اور بجائے سیز فائر لائن کراس کرنے کے اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا' وہ اس امید میں تھے کہ پولیس آ کے انہیں

روکے۔

دیکھئے! اس ملک میں کیا کیا سازشیں ہوتی رہیں' اب سگنل یہ آیا کہ ٹھیک ہے۔ سویلین گورنمنٹ کا فیصلہ ہے کہ انہیں روکیں گے نہیں لیکن سیز فائر لائن پر پاکستانی فوج متعین ہے اگر یہ لوگ کراس کر کے مقبوضہ کشمیر میں چلے گئے اور وہاں ان پر گولیاں چلیں اور یہ مر گئے تو ہماری فوج بڑی مشتعل ہو جائے گی' اس سے تو جنگ چھڑ جائے گی اس لیے فوج نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ان کو روکے گی۔ سویلین حکومت کے فیصلے کے خلاف فوج نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ انہیں روکے گی چنانچہ انہوں نے سردار قیوم کا پیچھا کیا' سردار قیوم تو پہلے سے ہی انتظار میں تھے کہ کوئی آ کے انہیں روکے۔ فوجی سردار صاحب کو لے آئے اب فوج کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان کو روکے گی تو جتھے پہ جتھے آنے شروع ہو گئے' مطلب تو ان کا آزاد کشمیر میں گڑبڑ پیدا کرنا تھا لیکن' ہمیں کچھ پتہ نہیں پس پردہ کیا ہو رہا ہے پھر ہمیں حکم مل گیا کہ تم لوگ بھی انہیں آگے مت جانے دو۔ وہ میں بتا چکا ہوں کہ کس طرح انہیں گاڑیوں میں بھر کے پندرہ بیس میل دور چھوڑ کر آتا تھا۔ اور موومنٹ جلد ختم ہو گئی۔

جب یہ تیاریاں ہو رہی تھیں تو سکندر مرزا نتھیا گلی پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے امریکہ برطانیہ اور مغربی جرمنی کے سفیروں کو بلا لیا کہ آپ وہاں آ کے ٹھہریں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ سارا شور و شرابہ ان سفیروں کو دکھائیں گے کہ دیکھو یہ حالت ہے۔ جب وہ سول گورنمنٹ ڈسمس کر کے اپنے آپ کو ڈکٹیٹر بنائے گا تو یہ تینوں حکومتیں اسکا ساتھ دیں گی اور اسے فوری طور پر تسلیم کر لیں گی دوسرے تیسرے دن مجھے پتہ چلا کہ بریگیڈیئر نوازش اور قدرت اللہ شہاب خفیہ طور سے مظفر آباد آئے تھے انہوں نے چودھری غلام عباس کی پارٹی کے ایک صاحب سلیھریا کے ساتھ کھانا کھایا اور چلے گئے اور سکندر مرزا کو جا کے بتایا کہ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

چودھری غلام عباس نے سکندر مرزا اور ایوب خان کو بتایا تھا میں اتنے لاکھ رضا کار لے آؤں گا کہ جیلوں میں جگہ نہیں رہے گی اور یہ کہ میں پاکستان کے ان علاقوں سے جہاں کشمیری آباد ہیں۔ رضا کار بھیجوں گا مثلاً سیالکوٹ' لاہور' گوجرانوالہ اس نے پتہ نہیں کتنے لاکھ تعداد بتائی لیکن وہ موومنٹ تو دو دن میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ سکندر مرزا کی ساری سکیم دھری کی دھری رہ گئی اسے چودھری غلام عباس پر بڑا غصہ آیا چنانچہ اسے پکڑ کے لائے پہلے تو خیال تھا کہ اس کو سکندر مرزا سے ملائیں گے لیکن سکندر مرزا نے کہا کہ میں اس دیوس سے نہیں ملتا اسے جیل میں بھیج دو چنانچہ چودھری صاحب کو منٹگمری جیل (اب ساہیوال) بھیج دیا گیا اور سکندر مرزا غصے میں نتھیا گلی میں اپنا پروگرام ختم کر کے واپس کراچی چلے گئے یوں سکندر مرزا کی مارشل لا لگانے کی دوسری سکیم بھی فیل ہو گئی۔

قلات والی سازش میں بھی ایوب خان شامل تھے جب انہیں دونوں جگہ ناکامی ہوگئی تو آخر کار انہوں نے بغیر کسی بہانے کے 58ء میں مارشل لا لگادیا۔

آپ دیکھیں ہمارے ملک میں یہ لوگ کس طرح سے سازشیں کرتے رہے' کشمیر لبریشن موومنٹ میں سمجھتا ہوں کہ بہت اچھا آئیڈیا تھا اگر اسے نیک نیتی سے کیا جاتا۔ اس میں سکندر مرزا اور چودھری غلام عباس کی سازش نہ ہوتی تو واقعی اس میں کامیابی کی امید تھی سیز فائر لائن کراس کرنے کے اعلان پر ہندو بہت گھبرائے تھے کہ اس کا کیا علاج کریں گے۔ انہوں نے وہاں بڑے بڑے کیمپ لگا دیئے کہ لوگ آئیں گے انہیں وہاں رکھیں گے چونکہ اس میں بدنیتی شامل تھی۔ اس لیے وہ آئیڈیا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا' اس ملک میں اور بہت سے آئیڈیاز کا بیڑہ غرق کیا جارہا ہے جب آپ ایک آئیڈیا کو اچھے مقصد کی بجائے اپنی ذاتی خواہشات کے لیے استعمال کریں گے تو آئیڈیا کو نقصان پہنچے گا

درحقیقت وہ کشمیر چلو کی بات نہیں تھی بلکہ مارشل لا لگاؤ کی بات تھی۔ لہٰذا انہوں نے مارشل لا لگادیا۔

❖

مارشل لا

آزاد کشمیر میں میں چار سال رہا پھر میرا تبادلہ راولپنڈی بطور ایس ایس پی ہو گیا یہ بڑی اہم پوسٹ تھی میرے زمانے میں وہاں ایک ضمنی انتخاب ہوا۔ شیخ مسعود صادق جب مغربی پاکستان کابینہ میں وزیر لیے گئے تو ان کی سیٹ خالی ہو گئی اس پر انتخاب ہونا تھا۔ مسعود صادق کا اپنا امیدوار تھا اس کا نام تو مجھے یاد نہیں اس وقت کی جو اپوزیشن تھی اور جس کے لیڈر علی اصغر شاہ تھے انہوں نے اپنا امیدوار کھڑا کیا تھا راجہ الہ داد۔ اس الیکشن کی اہمیت اس لیے زیادہ ہو گئی کہ ایک تو یہ الیکشن صدر مقام میں ہو رہے تھے دوسرے علی اصغر شاہ اور مسعود صادق دونوں سرکردہ شخصیتیں تھیں دونوں نے ایک دوسرے کو چیلنج کیے۔ مسعود صادق نے کہا تھا کہ اگر ان کا امیدوار الیکشن ہار گیا تو وہ وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے اس لحاظ سے وہ الیکشن کافی اہمیت اختیار کر گیا رفیق عنایت راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر تھے' میرے ان کے سرکاری بھی اور غیر سرکاری بھی بڑے اچھے مراسم تھے' طبعاً وہ سیدھے سادھے افسر تھے لیکن وہاں جو کمشنر تھے چودھری نیاز صاحب' آپ ان کی شخصیت سے اچھی طرح سے واقف ہیں' اصول ان کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئے' وہ موقع محل دیکھ کے چلتے تھے۔ انہوں نے یقین دلا دیا تھا کہ حکومتی امیدوار کو الیکشن جتوانا ان کی ذمے داری ہے۔

یہ کالا باغ کا حکومت کرنے کا خصوصی طریق کار تھا۔ اپنا ایک انداز تھا کہ ہر اہم عہدے پر دو قسم کے افسروں کو تعینات کیا جائے یا تو ان افسروں کو جو بے حد کمزور سمجھے جاتے تھے جن کا کوئی والی وارث نہ ہوتا تھا۔ مثلاً مغربی پاکستان میں چیف سیکرٹری انہوں نے ایسے لوگوں کو لگایا قریشی، عباسی وغیرہ جن کا کوئی سہارا نہیں تھا کمزور تھے یا ایسے لوگ جو بڑے کرپٹ ہوں' میرا خیال ہے کہ چودھری نیاز صاحب کا انتخاب بھی اسی قسم کی سوچ کے تحت تھا کہ وہ الیکشن جتوائے جب چودھری نیاز صاحب آئے تو مجھے انہوں نے بلایا اور کہا کہ یہ الیکشن بڑا اہم ہے' اپوزیشن والوں کو تنگ کرو مثلاً علی اصغر شاہ کی بسیں تھانے میں بند کر

دو لیکن میں نے یہ نہیں کیا۔ لہٰذا وہ الیکشن ہار گئے۔

اس کے بعد جب میں انگلینڈ میں تعینات ہوا۔ اس وقت ایوب خان اپنے پورے جلال میں تھے' تاشقند کا سلسلہ شروع ہوا' وہ بھی نکل گیا' پھر وہ بیمار ہو گئے' بیماری کے بعد دورے پر انگلینڈ آئے' کچھ چیک اپ کا بھی ان کا پروگرام تھا' کچھ وہ تبدیلی بھی چاہتے تھے' اس وقت گوہر ایوب بھی ان کے ساتھ تھے' الطاف گوہر بھی ان کے ساتھ تھے' الطاف گوہر بھی ایوب خان کے ساتھ ٹھہرے تھے لندن سے باہر کنٹری سائیڈ پر جگہ تھی وہاں انتظام کیا گیا تھا' وہاں اسلحے کا ایک بڑا مشہور انٹرنیشنل فیم کا ڈیلر تھا' اس کے وہاں اپنے ہیلی کاپٹر وغیرہ بھی تھے۔ اپنے جہاز بھی، اس کی آمدورفت وہاں جاری تھی' ایوب خان کی اس سے کوئی گفت وشنید چل رہی تھی' کچھ پاکستان کے جوٹینک تھے' ان کے متعلق بھی سلسلہ چل رہا تھا' اس سارے سلسلے میں گوہر ایوب صاحب پیش پیش تھے' کمیشن وغیرہ کا چکر تھا انسان کو بڑی نفرت ہوتی تھی کہ اس شخص کو ملک میں سب سے بڑا عہدہ حاصل ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن اس کو بیماری کی حالت میں بھی یہ خیال ہے کہ اس سودے میں اس کے بیٹے کو کیا مل سکتا ہے۔

یحییٰ خان جب کمانڈر انچیف بنے تو چین گئے تھے وہاں چیئرمین ماؤزے تنگ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ہانگ کانگ تک انعام الرحمٰن علوی ان کے ہم رکاب تھے۔ انعام الرحمٰن علوی پیسے ویسے بنانے میں خاصا ہوشیار آدمی ہے۔ معمولی حیثیت سے 61ء میں انہوں نے سٹینڈرڈ بنک شروع کیا' پھر وہ بہت بڑے سرمایہ دار بن گئے' ہوشیاری کی بات ہے علوی صاحب کو ہاتھ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔

یحییٰ خان جب واپسی پر ہانگ کانگ آئے تو ان کے لیے خریداری اور باقی جو لوازمات تھے وہ تو انہی انعام الرحمٰن علوی صاحب نے کیے علوی صاحب جب بھی لندن آتے تھے میرے ساتھ ملاقات ہوتی تھی کھانا وانا کبھی میرے ساتھ کھا لیتے تھے تو وہاں انہوں نے مجھے بتایا میرا خیال ہے کہ غیر دانستہ طور سے ان کے منہ سے نکل گیا کہ بھئی میں نے یحییٰ خان کا ہاتھ دیکھ کر اسے کہا ہے "ابھی وقت نہیں...... ابھی ذرا صبر کرو" مجھے تاریخوں کا تو اندازہ نہیں کہ یحییٰ خان چین کب گئے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ 1968ء کی بات ہے اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ یحییٰ خان کی نگاہ کہاں لگی ہوئی تھی۔ یہ نہیں ہوا کہ ایوب خان کے خلاف ایجی ٹیشن ہوئی اور انہیں مجبوراً اقتدار میں آنا پڑا۔ یہ بات نہیں تھی بلکہ یہاں جو بھی کمانڈر انچیف ہوتا ہے فوجی حکومت ہو یا سویلین اس کی نگاہ اقتدار پر ہی رہتی ہے اب تک یہی ہوا۔

سوائے جنرل ٹکا خاں کے یا پھر موسیٰ خاں کے۔ اقتدار پر قبضہ کرنا اس کی پلاننگ تھی اور اس پلاننگ کے تحت حالات خراب کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی مکمل صورت تو جو اس وقت اقتدار میں تھے وہی بتا سکتے ہیں لیکن دو ایک باتیں ہیں ایک تو یہ کہ جب ایجی ٹیشن ہو رہا تھا اس وقت میں انگلینڈ میں

تھا مجھے اطلاع ملی کہ اکثر جگہوں میں' میٹنگوں میں یا جلوسوں میں کچھ لوگوں کو سادہ کپڑوں میں محض اس لیے بھیجا جاتا تھا کہ وہ حالات کو اور خراب کریں اور کچھ انٹیلی جنیس ایجنسیز ہیں جو پیسے دے کے لوگوں کو مامور کرتی تھیں کہ وہ حالات کو مزید خراب کریں مطلب یہ کہ انٹیلی جنیس ایجنسیز بھی ایوب خان کے خلاف کام کررہی تھیں' دوسری بات یہ تھی کہ ترین صاحب ہمارے ڈی آئی جی ہوتے تھے ان کے ایوب خان کے ساتھ پرانے مراسم تھے صحیح طور سے مجھے یاد نہیں کہ ایجی ٹیشن کے وقت وہ لاہور میں تھے یا کراچی میں۔انہوں نے مجھے بتایا کہ جب پولیس کارروائی کرتی تھی تو فوج وہاں پہنچ جاتی تھی اور پولیس کو کارروائی کرنے سے روکتی تھی۔ مطلب یہ کہ پولیس کوئی مضبوط قدم نہ اٹھا سکے کہ حالات سدھر جائیں اس طرح پولیس کی پوزیشن خراب ہوتی تھی لوگ پھر پولیس کو گالیاں سناتے تھے اور فوج زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔

لندن کے اخبارات سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت سی خبریں مبالغہ آمیز ہوتی ہیں۔آپ کو یاد ہو گا کہ جب ایوب خان کے آخری دن تھے تو خبر چھپی کہ اتنے لاکھ لوگ دیہات سے ڈھاکہ کی طرف چل پڑے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ سب جعلی خبریں تھیں۔انٹیلی جنیس کے ذریعے دی جاتی تھیں تا کہ ایوب خان کو مجبور کردیا جائے کہ وہ گھبرا کے اقتدار چھوڑ دے۔

یہ ساری خبریں ایوب خان میں گھبراہٹ پیدا کرنے کے لیے دی جارہی تھیں۔

ایوب خان کے وزیر داخلہ اے آر خاں یحییٰ خان کے خاص آدمی تھے۔ڈائریکٹر انٹیلی جنیس این اے رضوی یحییٰ خان کے خاص آدمی تھے' آغا محمد علی یہاں سپیشل برانچ میں ایڈیشنل آئی جی تھے' وہ ان کے بڑے بھائی تھے۔

اے بی اعوان اس وقت سیکرٹری داخلہ تھے انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ایوب خان کو ڈرایا جارہا ہے چنانچہ انہوں نے پیش کش کی وہ خود ایسٹ پاکستان جا کے حالات کو دیکھتے ہیں اور وہ گئے بھی۔ اس بات کا مجھے علم نہیں کہ انہوں نے آکے رپورٹ دی کہ نہیں۔ بہرحال وہ ایسا وقت تھا کہ ایوب خان نے گھبرا کر فیصلہ کرلیا کہ جان چھڑائیں اور انہوں نے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے اس شرط پر کیا کہ ان کی' ان کے بیٹوں کی اور ان کی جائیداد کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی۔

لوگوں نے دیکھ بھی لیا کہ یحییٰ خان نے تین سو تین سرکاری افسروں کے خلاف کارروائی کی لیکن جو چشمہ تھا برائیوں کا جہاں سے یہ سارا سلسلہ شروع ہوا اس کو آخری وقت تک کسی نے نہ چھیڑا۔

الطاف گوہر کے خلاف بھی یحییٰ خان نے دباؤ میں آکر کارروائی کی اس کو وہ پکڑنا نہیں چاہتا تھا۔اس کی بھی ایوب خان نے سفارش کی تھی۔اس کی بھی گارنٹی لی تھی کہ اسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا یہی

نہیں بلکہ ایوب خان نے جانے سے پہلے الطاف گوہر کی لندن میں بطور پاکستانی ہائی کمشنر پوسٹنگ کردی تھی۔ یحییٰ خان نے ایوب خان کی درخواست پر انہیں پوسٹ کیا تھا چنانچہ ان کے کاغذات گئے۔ ان کی منظوری آ گئی لندن میں پاکستانی بہت زیادہ تھے اس تعیناتی پر ان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی کہ جو شخص ایوب خان کا دست راست تھا جس نے پریس ٹرسٹ بنوایا پریس کی آزادی ختم کی اور سب برائیوں کا ایک طرح سے ذمہ دار ہے وہ اب لندن میں سفیر (ایمبیسیڈر) ہو کے آ رہا ہے چنانچہ میں نے وہاں سے رپورٹ بھجوائی کہ پاکستانی کمیونٹی میں اس بات پر بڑا غم و غصہ ہے۔ وہ الطاف گوہر کو ہائی کمشنر کی حیثیت سے کبھی بھی قبول نہیں کریں گے' کرنل حسن پاکستان ایمبیسی میں ملٹری اتاشی تھے' انہوں نے بھی رپورٹ بھیجی کہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ جو شخص ان ساری خرابیوں کا ذمہ دار ہے اس کو آپ ہائی کمشنر بنا کے بھیج رہے ہیں پھر لوگوں کو کیسے یقین آئے گا کہ آپ واقعی کوئی صفائی کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اس پریشر کے تحت یحییٰ خان نے الطاف گوہر کی پوسٹنگ کینسل کر دی اور اس کے خلاف انکوائری وغیرہ کی اور نکال دیا۔

کرنل حسن کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ میں نے ایک ایسا فوجی افسر دیکھا جو ہمیشہ خدا ترسی کی بات کرتا تھا بے لاگ بات کرتا تھا اسی لیے ریٹائر بھی ہو گیا۔

ایوب خان کے دور میں الطاف گوہر پوری آب و تاب پہ تھے۔ میں نے پیچھے ایوب خان کے دورہ انگلستان کا ذکر کیا ہے۔ اسی موقع پر میں اتفاق سے وہاں گیا تو الطاف گوہر، عبداللہ ملک کے پاس بیٹھے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ کس طرح سے سیاستدان ایوب خان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ کیا ان کا ذہن ہے۔ وہ پاکستان کے اندرونی حالات پر اس انداز سے تبصرہ فرما رہے تھے۔ گویا ملک کے سیاہ و سپید کے مالک ہیں۔ سرکاری ملازم نہیں بلکہ پاکستان کے سب سے بڑے سیاستدان ہیں۔ انہیں بالکل یہ احساس نہیں تھا کہ جو باتیں وہ کر رہے ہیں وہ ان کے فرائض میں شامل بھی ہیں کہ نہیں۔ ان کے ذہن میں اس بات کی کوئی تمیز نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک سیاسی لیڈر کے طور پر پیش کریں یا سرکاری افسر کی حیثیت میں۔

الطاف گوہر کی شخصیت کے متعلق میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ وہ بہت قابل انسان ہیں۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔ لیکن منافقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور گھٹیا پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کسی گرے ہوئے انسان کو ٹھوکر مارنا کوئی بہادری نہیں۔ بھٹو صاحب کو جب پھانسی دی جا رہی تھی۔ اس وقت الطاف گوہر کا آپ نے ایک مضمون دیکھا ہوگا۔ جس میں انہوں نے بھٹو صاحب کی بڑی برائیاں کی تھیں اور ان کی غلطیوں کے متعلق بہت سارے اشارے کیے تھے جو کچھ بھٹو صاحب نے ان کے ساتھ کیا

جو کچھ اس زمانے میں ان کے ساتھ ہوا۔ میں کبھی نہیں کہوں گا کہ وہ درست ہوا۔ الطاف گوہر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ جو بالکل غیر ضروری تھی۔ لیکن الطاف گوہر نے اپنے آرٹیکل میں بتایا کہ جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو کس کس طرح انہوں نے ان پر سختیاں کیں اور کس طرح انہیں جیل سے بلا کے رہا کیا۔ یہاں آ کے وہ رک جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اتنے ہی مجاہد تھے تو انہیں یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اس کے بعد انہوں نے بھٹو صاحب کے ساتھ کیا کیا سمجھوتے کیے اور کیا کیا فائدے اٹھائے لیکن جہاں تک بھٹو صاحب کی شخصیت کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہاں تک وہ رہے۔ اس کے بعد اپنا کردار نہیں بتایا اگر واقعی الطاف گوہر اتنے مجاہد تھے، تو پھر وہ سختیاں برداشت کرتے۔ سمجھوتہ نہ کرتے۔ ان سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ لیکن انہوں نے تو بھٹو صاحب کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔

مطلب یہ کہ جو بھٹو چاہتے تھے۔ وہ انہوں نے کیا۔ بھٹو صاحب ان کو جو رعایت دے سکتے تھے۔ وہ ان کو دی اور انہوں نے قبول کی۔ ان کا ذکر کرنا کون سے کمال کی بات ہے۔ بھٹو صاحب نے ان کو اسٹیبلش کیا۔ ان کے بھائی تجمل حسین کو سفیر بنا کے بھیجا۔ ان کو روٹی پلانٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ کن اصولوں پہ کیا۔ اس کے بعد ان کو زیب نہیں دیتا تھا کہ ان کی برائی ایسے وقت کرتے جب ان کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ اگر واقعی وہ بھٹو صاحب سے لڑتے رہتے۔ سختیاں برداشت کرتے رہتے۔ ان سے کوئی سمجھوتہ نہ کرتے۔ ان سے کوئی رعایت قبول نہ کرتے۔ اس امتحان میں کامیاب ہوتے تو پھر میں سمجھتا کہ الطاف گوہر بڑا با اصول آدمی ہے۔ بہت عظیم انسان ہے۔ لیکن اس نے تو یہی ظاہر کیا کہ وہ موقع پرست ہے۔ بے اصول ہے اور یہ کہ اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے ایک مجبور انسان کو اور ایک ایسے انسان کو جو پھانسی کے تختے کے قریب ہے۔ جو جواب نہیں دے سکتا۔ اس پر بھی وہ حملہ کرنے سے باز نہیں آتے، تو یہ کوئی مردانگی نہیں۔ اس سے ان کی شخصیت اجاگر نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں ان کی کیا مجبوریاں تھیں کہ انہوں نے یہ حرکت کی۔ کس مجبوری کے تحت کی، کس کی شہ پر کی، کس کو خوش کرنے کے لیے کی۔ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ کون سے وہ خفیہ ہاتھ ہیں جو اس قسم کے لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ کس وقت کیا کام کریں۔ یا کیا بیان دیں۔ یا کیا آرٹیکل وہ لکھیں۔ کہتے ہیں کہ چھ نکات بھی انہیں کا شوشہ تھا۔ ذاتی طور پر مجھے چھ نکات کے متعلق علم نہیں۔ لیکن مجھے صاحبزادہ فاروق علی صاحب نے بتایا تھا کہ لاہور میں کانفرنس تھی۔ مجیب الرحمٰن کی کسی چیز سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی نئے ذہن کے ساتھ آیا ہے۔ وہ کانفرنس کا ایک حصہ تھا۔ تاشقند کے بعد اپوزیشن کی میٹنگ تھی۔

صاحبزادہ صاحب نے بتایا کہ مجیب نے کانفرنس میں کھڑے ہو کر اچانک چھ نکات پیش کر دیئے۔ سب حیران رہ گئے کہ اس نے یہ کہاں سے نکالے ہیں۔ بہر حال لوگ کہتے یہ ہیں کہ یہ نکات

الطاف گوہر نے تجویز کئے تھے۔ اس لیے کہ ایوب خان چاہتے تھے کہ یہ کانفرنس ناکام ہو جائے۔ ان میں انتشار ہو جائے۔

اصل میں الطاف گوہر کے بھی ہارون برادرز سے بڑے تعلقات تھے۔ مجیب کی لیڈر شپ میں ہارون برادرز کا جو حصہ رہا اور پھر الطاف گوہر سے ان کی دوستی یہ تحقیق طلب موضوع ہے بہر حال یہ میرے ذاتی علم میں نہیں کہ چھ نکات کس نے ڈرافٹ کیے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں ایک بنگالی سی ایس پی افسر تھے۔ شفیع الاعظم اس نے ڈرافٹ کیے تھے۔ وہ صاحب بعد میں ایسٹ پاکستان میں چیف سیکرٹری بھی رہے۔

❖

یحییٰ خان

جب یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا۔ میں پاکستان سے باہر تھا۔ چونکہ میں انٹیلی جینس میں تھا تو یہاں کے حالات کا سرکاری طور سے بھی اور غیر سرکاری طور سے بھی اچھا خاصا علم رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ سیدھا سادا، عام سا سپاہی ہے اس کو سیاست کا کوئی علم نہیں، نہ تجربہ ہے اور نہ سیاست میں دخل دینے کی خواہش ہے۔ اس کا یہ کام ہے کہ وہ الیکشن کرائے اور اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر کے واپس چلا جائے۔

پچھلے تیس چالیس برس سے تیسری دنیا کے جو حالات رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو بھی ڈکٹیٹر آتا ہے کہیں بھی آئے اس کا سب سے پہلا اعلان یہی ہوتا ہے کہ اس کو اقتدار کا کوئی شوق نہیں وہ صرف جمہوریت بحال کرے گا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جمہوریت وہ اس وقت بحال کرے گا، جب اس کا وقت آئے گا۔ اگر وہ یہ اعلان نہ کرے اور اس کی بجائے کہے کہ میں تو بیٹھوں گا تو وہ شورش جس کے سہارے وہ آتا ہے وہ بند نہ ہو۔ چلتی رہے اگر یحییٰ خان اس وقت یہ کہتا کہ میں جمہوریت بحال نہیں کروں گا اور میں جمہوریت پر یقین نہیں رکھتا تو جس موومنٹ کی وجہ سے ایوب خان کو رخصت ہونا پڑا تھا۔ وہ ختم نہ ہوتی۔ اسی طرح آپ ضیاء الحق کا عہد بھی دیکھ لیں۔ اگر وہ یہ نہ کہتے کہ میں الیکشن کراؤں گا تو قومی اتحاد کی موومنٹ چلتی رہتی اور اس میں پیپلز پارٹی بھی شامل ہو جاتی۔

یحییٰ خان کے متعلق مجھے یاد ہے کہ لندن "اکانومسٹ" کے ایک آرٹیکل کی سرخی تھی۔ "ایسا ڈکٹیٹر جو خود سے ڈکٹیٹر نہیں بنا۔" یعنی یحییٰ خان کا آتے ہی جو روپ تھا اس سے باہر کے صحافی بھی دھوکہ کھا گئے کہ جس طرح سے اور جس انداز سے یہ بات کرتا ہے یہ تو بڑا جینوئن اور مخلص آدمی ہے۔ لیکن شروع ہی سے میں اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ یہ اس نے صرف روپ دھارا ہے۔ اس میں بالکل تبدیلی نہیں آئے گی اور اس کا اقتدار دوسروں کے حوالے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کی میرے پاس وجوہ تھیں۔ کچھ تو انسان کے اپنے تجربات کی بنیاد پر اخذ کیا ہوتا ہے۔ کچھ معلومات ہوتی ہیں ایک تو انعام الرحمٰن علوی والی

بات جس کا میں ذکر کر چکا ہوں دوسری بات بھی مجھے انعام الرحمٰن علوی نے بتائی۔ کہ جب ایوب خان چلے گئے اور یحییٰ خان نے ایوب خان کے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا تو انہوں نے کہا کہ میری کمانڈر انچیف والی کرسی بڑی (خوش قسمت) کرسی ہے۔ اس کو وہاں لے چلو۔ چنانچہ وہ کرسی کمانڈر انچیف کے دفتر سے پریذیڈنٹ کے دفتر میں لے جائی گئی۔ بطور صدر بھی وہ اسی کرسی پر بیٹھتے رہے۔ وہ اتنا تو ہم پرست بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس کرسی پر وہ بیٹھتا تھا، وہ بڑی خوش قسمت کرسی ہے، تو اسے وہ وہاں لے گیا، تا کہ وہ وہاں بھی خوش قسمت ثابت ہو۔ تو جس شخص نے اقتدار عارضی سنبھالا ہوا سے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی وہ کرسی بھی وہاں لے جائے۔ جسے وہ خوش قسمت سمجھتا ہے۔ یہ دو معمولی سی باتیں ہیں۔ لیکن اس سے انسان کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے ون یونٹ توڑا اگر وہ مخلص ہوتا تو یہ نہ کرتا۔ یہ چیز ہمارے دو آئینوں کا حصہ تھیں۔ 56ء کے آئین کا اور 62ء کے آئین کا۔ یہ اس نے اس لیے کیا کہ وہ اپنے آپ کو پاپولر ڈکٹیٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ پاپولر لیڈر کی حیثیت سے پیش کر سکے گا۔ یہ اس کی بدنیتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس پاپولیرٹی کے زور پر آئندہ بھی صدر رہنا چاہتا تھا اگر وہ مخلص تھا تو ایک کام کرتا۔ کہ 56ء کا آئین جو کہ فوج نے توڑا تھا۔ جس پر ایسٹ اور ویسٹ پاکستان دونوں متفق تھے۔ اس کو بحال کر دیتا۔ اس کے تحت الیکشن کراتا۔ تو پاکستان کے دو ٹکڑے بھی نہ ہوتے۔ اس نے اتنے بڑے آئینی فیصلے تو کر دیئے لیکن صوبائی خودمختاری کا مسئلہ طے نہ کیا۔ اس کو ویسے کا ویسے رہنے دیا اور اس ایشو کی وجہ سے آخر کار پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے۔

اس میں ولی خان نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس طرح کہ جب ایوب خان گئے تو ولی خان جیل میں تھے۔ ہمارے ایک پولیس افسر ارباب ہدایت اللہ، ولی خان کے بڑے قریب رہے ہیں۔ وہ اس وقت سپیشل برانچ پشاور میں ایس پی تھے۔ ان کے ذریعے ولی خان نے یحییٰ خان کے بھائی آغا محمد علی کو پیغام بھیجا کہ ایوب خان چلے گئے ہیں، میں بہت خوش ہوا ہوں۔ میں یحییٰ خان کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کو چاہیے کہ وہ ون یونٹ توڑ دیں۔ پیریٹی ختم کر کے ون مین ون ووٹ کے تحت الیکشن کرائیں۔ چنانچہ ارباب صاحب یہ پیغام لے کے آغا محمد علی کے پاس پہنچے۔ آغا صاحب نے یحییٰ خان سے بات کی۔ پھر آغا محمد علی خود پشاور جیل میں پہنچے۔ میری اطلاعات یہی ہیں کہ وہاں ولی خان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس میں ولی خان کی نیت اچھی تھی یا بدنیتی شامل تھی یا محض ایک مشورہ تھا اس حوالے سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یا یحییٰ خان کی نیک نیتی یا بدنیتی شامل تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان آئینی فیصلوں کے بعد اگر ایسٹ پاکستان الگ نہ ہوتا تو مجیب الرحمٰن حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ انہوں نے اپنا الیکشن چھ نکات کی بنیاد پر جیتا تھا اور چھ نکات کی بنیاد پر وہ نیا آئین بناتے۔ اس کا مطلب یہ

تھا کو جو خود مختاری ایسٹ پاکستان کو ملتی وہی خود مختاری سرحد کو، بلوچستان کو، سندھ کو اور پنجاب کو ملتی، مغربی پاکستان کا ہر صوبہ اتنا ہی خود مختار ہوتا، جتنا کہ ایسٹ پاکستان ہوتا اور وہ خود مختاری کبھی نہ کبھی پوری آزادی میں تبدیل ہونا تھی اور مغربی پاکستان کے چار صوبے چار ملک بن جاتے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنے اقتدار کی خاطر یہ دھمکی دی تھی کہ جو ممبر ایسٹ پاکستان گئے میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ وہ بے ایمان ہیں اور غلط بیانی سے کام لیتے ہیں یا وہ جاہل ہیں کہ جو بھٹو صاحب کے بارے میں ایسی بدگمانی کرتے ہیں۔ وہ لوگ صورتحال کا صحیح ادراک ہی نہ کر سکے اس لیے کہ اس وقت کے ماحول میں مجیب الرحمٰن کے جو بیانات آ رہے تھے۔ آئین چھ نکات کی بنیاد پر ہی بنتا۔ تو چھ نکات صرف مشرقی پاکستان کے لیے نہیں تھے۔ پاکستان کے ہر صوبے کے لیے تھے۔ ایسٹ پاکستان نے تو بنگلہ دیش بننا ہی تھا۔ بھٹو صاحب کی سیاسی بصیرت کی میں داد دیتا ہوں اور میں ان کا مداح بہت ہوں کہ انہوں نے اسمبلی میں نہ جا کے اور اپنی پارٹی کو اور دوسرے لوگوں کو روک کے۔ پاکستان کو پانچ حصوں میں بٹنے سے بچالیا۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ولی خان نے یحییٰ خان کو جو مشورہ دیا تھا کہ آپ ون یونٹ توڑ دیں۔ پیریٹی ختم کر دیں اس میں ان کے روایتی نظریے کا کہاں تک عمل دخل تھا۔ یا یہ کہ انہوں نے نیک نیتی سے یحییٰ خان کو مشورہ دیا تھا۔

ایک سیاستدان کا ایک فوجی ڈکٹیٹر کو پیغام بھجوانا کہ میں آپ کو سپورٹ کروں گا۔ اور اس کا مشیر بن جانا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اصولوں پر نہیں۔ بلکہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بہر حال، ویسے میں ولی خان کی انسان ہونے کی حیثیت سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ اور میرے ان سے جو بھی تھوڑے بہت تعلقات رہے ہیں۔ بڑے خوشگوار رہے ہیں۔

یحییٰ خان نے پاکستان میں ساری ایجنسیوں سے سروے کرایا کہ الیکشن کے نتائج کیا ہوں گے۔ سول اور فوجی تمام ایجنسیوں نے اسے رپورٹ دی کہ ایسٹ پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی اکثریت ہوگی۔ لیکن وہ اکثریت 51 سے 55 فیصد سیٹوں کی صورت میں اسے ملے گی۔ ویسٹ پاکستان میں کوئی پارٹی اکثریت میں نہیں آئے گی کسی کی دس کسی کی پندرہ کسی کی بیس سیٹیں ہوں گی لیکن بھٹو صاحب کی شائد دوسروں سے زیادہ ہو جائیں اس پر سب متفق تھے۔

مجھے اس کا ذاتی طور پر علم ہے کہ ان کی سکیم یہ ہے کہ مجیب کی اکثریت ہوگی۔ لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ غالب اکثریت نہیں ہوگی اس صورت میں سچوایشن یہ ہوگی کہ ایسٹ پاکستان سے لوگوں کا ترجمان مجیب ہوگا۔ وہ بھی مضبوط مجیب نہیں، کمزور مجیب۔ ویسٹ پاکستان کے سیاستدانوں کی کھچڑی پکی ہوگی۔ اس طرح اقتدار ویسٹ پاکستان کی مضبوط فوج اور ایسٹ پاکستان کے کمزور نمائندے میں بٹے گا۔ مجیب الرحمٰن کو فوج وزیراعظم بنا دے گی چونکہ مجیب میں نہ اتنی عقل ہے نہ فراست نہ اس کو اتنی سپورٹ ہوگی۔

پانچ چھ مہینے کے بعد وہ اتنا غیر ہر دلعزیز ہو جائے گا کہ وہ اس کو ہٹا سکیں گے پھر یحییٰ خان بلا شرکت غیرے اس ملک پر حکومت کریں گے۔

انتخابات سے پہلے راؤ فرمان علی جو اس وقت فوج کے دماغ مانے جاتے تھے موجودہ حکومت میں بھی ان کا مشورہ چلتا رہا ہے مجھے نہیں معلوم کیا حالات ہیں چونکہ اندھوں میں کانا راجہ ہونے والی بات ہے اور راؤ صاحب تھوڑی بہت سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ یحییٰ خان کے زمانے میں راؤ فرمان علی کی ذات پر، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ پر کافی بھروسہ کیا جاتا تھا چونکہ سب سے مشکل مسئلہ ایسٹ پاکستان میں تھا۔ ان کو وہاں سویلین افیئرز کا انچارج لگایا گیا۔ سروس کے دوران میرے ان سے زیادہ تعلقات نہیں رہے اور نہ کبھی ہم اکٹھے رہے۔ ہمارا ایج گروپ بھی مختلف ہے وہ آپریشن کے لیے لندن آئے۔ آپریشن کے بعد وہ ہفتہ دس دن میرے پاس ہی ٹھہرے۔ اس لیے کہ میرے گاؤں (کلانور) کے ہیں برادری کے بھی ہیں تو پہلی دفعہ ان سے مفصل ملاقات ہوئی چونکہ میری جاب انٹیلی جینس کی تھی۔ اس کا سیاست سے بڑا واسطہ تھا اور وہ خود اس وقت فوج میں سیاست کے ایکسپرٹ تھے۔ اس لحاظ سے ان سے کافی بات چیت رہی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جو الیکشن آپ کرا رہے ہیں۔ اس میں کس قسم کا نتیجہ نکلے گا تو پھر کس طرح سے بات بنے گی اس لیے کہ ایسٹ پاکستان کے بیشمار لوگ لندن میں تھے۔ ان سے مل کے مجھے بالکل مختلف اندازہ ہوتا تھا۔ جو ویسٹ پاکستان کے لوگ تھے، یا جو برسر اقتدار تھے انہیں اب بات کا صحیح اندازہ نہیں تھا کہ ایسٹ پاکستانیوں کے ذہنوں میں کیا گزر رہی ہے تو راؤ صاحب بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ انہوں نے وہ ساری سکیم مجھے بتائی کہ الیکشن کے رزلٹ یہ ہوں گے، اس طرح سے اقتدار مضبوط فوج اور کمزور مجیب کے درمیان بٹے گا۔ پھر یہ کہ مجیب ایجی ٹیٹڑ ہے اس لیے وہ حکومت نہیں چلا سکے گا۔ پھر ہمارے لیے اسے ہٹانا بڑا آسان ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ راؤ فرمان نے مجھے جو کچھ بتایا وہ اس وقت کے فوجی حکمرانوں کی اندر کی سوچ تھی۔

یحییٰ خان راؤ فرمان پر کسی حد تک انحصار کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یحییٰ خان وہاں سرکاری دورے پر آئے الیکشن سے تھوڑے دن پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ بڑے فکر مند تھے کہ راؤ فرمان بیمار ہے۔ اسے فوری طور پر ایسٹ پاکستان بھجوایا جائے۔ کیونکہ وہاں حالات ٹھیک نہیں تھے۔ تو انہوں نے ہمارے میڈیکل ایڈوائزر سر الیگزینڈر رڈرنمنڈ کو بلا کے خاص طور سے ہدایت کی کہ اس کا علاج جتنی جلدی ہو سکتا ہے کروائیں تا کہ یہ جلدی ایسٹ پاکستان جانے کے قابل ہو۔ مجھے وہاں اس کی اشد ضرورت ہے۔

❖

لندن

لندن اس لحاظ سے بڑا اہم مرکز ہے کہ وہاں کامن ویلتھ کے لوگ، جو انگریزوں کی نوآبادیاں رہے ہیں ان لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ہے ان ممالک میں آزادی کی جو تحریکیں چلیں۔ وہ ان لوگوں نے چلائیں جو وہاں سے پڑھ کے آئے مثلاً گھانا کے نکرومہ، کینیا کے جوموکنیاٹا۔ اسی طرح قائداعظمؒ، گاندھی، نہرو وغیرہ، یہ سب لوگ وہاں رہے۔ وہاں پڑھے۔ میں نے دیکھا کہ جو چیزیں ان ملکوں میں بعد میں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کا وہاں پہلے پتہ چل جاتا ہے۔ مزدوروں میں، پڑھے لکھے لوگوں میں ایسٹ پاکستان کے بھی وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ خاص طور سے سلہٹ اور میمن سنگھ کے لوگ مطلب یہ کہ جب میں وہاں گیا تو پاکستانیوں میں یہ فرق تھا کہ ویسٹ پاکستانی اپنا زیادہ وقت کاروبار میں صرف کرتے تھے یا پھر جو لڑکے وغیرہ ہوتے تھے وہ لڑکیوں کے پیچھے یا اس قسم کے مشغلوں میں لگے رہتے تھے لیکن جو ایسٹ پاکستانی تھے ان کا رجحان ہمیشہ سیاست کی طرف ہوتا تھا۔ اس لیے وہاں پاکستانی سیاست میں غالب عنصر ایسٹ پاکستانیوں کا تھا۔ مثلاً وہاں جو پاکستانی جاتے تھے ان میں دو قسم کے لوگ ہوتے تھے ایک جو یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے۔ دوسرے وہ جو دن کو کام کرتے تھے رات کو قانون کی یا سی اے وغیرہ کی تیاری کرتے تھے ایک وہاں پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن تھی۔ اس کے ہر سال الیکشن ہوتے تھے۔ روایتاً ایسٹ پاکستانی لڑکے اس الیکشن میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور انہی کا پریذیڈنٹ ہوتا تھا چونکہ ایسٹ پاکستانیوں کا ہولڈ ہوتا تھا اس لیے ان کی سیاست اضطرابی (ایجی ٹیشنل) ہوتی تھی۔ مثلاً ایوب خان برسراقتدار تھے۔ جب بھی وہ وہاں جاتے تھے۔ ان کے خلاف جتنی بھی ایجی ٹیشنز ہوتی تھیں۔ ان میں یہی پیش پیش ہوتے تھے وہاں ایک طرح سے پاکستانی آبادی اپوزیشن میں ہوتی تھی۔

بے شمار شہر اور قصبے ایسے تھے جہاں پاکستانی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی

پاکستانی ایسوسی ایشن بنائی ہوئی تھی۔ان سب نے مل کر ایک فیڈریشن آف پاکستانیز ایسوسی ایشنز بنائی تھی۔ یہ عام طور پر پاکستانی مزدوروں کی نمائندہ ہوتی تھی۔ ہر ایسوسی ایشن کا صدر عام طور سے ایسٹ پاکستانی ہوتا تھا۔اس طرح وہاں پاکستانی سیاست پر ایسٹ پاکستانی عنصر غالب تھا اور وہ ہنگامہ پرور عنصر تھا کیونکہ ایسٹ پاکستان کو ہمیشہ ویسٹ پاکستان کے خلاف شکائتیں رہی ہیں اور ہمیشہ اقتدار ویسٹ پاکستانیوں کے پاس رہا ہے۔ اس لیے ان میں وہ لوگ ہوتے تھے۔ جنہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ پاکستانیوں سے علیحدہ ہونا ہے اور وہ پاکستان کی سیاست میں ملوث نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ پاکستان سے علیحدہ اپنی سیاست کرتے تھے انہیں جب بھی کبھی پاکستانی حکومت کو پریشان کرنے کا موقع ملتا۔اس سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہاں ایک پاکستان سٹوڈنٹس ہاسٹل تھا جس میں سارے پاکستان کے سٹوڈنٹس رہتے تھے۔ ہمارے ہائی کمشن کی بلڈنگ کے بالکل قریب تھا لیکن وہاں ایسٹ پاکستانیوں نے اپنا ایک علیحدہ ہاسٹل بھی قائم کر رکھا تھا۔اس کا نام ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس ہاسٹل تھا۔اس کا ہمارے ہائی کمشن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہاں ہندو بھی رہتے تھے۔ مسلمان بھی رہتے تھے اور ہندوؤں میں ایسے لوگ بھی تھے جو کلکتہ کے تھے۔ان کی آمدورفت انڈین اور امریکن سفارت خانوں میں بھی شروع ہوگئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسٹ پاکستان کی علیحدگی کی موومنٹ ایک طرح سے لندن سے شروع ہوئی۔ جس طرح ہندوستان کی آزادی کی تحریک ان کا رشتہ ہندوستان سے قائم ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جو فنکشن ہوتے تھے چونکہ اس کا پریذیڈنٹ بنگالی ہوتا تھا اس لیے ان فنکشنز میں ہندوستان کے لوگوں کو جو وہاں مقیم تھے، مدعو کیا جاتا تھا۔ گانے ناچنے والوں میں بھی ہندوستانی ہندو لڑکیاں لڑکے آتے تھے۔اس طرح سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان کا کلچر بنگالی کلچر ہے۔ وہ پاکستانی کلچر نہیں لیکن اس موومنٹ میں پیش پیش مخصوص لوگ تھے۔ ہر ایسٹ پاکستانی اس میں شامل نہیں اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ ایسٹ پاکستان کی علیحدگی کی موومنٹ وہاں شروع ہو چکی تھی۔ وہاں ایسے بھی ایسٹ پاکستانی تھے۔ جو بڑے اچھے مسلمان تھے بہت اچھے پاکستانی تھے ہم سے بہتر پاکستانی تھے وہ اس سلسلے میں بڑے فکرمند تھے کہ پاکستان نہ ٹوٹے۔

میں ایک شخص کا نام ضرور لوں گا۔اس سے بہتر مسلمان اور اس سے بہتر پاکستانی میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن تھے۔ سٹوڈنٹ کی حیثیت میں بھی ان کا سیاست میں بڑا عمل دخل تھا۔ بڑی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور کھنڈ کر مشتاق سے بھی ان کی جان پہچان تھی۔ پہلے وہ وہاں سٹوڈنٹ تھے۔ پھر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی۔ان کے مقالے کا عنوان ''مسلم لیگ کی تاریخ 1906ء سے 1911ء تک'' تھا۔نواب سلیم اللہ خاں کا جو پریڈ تھا۔ بعد میں وہ کتابی صورت میں شائع بھی ہوا۔ بہر حال،

ان سے بڑی دوستی ہوگئی، اس کتاب کا ڈرافٹ انہوں نے مجھے دکھایا کہ ذرا چیک کردیں۔ یوں اس کتاب کی تکمیل میں میں نے ان کی اعانت کی۔ ان سے سوشل تعلقات تھے۔ آنا جانا بھی تھا۔ ان میں سیاسی شعور بہت تھا۔ جب مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش میں پکڑا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا ''ایوب خان نے یہ بڑی غلطی کی ہے۔ جب مارشل لا لگا تھا۔ تو ایوب خان نے مجیب کو ایمانداری کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ اس کے خلاف انٹی کرپشن کا کیس رجسٹر ہوا۔ جس میں وہ بری ہوگیا۔ ایوب خان نے اس کو سرٹیفکیٹ دے دیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایماندار ہے۔ اب آپ نے اس کو غداری کے الزام میں پکڑا ہے۔ عدالت سے وہ بری ہو جائے گا۔ اس طرح اسے حب الوطنی کا یہ سرٹیفکیٹ بھی ایوب خان فراہم کر دیں گے۔''

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کہتے تھے ''آپ نے ایک طرح سے مجیب الرحمٰن کو موقع دے دیا۔ کیونکہ ہمارے لوگ جو ایسٹ پاکستان کو علیحدہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ٹارگٹ ہے کہ 1980ء تک یہ علیحدہ ہو جائے گا۔'' یہ میں 67ء۔68ء کی بات کر رہا ہوں۔ جب کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مجیب الرحمٰن کو پکڑ کے گورنمنٹ آف پاکستان نے یہ ٹارگٹ پانچ سال نزدیک کر دیا ہے اب ہم سمجھتے ہیں کہ ایسٹ پاکستان 1975ء تک آزاد ہو جائے گا۔''

میری رپورٹیں موجود ہیں۔ یہ نہیں کہ میں اب یہ بات کر رہا ہوں۔

یعنی اگرتلہ سازش اور مجیب الرحمٰن کی گرفتاری سے اسے 1980ء کی بجائے 1975ء کر دیا۔ لیکن یحییٰ خان صاحب نے اس میں اور بھی آسانی کر دی۔ انہوں نے 1971ء میں چار سال پہلے ہی اس کو آزاد کرا دیا۔

1970ء کی بات ہے۔ مجیب الرحمٰن لندن آئے۔ ابھی الیکشن نہیں ہوئے تھے نہ وہ اکثریتی پارٹی کے لیڈر تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے انہیں اس طرح سے ٹریٹ کیا۔ جیسے وہ سربراہ مملکت ہوں۔ فارن آفس کے آدمی ان کے استقبال کے لیے گئے۔ فارن آفس کی کار انہیں ہوٹل تک پہنچا کے آئی جس سے لگتا تھا کہ وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ اصل لیڈر آئندہ مجیب الرحمٰن ہوگا۔

یا تو وہ پلان کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش کا صدر ہوگا۔ یا یہ کہ پاکستان کا وزیراعظم ہوگا بہرحال اس کا استقبال انہوں نے سربراہ مملکت کی طرح سے کیا۔ جب مجیب آئے۔ تو بنگالیوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ بنگالیوں میں اس لحاظ سے بڑی انسانیت ہوتی ہے ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ بڑا رکھ رکھاؤ ہوتا ہے کوئی لیڈر ہے تو اس نے باہر آدمی کھڑا کیا ہوا ہے کہ کوئی بغیر اجازت کے اندر نہیں آسکتا۔ ایک طبقاتی تمیز ہے پھر یہ کہ کس کے ساتھ بیٹھیں گے۔ کس کے ساتھ کھانا کھائیں گے ہر چیز مقرر ہوتی ہے جبکہ ایسٹ

پاکستانیوں میں بڑی عوامی سیاست ہوتی ہے۔ مجیب الرحمٰن کے جاگنے سے پہلے ہی لوگ آنا شروع کر دیتے تھے جس ہوٹل میں وہ ٹھہرے تھے ان کے پاس دو کمرے تھے۔ پہلے ڈرائنگ روم بھرنا شروع ہوتا تھا۔ پھر ان کا بیڈ روم بھرنا شروع ہو جاتا تھا صبح سے لے کر شام تک بیچارے کے پاس تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی ہر آدمی اس سے بات کرنا چاہتا تھا اس صورت میں کسی کے ساتھ کوئی خاص بات کرنا ہوتی تو اسے وہ باتھ روم میں لے جایا کرتے تھے یہاں میں نے ایک شخص دیکھا ہمارے جو معراج خالد صاحب ہیں ان کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔

ایک انگریز مجھ سے ملا پوچھنے لگا، مجیب الرحمٰن پڑھتا کب ہے اس لیے کہ اتنا بڑا لیڈر ہو اور اسے حکومت کا سربراہ بھی بننا ہو اس کے لیے تو بڑا ضروری ہے کہ وہ معیشت، سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات کے جو رجحانات ہیں ان پر گہری نگاہ رکھے۔ لیکن اس بیچارے کو فرصت ہی نہیں ہوتی تھی کہ کوئی سنجیدہ پڑھائی کر سکے۔ چنانچہ میں نے اس انگریز سے کہا کہ وہ پڑھتا نہیں۔ وہ اخبار بھی نہیں پڑھتا۔ وہ کہنے لگا تو پھر وہ علم کہاں سے حاصل کرتا ہے میں نے اسے بتایا کہ جو لوگ آ کے اس کو باتیں بتاتے رہتے ہیں وہی اس کی ایجوکیشن ہے۔

ایک قومی لیڈر کے لیے تعلیم کا یہ بڑا ناقص طریقہ ہے جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں وہ اپنے تعصبات اپنی نفرتیں، اپنا نقطہ نظر لے کر آتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے وہ لیڈر متاثر ہوتا رہتا ہے۔

اس وقت دو چار بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں جو ایسٹ پاکستانی اسے ملے انہوں نے مجیب الرحمٰن سے پوچھا ٹھیک ہے ہم مان لیتے ہیں کہ آپ اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لیں گے آپ وزیراعظم بھی بن جائیں گے ہمیں آپ یہ بتائیں کہ اس فوج کا آپ کیا علاج کریں گے جب تک کہ طاقت فوج کے پاس ہے جو ویسٹ پاکستان کی فوج ہے اگر آپ پرائم منسٹر ہو بھی گئے تو آپ کو کیا اختیار ہوگا اس کا علاج مجیب الرحمٰن کے پاس نہیں تھا لیکن فوج کے پاس اس کا جواب تھا وہ جب چاہتے مجیب کا علاج کر لیتے لیکن مجیب کے پاس کوئی علاج نہیں تھا ان ساری بحث کا لب لباب تھا کہ جب تک وہ مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتے ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا مجیب الرحمٰن کے دماغ میں اگر یہ کبھی تھا بھی کہ وہ پورے پاکستان کا لیڈر بنے گا۔ لندن کے اس وزٹ میں جو لوگ اس سے ملے اس سے کم از کم اس کو اندازہ ہوا کہ جب تک وہ فوج کا کوئی علاج نہیں سوچے گا۔ وہ خود مختار وزیراعظم نہیں بن سکتا اور میرا خیال یہ ہے کہ اس وجہ سے ایسٹ پاکستانیوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ان کا وزیراعظم ہو جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر خود مختار ہو جائیں۔

یوسف ہارون اور محمود ہارون ہمیشہ سے مجیب کے بہت نزدیک رہے ہیں وہاں جب مجیب

الرحمٰن آیا تو یوسف ہارون اس سے ملے۔ یوسف ہارون کی لندن میں آمد ورفت رہتی تھی ان کا وہاں مکان بھی تھا وہ مجیب سے ملے۔ ایسٹ پاکستانی جو وہاں تھے وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ مجیب الرحمٰن کا ہارون برادرز سے بڑا سازشی قسم کا رشتہ ہے۔ انہوں نے اس بات پر بڑا اعتراض کیا کہ یہ لوگ آپ کے اتنے قریب کیوں ہیں اس پر مجیب الرحمٰن کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا کہ جب میں جیل میں تھا اور میرے بچے بھوکے مر رہے تھے اس وقت تم میں سے کتنے آدمی تھے جو میرے گھر والوں کو جا کر پوچھتے تھے کہ بھئی تمہیں کوئی ضرورت تو نہیں اس وقت انہی یوسف ہارون نے محمود ہارون نے میرا خیال رکھا۔ وہ میرے دوست ہیں اور وہ میرے دوست رہیں گے تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ تم مجھ سے سیاست کی بات کرو۔

بہر حال وہ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرا لیکن آخری جو دو چار دن تھے لندن سے ایک اور جگہ، ساؤتھ میں، ساحل کے کنارے، وہاں وہ چلا گیا اور کوئی آدمی اس کے ساتھ نہیں گیا کسی بنگالی کو وہ ساتھ لے کے نہیں گیا وہاں سے مجھے رپورٹیں یہ ملیں کہ وہاں اس کی ملاقات امریکنوں سے رہی۔ اس لیے دو چار دن اس نے اپنے لیے بالکل علیحدہ جگہ مخصوص رکھی ہوئی تھی۔ جہاں اس کے ساتھ کوئی اور بنگالی یا پاکستانی نہیں گیا۔

پاکستان میں انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ انتخابی مہم زور شور سے جاری تھی اور شیخ مجیب الرحمٰن لندن سے واپس مشرقی پاکستان چلے گئے تھے کہ وہاں سیلاب آ گیا۔ سیلاب تو آیا ایسٹ پاکستان میں لیکن لگتا یہ تھا کہ ساری دنیا میں پراپیگنڈے کا سیلاب آ گیا ہے روزانہ ٹیلی ویژن اور اخبارات میں ایسٹ پاکستانیوں کی لاشیں دکھا رہے ہیں اور عجیب عجیب سنسنی خیز خبریں کہ دس لاکھ آدمی مر گئے بیس لاکھ آدمی مر گئے ہیں مجھے یاد ہے ایک تصویر میں انہوں نے دکھایا کہ فوجی بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ایک گاؤں میں سیلاب سے متاثرہ ایریا تھا بنگالی مردے دبا رہے ہیں بنگالی بالکل سوکھے، مریل تھے اور فوجی جو تھے وہ صحت مند۔ ہٹے کٹے وہ ویسٹ پاکستان کے تھے وہ کنٹراسٹ بھی انہوں نے خاص طور سے دکھایا کہ ایک وہ ہیں جو استحصالی ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو استحصال زدہ ہیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بنگلہ دیش بنانے کا ذمہ مغربی پریس نے لے لیا تھا اور ساری کی ساری مہم انہوں نے شروع کی ہوئی تھی پھر میں نے دیکھا کہ فضا میں اچانک تبدیلی آ گئی جو ایسٹ پاکستانی پہلے ہمیں ملتے تھے وہ ذہنی طور سے بھی اور دلی طور سے بھی ہم سے علیحدہ ہوتے چلے گئے۔ مطلب یہ کہ سیلاب جو تھا اور اس کا جو پروپیگنڈا ہوا اسے میں بظاہر ایک موڑ سمجھتا ہوں جہاں ایسٹ پاکستانی جذباتی طور سے، ذہنی طور سے ہم سے علیحدہ ہو گئے۔ ان دنوں یحیٰی خان شائد چین سے آ رہے تھے پھر یہ پروپیگنڈا بھی ہوا کہ یحیٰی خان وہاں رکا نہیں۔ پھر یہ کہ ہیلی کاپٹر وہاں

نہیں پہنچے جو امداد کو صحیح طور پر وہاں پہنچا سکیں اور یہ کہ ہر ایسٹ پاکستانی کی آمدنی فوج پر اور ویسٹ پاکستان پر خرچ ہوتی ہے اگر ایسٹ پاکستان پر مصیبت آئے تو یہ ویسٹ پاکستان والے کچھ نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ مولانا بھاشانی نے این اے رضوی (ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو) سے کہا کہ یحییٰ خان سے کہو کہ (1970ء کے) الیکشن ملتوی کر دے۔ اگر اس نے اس وقت الیکشن کرا دیئے تو پھر مجیب کو کوئی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ این اے رضوی نے بھاشانی سے وعدہ کیا۔ اس کو انڈرسٹینڈنگ دی کہ اس نے یحییٰ خان سے بات کر لی ہے لیکن الیکشن ملتوی نہ ہوئے تو بھاشانی نے اسے اپنی سیاسی موت سمجھا۔ اس نے کہا بچو پھر ٹھیک ہے اگر تم نے الیکشن ملتوی نہیں کیے تو میں بھی اب اپنی سیاست کرتا ہوں اس وقت آپ کو یاد ہوگا کہ بھاشانی نے پھر مجیب سے بھی زیادہ سخت مطالبات پیش کر دیئے۔ مجیب سے بھی دو قدم آگے بڑھ کے مطالبات شروع کر دیئے تا کہ اسے سیاسی برتری حاصل ہو جائے۔

اصل میں بھاشانی کے متعلق مجھے زیادہ علم اس لیے نہیں کہ ایسٹ پاکستان میں میں کبھی تعینات نہیں رہا دوسرے میں انٹیلی جنیس میں رہا تو بھی اندرونی معاملات (انٹرنل ایشوز) کم ڈیل کیے۔ ویسٹ پاکستان کے متعلق تو یہ خوش قسمتی رہی کہ سارے صوبوں میں میں نے کسی نہ کسی حیثیت میں ملازمت کی لیکن مشرقی پاکستان کے حالات سے اتنی واقفیت نہیں تھی۔

الیکشن ہوئے ان میں مداخلت ہوئی۔ میرے سامنے جو واقعات گزرے وہ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ یحییٰ خان نے الیکشن فری اینڈ فیئر کرائے تھے۔

جب یحییٰ خان نے یہ اندازہ لگایا کہ ایسٹ پاکستان میں مجیب کی میجارٹی آئے گی اور ویسٹ پاکستان میں بھٹو صاحب شائد اوروں سے زیادہ سیٹیں لے جائیں تو انہوں نے کوشش کی کہ مجیب جو ان کے پہلے اندازے کے مطابق اتنا کمزور نہیں رہا تھا اس کو کمزور کیا جائے اور بھٹو صاحب کی سیٹیں اور کم کی جائیں ویسٹ پاکستان میں کسی ایسے آدمی کے ساتھ خفیہ بات چیت کی جائے جو فوج کے لیے قابل قبول ہو چنانچہ اس سلسلے میں رضوی صاحب اور جنرل عمر کو استعمال کیا گیا این اے رضوی کو ایسٹ پاکستان میں استعمال کیا گیا اس لیے کہ وہاں کی انٹیلی جنیس کی معرفت ان کے بھاشانی سے اچھے مراسم تھے۔ ذاتی مراسم بھی تھے، سرکاری مراسم بھی تھے۔ آنا جانا تھا دوسرے حکومت کی اس وقت جو پالیسی ہوتی تھی وہ بھاشانی صاحب سے امداد مانگتے تھے بھاشانی صاحب ان پالیسیوں میں حکومت کی امداد کر دیتے تھے جو ان کو سوٹ کرتی تھیں۔

ویسٹ پاکستان میں جو جماعتیں دائیں بازو کی تھیں جنرل عمر کو ان کے لیے استعمال کیا گیا جنرل عمر نے یحییٰ خان کے ایما پر بڑے بڑے صنعت کاروں سے پیسے اکٹھے کیے اور وہ پیسے اس الیکشن میں

استعمال کیے۔ بعد میں تو انکوائریاں بھی ہوتی رہیں۔ پیسے انہوں نے اکٹھے زیادہ کیے لیکن بہت کم استعمال کیے۔ بہت سارے خود کھا گئے۔

اس زمانے میں معاملہ کروڑوں کا نہیں لاکھوں کا ہوتا تھا۔ جب انکوائری ہوئی تو میرا خیال ہے رضوی صاحب نے تین لاکھ روپے واپس کیے تھے۔ جنرل عمر کے خلاف یہ بھی تھا کہ انہوں نے کوئی سترہ اٹھارہ لاکھ روپے جمع کیے سارے خرچ نہیں کیے۔ بھٹو صاحب نے انکوائریاں کرائی تھیں۔ رضوی صاحب نے مان لیا تھا کہ انہوں نے اتنے پیسے کھائے ہیں اور وہ پیسے ان کو واپس کرنے پڑے۔

بھٹو صاحب نے ان لوگوں کو اس طرح سے نیم زخمی کر کے چھوڑا۔ بعد میں اس کے جو نتائج تھے وہ کیا ہوئے۔ اصل میں شہنشاہ ایران کی سفارش پر بھٹو صاحب نے رضوی کو معاف کر دیا تھا۔ این اے رضوی چونکہ شیعہ تھے۔ اس وقت ایران کی انٹیلی جینس کے نصیری سے این اے رضوی صاحب کی اچھی خاصی صاحب سلامت تھی۔ شہنشاہ ایران نے جنرل نصیری کی معرفت بھٹو صاحب تک سفارش پہنچائی بلکہ بعد میں پتہ چلا کہ بھٹو صاحب سے یہ بھی کہا گیا کہ رضوی کو سفیر بنا کے ایران بھیج دیں۔ لیکن انہیں نہیں بھیجا گیا۔

رضوی صاحب ایک دفعہ امریکہ گئے۔ واپسی پر انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں وہ فارلینڈ کے ہاں ٹھہرے تھے۔ فارلینڈ کا آپ کو پتہ ہی ہے کہ یہاں ایمبیسیڈر بھی رہا اور سی آئی اے کے حوالے سے اس کا خاصا شہرہ تھا ان کے ساتھ رضوی صاحب کے اچھے خاصے اور گہرے مراسم تھے۔ سی آئی اے کا ہیڈکوارٹر اس وقت تہران تھا ہو سکتا ہے کہ سی آئی اے نے مل کے یہ کوشش کی ہو کہ انہیں ایران میں پاکستان کا سفیر بنا کے بھیجا جائے۔ اس کے لیے بھٹو صاحب تیار نہیں ہوئے۔

بہرحال بھاشانی کو رضوی صاحب کے ذریعے پیسے مہیا کیے گئے کہ وہ مجیب کی جتنی زیادہ سے زیادہ مخالفت کر سکتے ہیں کریں۔ ادھر خان قیوم کو جنرل عمر کے ذریعے پیسے دیئے گئے۔ فوجی حکومت چاہتی تھی کہ قیوم خان ایک لیڈر کی حیثیت سے ابھریں۔ اس لیے کہ وہ ان کو قابل قبول تھے اور ان کی جتنی بھی امداد تھی وہ حکومت نے کی، مالی طور سے بھی خفیہ طور سے بھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو اور مجیب پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ بھاشانی اور قیوم خان کی خوب امداد کی گئی۔ یحیٰی خان اور ان کے ساتھیوں کا یہ پکا ارادہ تھا کہ الیکشن کے نتائج پر اثر انداز ہوں تا کہ ان کی سکیم پوری طرح کامیاب ہو تھوڑا بہت جو شک وشبہ ہے وہ بھی دور ہو جائے۔ انہوں نے کوشش کی کہ قیوم خان کو متحدہ مسلم لیگ کا صدر بنایا جائے جب اس پر اتفاق نہیں ہوا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ قیوم خان کو سپورٹ کیا جائے۔ اس کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ قیوم خان کو مالی امداد کی گئی پالیسی یہ تھی کہ قیوم خان کے جو امیدوار ہیں جہاں تک ہو سکتا ہے انہیں سپورٹ کیا

جائے۔

ایوب خان کی حکومت جب ناکام ہوئی تو درحقیقت لوگوں کو نفرت آمریت (ڈکٹیٹر شپ) سے ہوئی۔ ڈکٹیٹر شپ چاہے کتنی ہی مضبوط ہو وہ سیاسی طور سے کبھی بھی حکومت نہیں چلا سکتی۔ ان حالات میں اگر یحییٰ خان کوئی سیاسی پارٹی بناتے جس طرح کہ ایوب خان نے بنائی تھی اور پھر وہ سیاست میں دخل دیتے تو لوگوں کو یہ صورت بالکل ہی قبول نہ ہوتی۔ یحییٰ خان چاہتے تھے کہ پہلے سیاست دانوں کو ڈس کریڈٹ (ناکام اور بدنام) کریں اس کے بعد اپنی ڈکٹیٹر شپ کا راستہ بنائیں اس کے بغیر وہ جم کے حکومت نہیں چلا سکتے تھے چنانچہ سیاست دانوں کو ناکام و بدنام کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ الیکشن کراؤ۔ سیاستدانوں کو حکومت دو۔ ان کی حکومت کو ناکام کرو۔ تاکہ سیاستدانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو اور فوج کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ الیکشن یحییٰ خان کی مجبوری تھی۔ انہوں نے ملک کو تحفہ تو نہیں دیا۔ اس مجبوری کو وہ اپنے لیے سیاسی طور سے اور مالی طور سے جتنا قابل قبول بنا سکتے تھے وہ انہوں بنایا ان کا خیال تھا کہ اس الیکشن کے ذریعے ان کو فائدہ ہوگا ان کے لیے راستہ صاف ہوگا اس لیے انہوں نے الیکشن کرائے۔ لیکن جب الیکشن کے نتائج آئے تو وہ ان کی توقع کے بالکل خلاف تھے اتنے خلاف توقع کہ پھر یحییٰ خان کو راستہ ہی نظر نہیں آیا۔ ہارے ہوئے جواری کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ یحییٰ خان کا بھی ایک ہارے ہوئے جواری کا سا حال تھا صرف اقتدار سے چمٹا رہنے کے لیے بغیر کسی سوچ کے بغیر کسی سمجھ کے اس کو ہر روز ایک نیا داؤ نظر آتا تھا۔ شاید اس سے ان کا ایک دن اور گزر جائے۔ وہ اقتدار میں رہنے کی خاطر اس سطح تک آ گئے کہ انہوں نے ہر وہ حرکت کی جوان کو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہر وہ قدم اٹھایا جوان کو نہیں اٹھانا چاہیے تھا آخر کار ملک تباہی کے کنارے پر جا پہنچا۔

جب الیکشن ہو گئے تو محسوس ہونے لگا کہ پاکستان کی سیاست اس نہج پر پہنچ رہی ہے کہ شاید وہ ہم سے علیحدہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں بڑا دلچسپ قصہ سناتا ہوں کہ الیکشن کے بعد کھنڈکر مشتاق صاحب وہاں آئے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ میں بڑا کام کیا تھا۔ قائداعظمؒ کی قیادت میں کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن سے ہمیشہ ان کی دشمنی رہی وہ اپنے آپ کو مجیب الرحمٰن سے بلند پایہ اور سنیئر لیڈر سمجھتے تھے لیکن عوامی سیاست میں وہ پیچھے رہ گئے مجیب الرحمٰن نے انہیں عوامی لیگ کا سینئر وائس پریذیڈنٹ بنایا ہوا تھا عوامی لیگ کی سیاست علیحدگی کی سیاست نہیں تھی اس لیے میں کہتا ہوں کہ جب فوج اقتدار پر قبضہ کرتی ہے اور ملک چلاتی ہے اس کو سیاسی سوجھ بوجھ تو ہوتی نہیں۔ جس وجہ سے بہت ساری خرابیاں بہت سارے حادثے رونما ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے کھنڈکر مشتاق صاحب۔ کے ساتھ کام کیا

تھا۔انہیں پتہ تھا کہ کھنڈ کر مشتاق نے جائیداد وغیرہ نہیں بنائی وہ بہت ہی غریب آدمی ہیں۔اس حال میں وہ اپنی بیوی اور ایک ڈاکٹر کے ہمراہ لندن پہنچ گئے۔مطیع الرحمٰن نے ان سے ملاقات کی۔ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے آکے بتایا کہ میں نے پوچھا، کھنڈ کر صاحب آپ اور لندن؟ کہاں سے پیسے آئے؟ انہوں نے جواب دیا۔مجھے تو پتہ نہیں شیخ مجیب الرحمٰن سے پوچھو۔کہنے لگے، میں بیمار تھا شیخ مجیب الرحمٰن میری عیادت کو آئے اور کہا کہ آپ بیمار ہیں یہاں آپ کا علاج نہیں ہوسکتا آپ لندن کیوں نہیں چلے جاتے میں نے کہا میرے پاس اتنے پیسے نہیں مجیب نے کہا آپ پیسے کی فکر نہ کریں تیاری کریں میں نے کہا اکیلا جا کے کیا کروں گا۔مجیب نے کہا آپ کی بیوی بھی ساتھ جائے گی اگلے روز کسی بنک کا منیجر آگیا جس نے مجھے تین ٹکٹ دیئے ایک ڈاکٹر کا ایک میری بیوی کا اور ایک میرا اور دو ہزار پونڈ کے ٹریولرز چیک مجھے دیئے اور کہا آپ کی سیٹ کنفرم ہے آپ چلے جائیں اور میں یہاں آگیا۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کہتے ہیں پھر میں نے پوچھا عوامی لیگ کو پیسہ کہاں سے آتا ہے کھنڈ کر مشتاق نے جواب دیا سارا خرچہ یوسف ہارون نے برداشت کیا ہوا ہے اور حالت یہ ہے کہ عوامی لیگ کے جو لوگ منتخب ہو گئے ہیں ان کے لیے ہارون نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی انتظامیہ کو ہدایت دے رکھی ہے کہ یہ لوگ آئیں جو کچھ بھی کھائیں ان سے بل نہیں لیا جائے گا یہ صرف سائن کریں گے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ہارونوں کے شیئرز تھے عوامی لیگ کے جتنے بھی ایم این اے ایم پی اے تھے ان کو انٹر کانٹ میں کھانے کی، پینے کی عیش کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ان کا بل یوسف ہارون صاحب ادا کرتے تھے اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ یوسف ہارون کا کیا کردار ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہاں سے وہ پیسے آتے تھے کس لیے وہ کر رہے تھے۔جب مجیب الرحمٰن 71 میں لندن پہنچا ہے تو سب سے پہلا آدمی جس کو اس نے فون کیا وہ محمود ہارون تھے، میرا خیال ہے کہ جب الیکشن ہوئے ہیں اور جب بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک چل رہی تھی۔تب بھی محمود ہارون ان سے ملتے رہے ہیں یہ تو آئندہ حالات ہی بتائیں گے کہ ہارون برادرز کا بنگلہ دیش کے بننے میں کیا رول ہے لیکن مشتاق کھنڈ کر صاحب نے جو کچھ کہا وہ میں نے واضح کر دیا ہے۔آخر وقت تک مشتاق کھنڈ کر پاکستانی تھے میں نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ لندن میں پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن تھی۔جب کھنڈ کر صاحب وہاں آئے ہیں تو انہوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔کھنڈ کر صاحب جلسے میں چیف گیسٹ تھے اور لوگوں نے بھی تقریریں کیں۔ایک ایسٹ پاکستانی لڑکے نے اپنی تقریر میں قائداعظمؒ پر تنقید شروع کر دی اور کہا کہ انہوں نے جو پاکستان بنایا تھا وہ بالکل غلط بنایا تھا اس کی کوئی تک نہیں ہے ہمارا کلچر علیحدہ ہے مغربی پاکستان کا کلچر علیحدہ ہے وہ ہمیں ایکسپلائٹ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس پر ویسٹ پاکستانی لڑکے بڑے

مشتعل ہوئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر شور مچانا شروع کر دیا اور مقرر سے کہا بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کیا بکواس کرتے ہو اس پر مشتاق کھنڈ کر کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا دیکھیں جو اس کے خیالات ہیں اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بیان کرے یہ اس کا حق ہے آپ اس کو کہنے دیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کا جواب دیں اگر آپ مجھے کہتے ہیں تو میں اس کا جواب دوں گا'' یہ ایک جمہوریت پسند سیاستدان کا انداز تھا قائداعظمؒ کی جو ٹریننگ تھی اس کا اثر تھا۔ کھنڈ کر صاحب نے کتنی صحیح بات کی تھی۔

چنانچہ اس ایسٹ پاکستانی لڑکے نے اپنی تقریر ختم کی تو کھنڈ کر صاحب نے کہا۔ آپ جواب دیں گے یا میں جواب دوں۔ ویسٹ پاکستانی لڑکوں نے کہا آپ ہی جواب دیں تو کھنڈ کر صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ میں قائداعظمؒ کا ایک ادنیٰ ورکر رہا ہوں اور اب بھی میرے لیے یہ قابل فخر بات ہے کہ میں ان کا ایک ادنیٰ ورکر تھا۔ اب بھی میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مجھے پاکستان میں قائداعظمؒ جیسا لیڈر مل جائے اب بھی میں اس لیڈر کے لیے ایک ادنیٰ ورکر کی حیثیت سے کام کروں گا۔ اس پر ویسٹ پاکستانیوں نے بھی اور ایسٹ پاکستانیوں نے بھی تالیاں بجائیں وہ مطمئن ہو گئے۔ جو خاص بات نوٹ کرنے والی ہے یہ ہے کہ مشتاق کھنڈ کر اس وقت بھی عوامی لیگ کے سینئر نائب صدر تھے مجیب الرحمٰن کے خرچے پر لندن آئے تھے لیکن وہ صحیح طور پر سے پاکستانی تھے اور اگر حالات مناسب ہوتے اس وقت کے فوجی سربراہ کسی سنجیدگی سے عقل مندی سے، دانش مندی سے کام لیتے تو میرا خیال ہے کہ ایسٹ پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ رونما نہ ہوتا۔

ابھی ایسٹ پاکستان میں ملٹری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ یحییٰ خان نے سیاسی لیڈروں کو ڈھاکہ بلایا ہوا تھا مجھے یاد ہے وہاں اسلامک سنٹر میں ایک میٹنگ تھی جہاں تمام مسلمان ملکوں کے سفیر موجود تھے۔ اس میں مصر کا سفیر بھی تھا بڑا سمجھدار آدمی تھا مصری عام طور سے پاکستان کے خلاف ہی ہوتے تھے لیکن وہ خاص طور سے میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا ایسٹ پاکستان کا کیا بن رہا ہے میں نے کہا ڈھاکہ میں بات چیت ہو رہی ہے اس نے کہا، ہاں اس کا کچھ نہ کچھ فیصلہ ہونا چاہیے ورنہ معلوم نہیں، کیا تباہی ہو، مطلب یہ کہ وہاں کے جو مسلمان ایمبیسیڈر تھے۔ وہ بھی بڑے فکر مند تھے۔ یہاں تک کہ مصریؑ جو پاکستان کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے وہ بھی فکر مند تھے کہ ایسٹ پاکستان کا کیا بنے گا سب کی خواہش تھی کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جائے لیکن جب ڈھاکہ میں کوئی فیصلہ نہ ہوا تو پھر ملٹری ایکشن ہو گیا۔

ملٹری ایکشن ہوا تو جو بھی میرے ایسٹ پاکستانی دوست تھے وہ مجھ سے ملتے رہے میں نے محسوس کیا کہ ذہنی طور سے وہ بات نہیں رہی پھر یہ ہوا کہ ایسٹ پاکستان سے جتنے بھی غیر ملکی نامہ نگار نکالے گئے تھے وہ ہندوستان سے ٹیلی ویژن کی فلمیں اور باقاعدہ ڈسپیچ بھیجتے تھے اس میں انہوں نے بتایا کہ کس

طرح سے ہندوستان کی سرحد کے ساتھ جوا یریاز ہیں وہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ یہ خبر بھی آئی کہ میجر جیا خان نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ وہی جنرل ضیاء الرحمٰن جو بعد میں وہاں کے پریذیڈنٹ بنے اور چٹا گانگ میں ہی قتل ہوئے۔ یحیٰی خان، ایوب خان، ٹکا خان نے سمجھا کہ فوجی جو ہوتا ہے وہ خان ہی ہوتا ہے حالانکہ ضیاء الرحمٰن بنگالی تھا۔ بنگالیوں میں پاکستان کا حامی تو کوئی بھی نہیں تھا لیکن ذاتی طور سے ہمارا میل جول رہا۔ پاکستان کے سفارت خانے میں بھی ایسٹ پاکستان کے کافی لوگ تھے۔ سفیر کے بعد جو نمبر دو تھا وہ ایسٹ پاکستانی تھا بلکہ وہ تو پھر بنگلہ دیش گیا ہی نہیں۔ پاکستان فارن سروس میں ہی رہا۔ اس طرح سے لندن میں فرسٹ سیکرٹری بھی بنگالی تھے۔ سیکنڈ سیکرٹری تھا۔ دو چار تھرڈ سیکرٹری تھے۔ پھر وہاں آہستہ آہستہ لوگ باغی ہونا شروع ہو گئے۔ پہلے ہمارے سٹاف سے لوگ گئے اس طرح سے خبریں آتی رہیں کہ فلاں بنگالی افسر چھوڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن اس دوران بیچارے ایک غمزدہ انسان تھے وہ بہرحال پاکستانی ہی رہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستانی خیال رکھنے والے بنگالیوں نے وہاں تحریک چلائی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے ممبر رہے جب تک مجیب الرحمٰن زندہ رہے وہ بنگلہ دیش واپس نہیں گئے ان کی پاکستانیوں یا ویسٹ پاکستانیوں سے راہ ورسم نہ بھی ہو میرا خیال تھا کہ دلی طور سے وہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوں گے انہوں نے وصیت کی کہ انہیں پاکستان میں ہی دفن کیا جائے اور وہ اسلام آباد میں محو استراحت ہیں۔

جب میں واپس پاکستان پہنچا تو ایسٹ پاکستان میں فوجی ایکشن ہو چکا تھا اور ہندوستان حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

مجھے نقصان یہ ہوا کہ ملک میں جو اہم مرحلہ تھا اس عرصہ میں میں باہر رہا لیکن اس میں فائدہ بھی تھا کہ جو ملک میں ہو رہا تھا اسے میں باہر سے دیکھ رہا تھا۔ خاص طور سے ایک فری پریس کے ذریعہ جو بڑا کھوج لگانے والا پریس تھا اس کی معرفت دیکھ رہا تھا۔ مجھے صحیح صورتحال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں یہاں واپس آیا تو مجھے معلوم تھا کہ ایسٹ پاکستان ہمارے ساتھ نہیں رہے گا لیکن ہمارے پاکستانی خاص طور سے فوجی ہمیشہ کی طرح بڑی خوش فہمی میں مبتلا تھے جولائی اگست 71ء میں ایسا تھا لگتا تھا کہ فوج نے حالات پر قابو پا لیا ہے۔ لیکن باہر رہ کے مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمارے فوجی ایسٹ پاکستان کو کسی طرح بھی ساتھ نہیں رکھ سکیں گے جب میں یہاں باتیں کرتا تھا تو لوگ سمجھتے تھے کہ شاید میں کوئی غدار ہوں یا اینٹی پاکستان ہوں لیکن میں تو صرف ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ جس غلط فہمی میں وہ مبتلا ہیں وہ بڑی جلدی دور ہو جائے گی۔

❖

پاکستان واپسی

اگست 1971ء میں میں واپس پاکستان آیا مجھے پشاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جینس مقرر کیا گیا۔

جو کچھ پشاور کے علاقے میں ہوتا تھا فرنٹیئر میں ہوتا تھا میرا کام تھا کہ اس کے متعلق صحیح معلومات رکھوں اس میں بہت سے ایسے مسئلے تھے جن کی میں رپورٹ نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سارے مسئلے ایسے تھے جن کی میں رپورٹ کرسکتا تھا۔

پشاور میں انٹیلی جینس کا دفتر صرف اندرونی انٹیلی جینس کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ سے انگریزوں کے زمانے سے یہاں کا انٹیلی جینس آفس کابل اور سنٹرل ایشیا کے لیے ان کی آنکھ اور کان تھے۔

مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان کے پاس جو فوج تھی وہ اس حد تک کم تھی کہ ہم کابل بارڈر پر فوج نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس وقت ضرورت یہی تھی کہ جتنی بھی فوج ہے وہ ہندوستان کے خلاف صف آرا ہو۔ اس لیے کابل بارڈر خالی چھوڑنا پڑتا تھا کچھ خبریں یہ بھی تھیں کہ روسی کوشش کررہے ہیں کہ کابل اپنی فوجیں پاکستان بارڈر پر لے آئے تاکہ پاکستان اپنی فوجیں کابل بارڈر سے ہٹا کر انڈیا کے خلاف نہ استعمال کر سکے۔ یہ مسئلہ اس لحاظ سے بڑا سنگین تھا کہ ہمیں ایک ایک سپاہی کی ضرورت تھی غیر ضروری طور سے وہاں فوج لگانا بھی بڑا خطرناک تھا۔ خطرے کی موجودگی میں بالکل ہٹالینا بھی خطرہ مول لینے والی بات تھی چنانچہ گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر نے یہ اندازہ کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی کہ کابل ہمارے خلاف استعمال ہوگا کہ نہیں وہ ہماری پیٹھ میں چھرا تو نہیں گھونپیں گے اگر انڈین بارڈر پر ہماری سچوایشن خراب ہو تو کابل کا کیا ردعمل ہوگا اور یہ کہ ہم وہاں سے اپنی فوجیں ہٹا سکتے ہیں کہ نہیں ہٹا سکتے۔ جب وہ میٹنگ ہوئی تو اس میں آئی ایس آئی کا آدمی بھی موجود تھا۔ سپیشل برانچ کا ڈی آئی جی بھی موجود تھا

باقی چیف سیکرٹری ہوم سیکرٹری سب وہاں تھے۔ سارے کمشنر وہاں موجود تھے سب نے اپنی اپنی رائے دی ہمارے سرکاری افسروں کا ہر مسئلے کے متعلق ایک خاص نظریہ بن جاتا ہے اور وہ ہر چیز کو اس زاویے سے دیکھتے ہیں میں اس کا کریڈٹ نہیں لینا چاہتا میں نے وہاں یہ رائے دی کہ:

"کابل کی پالیسی جو بظاہر پاکستان کے خلاف لگتی ہے پاکستان کے خلاف کبھی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسی شکل اختیار کر رکھی ہے کہ وہ روس سے بھی انڈیا سے بھی مغربی ملکوں سے بھی جتنی زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل کرتے رہیں اس ضمن میں اپنی اہمیت جتانے کے لیے ان کو کسی شوشے کی ضرورت ہے اور وہ شوشہ ان کے لیے پختونستان ہے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ ظاہر شاہ روس گئے وہاں ان پر زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی فوجیں پاکستان کے خلاف صف آرا کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنی اسمبلی (Loya Jrga) سے پوچھ کے اور ان کی سپورٹ لے کے ایسا کروں گا۔ وہ افغانستان واپس آئے اسمبلی میں جو ان کے خاص معتمد تھے ان سے انہوں نے کہا کہ تم لوگ سیشن میں ہی نہ آؤ تا کہ نہ کورم پورا ہو نہ یہ فیصلہ ہو سکے اس کے علاوہ ہمیں وہاں بارڈر پر کوئی بھی غیر معمولی فوجی نقل و حرکت نظر نہیں آئی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کابل کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ شوشے چھوڑتا رہے لیکن انہوں نے کوئی بڑا قدم پاکستان کے خلاف کبھی نہیں اٹھایا اور نہ وہ اٹھائیں گے صرف یہی نہیں کہ وہاں کا بادشاہ یہ نہیں چاہتا یا حکمران طبقہ نہیں چاہتا بلکہ ان کی مجبوری یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان پاکستان کے درمیان جنگ چھڑی، افغانستان کے عوام ہمیشہ ذہنی طور سے بھی اور جذباتی طور سے بھی پاکستان کے ساتھ ہوتے ہیں اور اپنے عوام کے جذبات کے خلاف تو کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا اس لیے ہمیں کابل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہم یہاں سے اپنی فوج بالکل ہٹا سکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ میٹنگ ختم ہوئی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کے کمشنر نے باہر آ کے مجھے کہا، "ہم نے بڑی بڑی کانفرنسیں اٹنڈ کی ہیں۔ انٹیلی جینس کے لوگوں کا ہمیشہ ایک ہی طریق کار ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوٹوک بات نہیں کرتے وہ رسک نہیں لیتے کہ اگر خدانخواستہ وہ بات صحیح ثابت نہ ہو تو ساری ذمہ داری ان پر آئے گی۔ لیکن آپ نے دوٹوک بات کر دی ہے اس لیے میرے نزدیک آپ دوراندیش انٹیلی جینس آفیسر نہیں ہیں۔" میں نے انہیں کہا کہ "میں جو اپنے ملک کے فائدے کے لیے صحیح سمجھتا تھا۔ وہ میں نے کیا ہے ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔" بہر حال، یہ میری صحیح دیانتدارانہ رائے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کابل بارڈر پر ہمارا کوئی سپاہی موجود نہ رہا۔ سب کو وہاں سے ہٹا کے پاکستان کے ایسٹرن بارڈر پر لگا دیا گیا۔

جب پوری فوج ایسٹرن بارڈر کی طرف روانہ ہوئی 65ء کی جنگ میں مجھے تجربہ تھا کہ ہمیں صحیح

صورت حال کا پتہ نہیں تھا ہمارا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو پاکستان کو بڑی فتح ہوئی ہے اس وقت خطرے کا کوئی احساس نہیں تھا کوئی مایوسی نہیں تھی۔ ہر انسان بڑا مطمئن تھا اور بڑا جذبہ تھا لیکن 71ء میں جب وہ فوج پشاور سے موو کر رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ بڑی اداسی سی ہے دل کہتا تھا کہ ہم کسی تباہی کی طرف جا رہے ہیں حالانکہ اس وقت اتنا خیال نہیں تھا کہ ہمارا یہ حشر ہوگا اور ہم اتنی بڑی شکست سے دو چار ہوں گے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری جو نسل ہے خاص طور سے پاکستانیوں کی۔ وہ کچھ نسیم حجازی کے ناولوں کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں ان کے ذہنوں میں یہ چیز ڈال دی گئی ہے اور وہ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس مسلمان ہونا ہی کافی ہے اور جو مسلمان ہو، تو وہ سو آدمیوں پر بھی حاوی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جب حالات خراب ہو رہے تھے ایسٹ پاکستان میں مکتی باہنی والے روز بروز حالات بگاڑ رہے تھے لوگ سوچ رہے تھے کہ یہ حالات کس طرح سے ٹھیک ہوں گے۔ ان کا حل کیا ہوگا۔ اس دوران میں یحییٰ خان کا پشاور میں بنگلہ تیار ہو گیا وہ مکان ان کا تھا لیکن اس پر پیسے سارے سٹینڈرڈ بینک کے لگ رہے تھے اور سٹینڈرڈ بنک پشاور کے منیجر صاحب اسے بنوا رہے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ جب بنگلہ تیار ہو جائے گا تو بنک اس کو کرائے پر لے لے گا۔ اس طرح سے جنرل صاحب کی نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری۔ مکان تیار تھا فرنیچر، ائرکنڈیشنز، فٹنگز وغیرہ سب کچھ ہو گیا پھر پروگرام بنا کہ اس کا افتتاح کیا جائے یہاں پارٹی ہو۔ میری سرکاری رہائش گاہ بالکل ان کے سامنے تھی جب اس فنکشن کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ تو ایسے محسوس ہوا کہ پاکستان کے جتنے کنجر ارد گرد تھے وہ مع اپنے اہل و عیال کے وہاں پہنچ گئے۔ کسی نے کسی ریسٹ ہاؤس پر قبضہ کر لیا ہے اور کسی نے کسی ریسٹ ہاؤس پر قبضہ کر لیا اس کے علاوہ جو جنرل یحییٰ خان کے خاص لوگ تھے وہ سارے آ گئے۔

کیا نام بتاؤں۔ شریف لوگ تھے۔ جو لوگ بھی تھے سب کو معلوم ہے راز کی کوئی بات نہیں ہے وہ لوگ پہنچے۔ اس کے بعد جنرل یحییٰ خان آئے۔ جنرل حمید بھی ان کے ساتھ آئے اور بھی جوان کا مخصوص ٹولہ تھا۔ انعام الرحمٰن علوی سب چیزوں کے انچارج تھے نہ گرمیاں تھیں نہ سردیاں۔ سوئمنگ پول کے سامنے رات کے 'دو' تین بجے تک شراب چلتی رہی۔ بڑا ہاؤ ہو ہوتا رہا۔ سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ پشاور میں ایک جرمن جوڑا تھا۔ وہ آدمی لکڑی کی صنعت کاری کا ایکسپرٹ تھا۔ جسے انہوں نے پاکستان لگایا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے متعلق مشہور یہ تھا کہ وہ سی آئی اے کی جاسوس ہے اس کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر اس محفل میں خاص طور سے فوجیوں کی پارٹی میں وہ کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ عورت خوبصورت تھی لہٰذا ہر جگہ ویلکم ہوتی تھی اس کا حسن ایک طرح کا پاسپورٹ تھا چنانچہ وہ محترمہ بھی جنرل یحییٰ خان صاحب کی پارٹی میں نہ صرف موجود تھیں بلکہ یحییٰ خان کی باقی جو دوست تھیں

ان سب میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی ویسے بھی ویسٹرن تھی۔ Bikini پہن کے ان کے ساتھ نہا رہی تھی۔ ہوتا یہ رہا کہ اس محترمہ کو جرنیل اٹھا اٹھا کر سوئمنگ پول کے اندر پھینکتے تھے وہ پھر باہر نکلتی تھی۔ قہقہے لگتے تھے۔

یہ اس وقت کا حال ہے جب ایسٹ پاکستان میں ہمارے بے شمار فوجی مارے جا رہے تھے اور سالم پاکستان کے آخری دن تھے چونکہ یہ قصہ میرے گھر کے سامنے ہو رہا تھا میں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر یہی حال ہے تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ اصل میں فوجی حکمرانوں کی سب سے بڑی کمزوری اور خرابی یہ ہے چونکہ وہ مختار کل ہوتے ہیں۔ انہیں کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا جوابدہی کا ڈر نہیں ہوتا نہ اخبار میں جوابدہی ہوتی ہے نہ پارلیمنٹ میں جوابدہی ہوتی ہے اور جب وہ اپنی طاقت کے نشے میں ہوتے ہیں پھر انہیں خیال نہیں رہتا کہ کس حد تک جانا چاہیے پھر وہ ہر حد سے گزر جاتے ہیں انہیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب ملک کا سنگین نقصان ہو جاتا ہے۔ آپ ساری ہسٹری دیکھیں۔ ان لوگوں نے اس وقت اقتدار چھوڑا ہے جب انہیں کسی شرمناک واقعہ سے دو چار ہونا پڑا۔ اگر یحییٰ خان کو ایسٹ پاکستان میں شرمناک شکست نہ ہوتی، تو وہ کبھی اقتدار نہ چھوڑتا۔ تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے تاریخی عمل ہے اس کا کوئی علاج فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے۔

یحییٰ خان صاحب پتہ نہیں رات کو سوئے یا نہیں سوئے۔ لیکن چار بجے اپنے صرف انڈر ویئر میں باہر نکل آئے۔ نشے میں بالکل دھت تھے۔ انہوں نے حکم دیا۔ گاڑی تیار کرو۔ میں اسی وقت راولپنڈی جاؤں گا۔ متعلقہ سٹاف کے لوگ بیچارے بڑے پریشان ہوئے انہوں نے کہا جی ابھی گاڑی منگواتے ہیں۔ انہوں نے ایس ایس پی کو فون کیا۔ ایس ایس پی نے ڈی آئی جی کو فون کیا کہ پریذیڈنٹ صاحب تو راولپنڈی جانے کے لیے تیار ہیں اور برآمدے میں آدھے ننگے کھڑے ہیں۔ یحییٰ خان صاحب کے کمرے میں ایک محترمہ تھیں انہوں نے تھوڑا تھوڑا دروازہ کھول کے انہیں واپس بلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح تھے۔ پتہ نہیں وہ اس محترمہ سے کس بات پر ناراض ہو گئے تھے۔

یحییٰ خان کے گھر کی کوئی محترمہ وہاں نہیں آئی تھیں ابھی تو اس گھر کی اوپننگ (افتتاحی تقریب) ہو رہی تھی۔

اس محترمہ نے کوشش کی لیکن جناب جنرل صاحب بضد تھے کہ میں اسی وقت جاؤں گا۔ پھر یحییٰ خان صاحب کی ایک اور منظور نظر کو فون کیا گیا وہ آئیں اور بڑی منت سماجت کر کے ان کو اندر لے گئیں اس طرح سے کرائسس (بحران) جو تھا وہ ختم ہوا۔ ایسٹ پاکستان کا کرائسس تو کوئی کرائسس

نہیں تھا اصل کرائسس یہ تھا کہ یحییٰ خان کو ننگا دھڑنگا کس طرح سے اندر لے جایا جائے تو وہ کرائسس بڑی مشکل سے بہرحال ٹل گیا۔ منانے والی کسی کرنل کی بیوی تھی۔

ویسے تو ان کے بے شمار قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب ایک دفعہ نیپال دورے پر گئے جہاز میں انہوں نے اتنی پی لی کہ چل نہیں سکتے تھے۔ کوئی گھنٹہ، پون گھنٹہ جہاز فضا میں ہی گھومتا رہا کہ ان کا اتنا نشہ تو اترے کہ چلنے کے قابل ہوں تاکہ جہاز اتارا جائے۔ بہرحال بہت سارے قصے مشہور ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ قصے صحیح ہیں کہ نہیں۔ ذاتی طور پر میرا مشاہدہ وہی ہے جو میں نے لکھا۔

میجر جنرل اکرم فوج میں بڑے انٹیلیکچوئل مشہور ہیں انہوں نے خالد بن ولید پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ایک کتاب انہوں نے ایران کی فتح پر لکھی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتابیں بڑی مستند ہیں بڑی ریسرچ اور محنت کے بعد لکھی گئی ہیں اس وقت جنرل اکرم جی او سی پشاور تھے۔ جب حالات روز بروز بگڑتے ہی جارہے تھے تو مجھے محسوس ہوا کہ 65ء میں تو چائنا (چین) نے ہمارا پورا ساتھ دیا تھا اس وجہ سے ہماری بچت ہوگئی لیکن 71ء میں میں نے محسوس کیا کہ چائنا کی طرف سے ہمیں کسی پکی امداد کی یقین دہانی نہیں۔ یہ صورتحال بڑی سنگین تھی کہ چائنا کی مدد کے بغیر ہم لوگ ویسٹ پاکستان میں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے چنانچہ میں نے جی او سی سے ملاقات کی اور کہا کہ ایسٹ پاکستان میں ملٹری ایکشن کے بعد اور فوجیں بھی وہاں جارہی ہیں اس مسئلے میں انہیں انڈیا کی پوری امداد حاصل ہوگی لیکن ہمارے لیے چائنا کی طرف سے وہ جوش وخروش نہیں ہے جو 65ء میں تھا میں نے کہا اگر چائنا کی طرف سے ہمیں پوری طرح امداد نہیں ملتی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ پاکستان کے لیے بڑے خطرے کی بات ہے تو جنرل اکرم نے یا تو سادگی سے کہا اور یا پھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کی چیز سویلین کو نہیں بتانی چاہیے انہوں نے میز پر مکا مارا اور انگریزی میں کہا: "نہیں، نہیں، چین ہمارے ساتھ سو فیصد ہے"۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اتنے سمجھدار اور سنیئر جنرل کی طرف سے یہ بات آرہی ہے یہ تو اتنی خطرناک صورتحال نہیں، جتنی کہ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے تسلی ہوگئی۔

گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر عین الدین بڑے اچھے آدمی تھے ان کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا ایک دفعہ ہمارے گھر دونوں میاں بیوی آئے ہوئے تھے یہ شائد اکتوبر کی بات ہے انہوں نے کہا پرابلم اس وقت یہ ہے کہ ایسٹ پاکستان میں فوج نے سرحدیں تو محفوظ کرلی ہیں لیکن مکتی باہنی کے داخلے کو نہیں روک سکے۔ نتیجتاً وہ اندر آکے تخریب کاری کرتے ہیں جس سے امن عامہ متاثر ہوتا ہے۔ ویسٹ پاکستان کی پچوایشن یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا پلہ برابر برابر ہے نہ وہ ادھر ایڈوانس کرسکتے ہیں نہ ہم ادھر ایڈوانس کرسکتے ہیں ایسٹ پاکستان میں اگر مکتی باہنی کنٹرول ہو

جائے تو پھر ہمیں وہاں بھی اس لڑائی میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس کیلیے سوچ یہ ہے کہ مزید دو ڈویژن فوج ایسٹ پاکستان بھیجی جائے جو اندرونی صورت حال کو کنٹرول کرے۔" میں نے کہا۔ بریگیڈئر صاحب مجھے انڈیا کی سٹریٹیجی کا کوئی خاص علم تو نہیں لیکن عام شہری کے طور پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر واقعی یہ سوچ ہے کہ دو ڈویژن فوج ویسٹ پاکستان سے بھیجی جائے تو اس سے ویسٹ پاکستان کا نقصان ہو گا اس لیے کہ ایسٹ پاکستان نے تو جانا ہی جانا ہے تو پھر ویسٹ پاکستان سے مزید دو ڈویژن فوج بھیجنا اسے مزید خطرے میں ڈالنا ہے عین الدین صاحب کی بیگم ایک تو فوجی کی بیوی، دوسرے پاکستانی انہیں اس بات پر بڑا غصہ آیا کہنے لگیں بھائی آپ کیوں اتنی مایوس کن بات کرتے ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہاں سب کچھ چلا جائے گا؟ کیوں چلا جائے گا؟ کیا ہم اتنے ہی کمزور ہیں اور کیا یہ جنرل اتنے ہی بیوقوف ہیں ان کو نظر نہیں آتا آپ کو نظر آتا ہے میں نے کہا اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔

لڑائی شروع ہونے کا مجھے ایسے علم ہوا کہ پشاور کے ہوائی اڈہ کے قریب میں گاف کھیل رہا تھا میرا چھوٹا لڑکا واصف بھی ساتھ تھا دیکھا کہ چار چار سیبر جہازوں کا چار سار ٹیر اڑیں۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ انڈیا کی طرف بمباری کرنے جا رہے ہیں۔ میں خوش قسمت تھا کہ میں نے جہاز اڑتے ہوئے دیکھ لیے۔ ورنہ میں نے سنا ہے کہ بنوں میں جو کمانڈر تھے انہیں صبح پتہ چلا کہ جنگ چھڑ گئی ہے اس سلسلے میں دو چار باتیں بتانا چاہتا ہوں۔

پہلی صبح کا واقعہ ہے کہ گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر نے گورنمنٹ ہاؤس میں میٹنگ بلائی۔ ہماری طرف سے اٹیک ہو چکا تھا وہ ڈسکس کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کا اے ڈی سی بھاگا بھاگا داخل ہوا کہا "سر، آپ کو آپریشن روم سے فون آیا ہے" وہ چلے گئے واپس آئے تو بڑے خوش تھے کہنے لگے "جنٹلمین! مبارک ہو پاکستان آرمی سری نگر میں داخل ہونے والی ہے اور انہوں نے فیروز پور بائی پاس کر لیا ہے اور امرتسر کا سقوط ہو چکا ہے۔" انہوں نے کچھ اس قسم کی فنٹاسٹک باتیں بتائیں، کہ سب نے وہاں تالیاں بجائیں اور بڑے خوش کہ ہندوستان کو ہرا دیا میٹنگ برخاست ہو گئی۔ لیکن شام تک کچھ پتہ نہ چلا اگلی صبح پتہ چلا کہ وہاں نہیں پہنچے ہوتے ہوتے تین چار دن کے بعد بالآخر ہماری پھونک نکل گئی۔ اور پھر مکمل شکست سے دوچار ہوئے۔

جس روز لڑائی شروع ہوئی۔ تو میں نے اپنے گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں نقشے لگا کے ایک آپریشن تھیٹر ٹائپ بنا لیا ہوا تھا شفیع اللہ خاں کمانڈنٹ فرنٹیر کانسٹیبلری تھے جسیم الدین ڈی آئی جی تھے ہم لوگ انفارمیشن اکٹھی کر کے نقشوں پر نشان لگا دیتے تھے کہ ہندوستانی کہاں پہنچے، پاکستانی کہاں پہنچے۔

فارن آفس کے مقبول بھٹی صاحب تھے۔ وہ میرے ساتھ لندن میں بھی تعینات رہے تھے ایک وہ اور ایک بریگیڈئر یا کرنل ہوتا تھا وہ ہر روز جنگ کی صورت حال پر اخبارات کو بریف کرتے تھے ہر روز ان کا ایک ہی جملہ ہوتا تھا کہ پاکستان آرمی بعض ٹیکنیکل فائدے حاصل کر رہی ہے پھر جب ہم لوگوں نے سنا کہ شکست ہو رہی ہے تو ہمارے ایک ساتھی کو اس پر بڑا غصہ آیا اس نے کہا ٹیکنیکل فائدے ہیں Testiral حاصل کر رہی ہے۔

❖

سرنڈر

حالات بڑے خراب ہو رہے تھے اس کے بعد خبریں آ گئیں کہ ایسٹ پاکستان میں ہماری افواج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اس پر عوام میں بڑی مایوسی پھیلی کہ بقیہ پاکستان کا کیا بنے گا۔

جس روز ہتھیار ڈالے گئے اسی روز بیگم عین الدین نے مجھے فون کیا ''بھائی صاحب آپ کی زبان بڑی کالی ہے جو کچھ آپ نے کہا تھا سچ کہا تھا۔''

ایسٹ پاکستان فال ہوا تو یحییٰ خان کے خلاف بہت ہی غم و غصہ تھا حالت یہ تھی کہ اگر یحییٰ خان کو لوگوں کے حوالے کیا جاتا تو وہ اس کی تکہ بوٹی کر دیتے خاص طور سے اس لیے کہ اس سارے سانحے میں اس ''شریف'' آدمی کو اپنی عیاشیوں سے کوئی فرصت نہیں تھی۔ پشاور میں بھی لوگوں کو بڑا رنج ہوا۔ پٹھان آپ کو پتہ ہے بڑے مسلمان ہیں اچھے مسلمان ہیں اچھے انسان ہیں خاص طور سے دیہات میں پرانی عورتیں، مرد نماز روزے کے بڑے پابند ہیں۔ وہاں ایک بڑی بی تھیں نماز روزے کی بڑی پابند تھیں ان کو اتنا افسوس ہوا ان کے ایمان کو اتنا دھکا لگا کہ انہوں نے کہا خدا کوئی چیز نہیں اور انہوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی۔

لوگوں کو سارا غصہ یحییٰ خان پر تھا۔ چنانچہ پشاور میں لوگوں نے جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ میں چونکہ انٹیلی جینس میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا میں نے سوچا کہ اگر اس جلوس کو روکنے کی کوشش کی گئی تو اس لحاظ سے بہت برا ہوگا کہ اگر کوئی آدمی مر گیا تو ملک کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اس لیے کہ لوگوں کا غصہ حکومت کے خلاف ہے وہی حکومت اگر ایسٹ پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے بعد ویسٹ پاکستان میں لوگوں کو مارنا شروع کر دے تو پھر باقی ماندہ ملک بھی تباہ ہو جائے گا جلوس کا پروگرام یہ تھا کہ سب سے پہلے یحییٰ خان کے مکان کو آگ لگائی جائے۔ اتفاق سے یحییٰ خان کے بڑے بھائی آغا محمد علی جو اس وقت پولیس میں تھے قابل عزت انسان ہیں۔ وہ یحییٰ خان سے بالکل مختلف تھے۔ وہ اس وقت انٹیلی جینس بیورو

کے ڈائریکٹر تھے۔ میرے افسر تھے چنانچہ میں نے انہیں اسلام آباد رپورٹ بھیجی کہ یہاں کے لوگ بہت غصے میں ہیں جلوس نکلیں گے اور خطرہ ہے کہ وہ جلوس یحییٰ خان کے مکان کو آگ لگائے گا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر اس جلوس کو روکنے کی کوشش کی گئی اس پر سختی کی گئی تو پھر پورے ملک میں آگ لگ جائے گی۔ میری اس رپورٹ پر آغا محمد علی صاحب نے مجھے فون نہیں کیا وہاں ایک ڈپٹی ڈائریکٹر تھے انہوں نے مجھے فون کیا اور پوچھا، آپ نے رپورٹ بھیجی ہے کیا حالات ہیں میں نے کہا ''میں نے تو لکھا ہے کہ جلوس نکلے گا لوگوں میں بڑا غم وغصہ ہے وہ یحییٰ خان کے مکان کو آگ لگانا چاہتے ہیں اگر پولیس نے جلوس کو روکا، تو بڑا خون خرابہ ہوگا اس لیے کہ وہ پولیس سے رکے گا نہیں گولی چلے گی۔ لوگ مریں گے اس کے بعد سارے ملک میں آگ پھیل جائے گی'' اس ڈپٹی ڈائریکٹر نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مکان کو جلنے دیں میں نے کہا یہ چائس تو آپ پر ہے کہ مکان کو جلنے دیں یا پاکستان کو جلنے دیں اس پر وہ صاحب پریشان ہو گئے اور انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ان کا پھر ٹیلی فون آیا، کہ ہم نے گورنمنٹ کو یہی مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ جلوس نکلے تو رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔

ایک سیاسی پارٹی کا بھی ذکر کرتا ہوں وہ جلوس نکلا تو اس میں بہت ہی غم وغصہ تھا لیکن پولیس کو یحییٰ خان کا مکان بچانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اس لیے کہ جماعت اسلامی نے یحییٰ خان کی امداد کر دی اور وہ اس طرح کہ بجائے اس کے کہ جلوس یحییٰ خان کے گھر پہنچتا جماعت اسلامی نے اس کا رخ شراب کی دکانوں کی طرف موڑ دیا۔

جماعت اسلامی والوں نے کہا یحییٰ خان کا قصور نہیں، شراب کا قصور ہے چنانچہ لوگوں نے شراب کی ساری دکانیں ایک ایک کر کے توڑیں۔ یہ ایک عجیب قصہ ہوا کہ جلوس بجائے اس کے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے خلاف ہوتا وہ شراب کے خلاف ہو گیا اس طرح سے وہ سارا دن شراب کی دکانیں توڑتے رہے بوتلیں پیتے بھی رہے بوتلیں توڑتے بھی رہے یہاں تک کہ پشاور کے کتے بھی مدہوش ہو گئے۔

آخر کار جب جلوس یحییٰ خان کے مکان پر پہنچا اس کا غصہ کافی حد تک ٹھنڈا ہو چکا تھا پھر بھی انہوں نے اس کے سارے ائر کنڈیشنز توڑ دیئے قالینوں کو باہر لا کر آگ لگا دی اتفاق سے میرے پاس اس وقت کیمرہ تھا میں نے تصویریں لیں اس لیے کہ میرا مکان بالکل سامنے تھا۔

عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی ہر ڈکٹیٹر کے ساتھ ہوتی ہے خاص طور پر فوجی ڈکٹیٹر کے ساتھ اور ہمیشہ ہر ڈکٹیٹر کو جماعت اسلامی کی امداد حاصل ہوتی ہے یحییٰ خان کے متعلق جب کہ اس کا وزیر قانون (جسٹس کارنیلئس) عیسائی تھا میاں طفیل محمد نے کہا تھا اصلی اسلامی آئین تو یحییٰ خان ہی دے گا

مطلب یہ کہ ان کی ساری سیاست ہمیشہ یہی رہی ہے کہ انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر کی ہر طرح سے امداد کرنی ہے۔

ایوب خان کے سلسلے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت ان کی کیا پالیسی تھی یا کیا حالات تھے اس کا تجزیہ کوئی اور ہی کر سکتا ہے میں تو صرف یحییٰ خان اور موجودہ حالات کا تجزیہ کر سکتا ہوں ان دوادوار میں آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح سے جمہوریت کا خون ہوا جس طرح سے قانون کی بے حرمتی ہوئی لیکن جماعت اسلامی ان دونوں ادوار میں حکومت کا پوری طرح سے ساتھ دیتی رہی۔

جماعت اسلامی والے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے لیڈر کو کسی طرح سے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس کے برعکس یحییٰ خان جیسا ڈکٹیٹر جو ایک پاکستان کے دو حصے کرنے کا ذمہ دار تھا وہ انہیں منظور تھا بھٹو صاحب منظور نہیں تھے۔ بغض معاویہ زیادہ تھا اس سلسلے میں مجھے روزنامہ مساوات کا کارٹون یاد ہے دوسرے منو بھائی کا کالم آپ کو یاد ہوگا کہ جب پاکستان کی حالت بڑی خراب ہوگئی تھی بھٹو صاحب نے کہا تھا فوج بارڈر پر چلی جائے اور اقتدار سویلین کے حوالے کیا جائے۔

اس وقت میاں طفیل محمد نے کہا تھا کہ یہ کوئی موقع نہیں ہے کہ فوج اقتدار سویلین کے حوالے کردے اس طرح کی لڑائی میں تو فوج کی خاص طور سے ضرورت ہے اس پر منو بھائی نے لکھا تھا اگر فوجی بارڈر پر لڑائی کرنے کی بجائے حکومت چلائیں گے تو توپ کیا میاں طفیل محمد چلائیں گے؟ دوسرے جب ایسٹ پاکستان کا المیہ رونما ہو گیا تو ایک کارٹون آیا تھا جس میں یحییٰ خان بڑا وحشی انسان دکھایا گیا تھا اس نے جانور کی کھال پہنی ہوئی ہے۔ ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا پتھر کے زمانے کا انسان نظر آ رہا تھا۔ شعر درج تھا:

آؤ بچو شکل دکھائیں تم کو یحییٰ خان کی
جس کی خاطر ہم نے دی قربانی پاکستان کی

پاکستان توڑنے کا کون ذمہ دار تھا جو ملک کا کاروبار چلا رہا تھا مثلاً آپ اپنا کاروبار چلاتے ہیں یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ کس کا مشورہ مانیں کس کو اپنا ملازم رکھیں اور اس ملازم کو کس حد تک اختیار دیں اگر فرض کریں کہ آپ کا کاروبار نا کام ہوتا ہے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے فلاں آدمی نے غلط مشورہ دیا تھا اگر اس آدمی کے مشورے سے آپ غلط چلے تو آپ اس کے اہل نہیں کہ اپنا کاروبار چلا سکتے مطلب یہ کہ بھٹو صاحب نہ یحییٰ خان کے وزیر تھے نہ ان کے مشیر تھے ملک کے سیاہ و سپید کے مالک یحییٰ خان تھے۔ انہوں نے ایوب خان سے اقتدار سنبھالا تھا۔ انہوں نے ذمہ لیا تھا کہ ملک کی حفاظت کریں گے اس کی

سلامتی کے ذمہ دار ہوں گے' ان کے جو مشیر تھے وہ سارے کے سارے جرنیل تھے ان میں کوئی بھی سیاسی آدمی نہیں تھا اور اس ملک کی زندگی اور بقا کے ساتھ کھیل رہے تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح اقتدار سے چمٹے رہیں اور ان کی عیاشیاں اور بے ایمانیاں چلتی رہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یحییٰ خان کا دور انتہائی غیر سنجیدہ دور تھا۔ وہ ہر چیز کو مذاق کے طور پر لیتے تھے مثلاً اسی سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے 303 افسر نکالے' 303 اس لیے کہ فوج کی بندوق تھری ناٹ تھری (303) ہوتی ہے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا ان کے کیریئر سے کھیلنا اور اسے 303 کا نام دے دینا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو پہلے الیکشن کا شیڈول بنایا وہ نو مہینے کا تھا۔ یہ ایک اتفاق نہیں بلکہ اس زمانے میں وہ محفلوں میں باقاعدہ ہنسی مذاق کرتے تھے کہ نو مہینے کے بعد الیکشن کا شیڈول اس لیے ہے کہ نو ماہ کے بعد بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ وہ ایک نہایت غیر سنجیدہ ماحول تھا' نہایت غیر سنجیدگی سے انہوں نے حکومت کا کاروبار چلایا اس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا رانی کو جنرل کا خطاب دے دینا اس کی ادنیٰ مثال ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کسی قسم کے غیر سنجیدہ لوگ ملک کا کاروبار اور امور سلطنت چلاتے رہے کہ ایک عورت جس کا امور سلطنت میں عمل دخل تھا اسے جنرل بنا دیا۔ جہاں جنرل حمید تھے جنرل پیرزادہ تھے جنرل عمر تھے وہاں جنرل رانی بھی تھیں۔

پھر اس دور میں ہمیں اتنی بڑی شکست ہوئی کہ کسی اسلامی ملک کو نہیں ہوئی اور جو شکست کے ذمہ دار تھے وہ یہ بوجھ کسی اور کے سر پر رکھنا چاہتے تھے اور یہ کام بڑا آسان تھا' کہ جی بھٹو صاحب نے یہ کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ بھٹو صاحب اس وقت صدر نہیں تھے۔ وزیراعظم نہیں تھے' چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے' ایسٹ پاکستان کے گورنر نہیں تھے اگر یحییٰ خان نے بھٹو کے کہنے پر پاکستان کو توڑ دیا تو یہ نااہلی یحییٰ خان کی ہے یہ تاریخ کا اتنا بڑا سانحہ ہوا ہے کہ جب بھی اس ملک کی تاریخ لکھی جائے گی اس کی ذمہ داری یحییٰ خان اور اس کے ٹولے پر جائے گی' ہاں' اگر یحییٰ خان الیکشن کے بعد حکومت سیاستدانوں کے حوالے کر دیتا کہ تم جانو اور پاکستان جانے تو پھر جو کچھ ہوتا اس کے ذمہ تو نہ ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کی تباہی کے بیج یحییٰ خان نے اسی دن بو دیئے تھے جب اس نے ون یونٹ توڑا۔ ایسٹ اور ویسٹ پاکستان میں پیریٹی ختم کی اور مجیب کے چھ نکات کے متعلق وہ خاموش رہا۔ ان چھ نکات سے وہ لوگ یہ خواب دیکھنے لگے کہ اگر پوری طرح آزاد نہ بھی ہوئے تو مکمل خودمختاری ضرور مل جائے گی۔ یہ تو بھٹو صاحب کے مشورے سے نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو بھٹو صاحب یحییٰ خان کے اقتدار سے دور تھے۔

سیاسی لوگوں میں یحییٰ خان کے مشیر تھے شریف الدین پیرزادہ ولی خان' اے کے بروہی وغیرہ یہ پروپیگنڈہ جان بوجھ کے کیا جاتا ہے کہ ایسٹ پاکستان کی تباہی کے ذمہ دار بھٹو صاحب تھے۔ جنہوں

نے پولینڈ کی قرارداد مسترد کی۔

اگر یحییٰ خان یہاں سے کہہ دیتے کہ ہم اس قرارداد کو مانتے ہیں تو بھٹو صاحب وہاں کیا کر سکتے تھے سوال یہ ہے کہ وہ قرارداد ان کو بھی تو یہاں معلوم تھی۔ یہاں سے یہ بھٹو صاحب کو ہدایات بھیجتے تھے۔ فرض کیا بھٹو صاحب جان بوجھ کر یہ قرارداد نہیں مان رہے تھے تو یہاں سے ایک بیان دے دیتے۔ اعلان کر دیتے کہ ہم اس قرارداد کو تسلیم کرتے ہیں تو بھٹو کیا کر سکتے تھے۔

لیکن یہ صبح سے لے کر شام تک شراب کے نشے میں دھت رہتے تھے۔ اب کہتے ہیں کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔ اہلیت نہ ہو تو کہتے ہیں کہ کسی اور کی وجہ سے یہ ہوا۔ اصل میں یہ بڑی پرانی تھیوری ہے کہ بادشاہ خراب نہیں بادشاہ کے مشیر خراب ہیں۔ سوال یہ ہے وہ مشیر کس نے رکھے ہیں اگر وہ صحیح مشیر نہیں رکھ سکتا تو وہ بادشاہ اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ صرف یحییٰ خان پر نہیں آپ اس کو ہر حکمران پر منطبق کر سکتے ہیں' میں اسے بھٹو صاحب پر بھی لاگو کروں گا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسعود محمود بڑا خراب آدمی تھا سعید احمد خاں بڑا خراب آدمی تھا یا بھٹو صاحب کے مشیر خراب آدمی تھے سوال یہ ہے کہ ذمہ داری تو اس کی بھٹو صاحب پر آتی ہے' ان کو بری الذمہ کرنا عقلمندی یا ایمانداری کی بات نہیں' سربراہ مملکت کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ اچھے مشیر رکھتے' اتفاق سے کوئی مشیر رکھ بھی لیا تھا تو جب اس کی خرابیوں کا پتہ چلا اس اس کو علیحدہ کرتے۔ اچھا صاحب اقتدار اچھے مشیر رکھتا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے یہ اس کے اپنے فائدے میں ہے ورنہ اس کا نقصان ملک کو بھی ہوتا ہے اور اسے بھی۔

ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں' میں ذہنی طور پر شروع سے ہی قائل رہا ہوں کہ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی اقتدار چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ آئے ہی اس نیت سے تھے کہ اقتدار چھوڑیں گے نہیں' ان کی ساری حکمت عملی اس نہج پر چلی کہ انہوں نے اقتدار بالکل نہیں چھوڑنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک دو ٹکڑے ہو گیا' ملک ٹوٹنے کے باوجود یحییٰ خان کا اقتدار چھوڑنے کا ارادہ نہیں تھا شکست کے باوجود پریذیڈنٹ ہاؤس میں یہ ٹسل چل رہی تھی' کہ اقتدار چھوڑا جائے یا نہ چھوڑا جائے' جب جنرل ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ ایک ہندوستانی مبصر نے لکھا تھا کہ جب تک پاکستانی فوج کو میدان جنگ میں شرمناک شکست نہیں ہو گی وہ اقتدار نہیں چھوڑے گی لیکن یحییٰ خان نے میدان جنگ میں شکست کھانے کے باوجود بڑی مشکل سے اقتدار چھوڑا بلکہ جب ایسٹ پاکستان جا رہا تھا یحییٰ خان نے اپنے اردگرد کے دو چار آدمیوں سے نیا آئین بنانے کو کہا۔

ایک تو ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو این اے رضوی تھے' انہیں کہا گیا کہ تم آئین بناؤ دوسرے ڈی آئی جی راولپنڈی عباس مرزا مرحوم تھے۔ ان کے سپرد بھی یہ کام کیا گیا تھا کہ تم بھی آئین بناؤ۔ اس

آئین میں سب سے اہم شق یہ تھی کہ یحییٰ خان ساری عمر صدر رہیں گے اور یہ کہ اگر کسی مسئلے پر یحییٰ خان وزیراعظم کو حکم دیں گے تو وہ اسے ماننا پڑے گا مثلاً انہوں نے رانی کو کسی مل کا پرمٹ دینا ہے تو وہ خاص حکم دیں گے اور وہ وزیراعظم کو ماننا پڑے گا یا نور جہاں کو کوئی سینما الاٹ کرنا ہے تو صدر صاحب اگر حکم دیں گے تو وہ وزیراعظم کو ماننا پڑے گا۔

چنانچہ جب شکست ہوگئی اور ایسٹ پاکستان میں فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تو اس کے بعد آپ کو یاد ہوگا کہ یحییٰ خان کا اعلان آیا کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو پر آج قوم سے خطاب کریں گے اس تقریر میں ان کا پروگرام وہ آئین اناؤنس کرنے کا تھا جس میں وہ تاحیات صدر ہوں گے اس شرمناک شکست کے باوجود صدر رہنے کی ان کی خواہش کسی طرح کم نہ ہوئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے' کہ اس ماحول سے الگ رہ کر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں ان کے مشیر اس جدوجہد میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح یہ صدر رہ جائیں۔

اس مسئلے پر فوج میں کشمکش چل پڑی۔ یحییٰ خان سے انہوں نے کہا کہ تم کس صدارت کے خواب دیکھ رہے ہو تمہیں تو لوگ زندہ نہیں چھوڑیں گے اس پر انہوں نے کہا اگر مجھے فوج کی سپورٹ ہے تو مجھے کوئی نہیں ہٹا سکتا اور یہ ٹیسٹ کرنے کے لیے انہوں نے جنرل حمید کو جی ایچ کیو بھیجا کہ آفیسرز کو ایڈریس کرو اور دیکھو کیا ماحول ہے چنانچہ جنرل حمید جی ایچ کیو گئے نوجوان افسر اتنے مشتعل تھے' کہ جنرل حمید کو مار پڑتے پڑتے رہی' نوجوان افسر سمجھتے تھے کہ پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے اور فوج کو شرمناک شکست سے دوچار کرنے والے یہی جرنیل ذمے دار ہیں چنانچہ جنرل حمید بڑی مشکل سے اپنی عزت بچا کے وہاں سے بھاگے اور انہوں نے جا کے یحییٰ خان سے کہا کہ اب تو اسی میں خیریت ہے کہ اقتدار کسی کے حوالے کرو اور چلتے بنو چنانچہ وہ طوعاً و کرہاً اس کے لیے تیار ہوئے کہ یہ مصیبت بھٹو کے گلے میں ڈال دی جائے۔

بھٹو صاحب کو بلاوا چلا گیا تھا وہ امریکہ سے چل پڑے تھے ابھی یہاں نہیں پہنچے تھے' اس وقت بھی یحییٰ خان خان کو یہ امید تھی کہ شاید ایک دو فیصد چانس ہو کہ میں صدر رہ جاؤں وہ اس طرح کہ یحییٰ خان کے سارے مشیر افسروں کو جو میٹنگ ہوتی تھی اس میں یحییٰ خان کی دلجوئی کرتے تھے ہماری ایک میٹنگ میں این اے رضوی آئے اور وہ یحییٰ خان سے مل کے آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ صدر صاحب کہتے ہیں ٹھیک ہے بھٹو آ جائے میں اس سے پوچھوں گا اگر وہ مجھے صدر رکھنا چاہتا ہے تو میں صدر رہ جاؤں گا' ورنہ اپنے گھر چلا جاؤں گا اس وقت بھی ان کا خیال یہ تھا کہ ٹھیک ہے بھٹو سیاستدان ہے۔ ویسٹ پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی کا نمائندہ ہے۔ وہ وزیراعظم ہو جائے گا صدارت کے لیے اسے کسی نہ کسی کی ضرورت ہوگی تو مجھ میں کیا خرابی ہے۔

اس کے بعد جو حالات ہوئے وہ آپ جانتے ہیں لیکن اس سارے تجزیے کا مطلب یہ ہے کہ یحییٰ خان نے جو تاثر دیا کہ وہ سیاستدان نہیں اور نہ وہ سیاستدان بننا چاہتے ہیں وہ الیکشن کرا کے چلے جائیں گے یہ سارے کا سارا ڈرامہ تھا اور ایک خاص حکمت عملی کا حصہ تھا ہر ڈکٹیٹر' خاص طور پر جو ایجی ٹیشن کے بعد آتا ہے اس کو الیکشن کا اعلان کرنا پڑتا ہے ورنہ ایجی ٹیشن ختم نہیں ہوتا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا اس کے آنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

❖

بھٹو

جس وقت بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا اس وقت وہ جنرل یحییٰ خان' جنرل حمید اور ان کے دس یا بیس یا پچاس ساتھیوں کا کورٹ مارشل کرا کے گولی مروا دیتے تو کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہوتا بلکہ عوام ان کا ساتھ دیتے اور ہر کوئی بھٹو صاحب کی تعریف کرتا کیونکہ عوام میں یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں کے خلاف سخت نفرت تھی کہ ان لوگوں کی عیاشیوں کی وجہ سے فوج کو اور ملک کو یہ دن دیکھنا پڑے۔ ان کو اس کی سزا ملنی چاہیے تھی ادھر ایسٹ پاکستان میں ہمارے پاکستانیوں کا خون بہہ رہا تھا اور ادھر ایوان صدر میں شراب بہہ رہی تھی۔ یہ باتیں باہر نکل چکی تھیں اس وقت حالت یہ تھی کہ فوجی افسران وردی پہن کے شہروں میں نکل نہیں سکتے تھے اس لیے بھٹو صاحب کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ جو لوگ شکست کے ذمہ دار ہیں ان کا کورٹ مارشل کرا دیتے ان کو پھانسی پر لٹکا دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ذمہ دار افراد کو سزا ملتی تو بہت ساری بعد کی خرابیاں نہ ہو پاتیں۔ سوال ہے کہ بھٹو صاحب نے یحییٰ خان پر مقدمہ کیوں نہ چلایا۔ دیکھیے' شیخ مجیب الرحمٰن اس بات پر بضد تھا کہ جو پاکستانی جرنیل انڈیا کی قید میں ہیں ان پر مقدمہ چلایا جائے گا اور پاکستان کا سٹینڈ یہ تھا کہ آپ ان پر مقدمہ نہیں چلا سکتے وہ جنگی مجرم نہیں ہیں اگر بھٹو صاحب یحییٰ خان پر مقدمہ چلاتے تو بین الاقوامی طور سے پاکستان کا سٹینڈ کمزور ہو جاتا کہ جب دوسرے ملک کو آپ کہتے ہیں کہ وہ مقدمہ نہیں چلا سکتا تو پھر آپ خود مقدمہ کیوں چلا رہے ہیں مطلب یہ کہ یحییٰ خان خاں جنرل حمید اور ان کے دس بارہ ساتھیوں کو پھانسی دے دینے سے فائدہ تو ہوتا' لیکن اس کے نتائج سنگین ہوتے۔

بھٹو صاحب نے آتے ہی این اے رضوی اور آغا محمد علی کو ہٹا دیا میاں انور علی جو ایوب خان کے زمانے میں آئی جی ہوتے تھے اب ریٹائر تھے' انہیں بلا کے انٹیلی جینس کا چارج دیا اور سب سے پہلی جو ہدایت ان کو دی وہ یہ تھی کہ پتہ کرو ایسٹ پاکستان کا المیہ کس طرح سے ہوا۔ آپ اس کی انکوائری کریں

یہ کوئی سازش تو نہیں تھی اگر بھٹو صاحب اس سازش میں شریک ہوتے تو کیا وہ میاں انور علی کو پہلا حکم یہ دیتے کہ تم پتہ کرو ایسٹ پاکستان کی علیحدگی میں کوئی سازش تو نہیں بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ شائد کسی اور ملک کے ایما پر یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا ہے اور جرنیل دانستہ طور سے یا نادانستہ طور سے اس ملک کے آلہ کار بنے ہیں جس سے ملک اس سچوایشن میں پھنسا جو ایسٹ پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی پھر بھٹو صاحب نے حمود الرحمٰن کمشن بھی بٹھایا' میرے علم میں جو بات ہے اس کے مطابق حمود الرحمٰن کمشن کے دائرہ اختیار میں یہ تھا کہ اس امر کی مکمل طور سے تحقیق کی جائے کہ کونسا عنصر تھا اور کون لوگ تھے جو ایسٹ پاکستان میں شکست کے ذمہ دار تھے۔

یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ جو چیز بھی ہو بھٹو صاحب کے سر تھونپ دی جائے۔ اس حکومت نے ایک ایک پرزہ بھی جو بھٹو صاحب کے خلاف مل سکتا تھا۔ وائٹ پیپر میں چھاپ دیا اگر حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ بھٹو صاحب کے خلاف ہوتی یا ان پر کوئی الزام آتا تو میرا خیال ہے کہ یہ حکومت سب سے پہلے اس رپورٹ کو چھاپتی یا وہ ہی حصہ نکال کے ضرور چھاپتی۔ آخر انہوں نے وائٹ پیپر کے لیے انٹیلی جینس فائلوں کا ایک ایک صفحہ چھان مارا تھا۔ حمود رپورٹ تو ان بداعمالیوں سے بھری پڑی ہے جس کی وجہ سے پاکستان کو شکست ہوئی پھر یہ کہ اس کے چھپنے سے ہمارے بہت سارے بین الاقوامی تعلقات کو ضرب لگتی تو یہ بھٹو صاحب کا ایک نیشنلسٹ اور ایک محب وطن ہونے کی حیثیت سے اس ملک پر اور فوج پر بڑا احسان تھا کہ انہوں نے بار بار مطالبات کے باوجود یہ رپورٹ شائع نہ کی۔

آخری چند روز مجیب الرحمٰن سہالہ میں تھا بھٹو صاحب اس کے پاس جاتے رہے ان کے درمیان جو بات چیت ہوتی رہی' اس کے ٹیپ موجود ہیں' بھٹو صاحب مجیب الرحمٰن کی آخری وقت تک منت سماجت کرتے رہے کہ ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان کے درمیان کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رہنا چاہیے اور مجیب' بھٹو صاحب سے وعدہ کرتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں کوشش کروں گا میں قید میں ہوں مجھے وہاں کے حالات کا پتہ نہیں لیکن اگر میں کر سکا تو کوشش کروں گا کہ ایسٹ اور ویسٹ پاکستان کے درمیان کوئی نہ کوئی' باریک سا رشتہ بھی نکل آئے۔ بھٹو صاحب اسے بار بار یہی اصرار کرتے رہے کہ جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا اب تم کوئی نہ کوئی رشتہ پیدا کرو۔ بلکہ بھٹو صاحب نے کہا کہ شاہ آف ایران آ رہے ہیں تم ان سے ملو' مجیب نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں ان سے نہیں ملوں گا بلکہ اس نے درخواست کی کہ مجھے ان کے آنے سے پہلے ہی بھجوا دیا جائے۔ بھٹو صاحب کا خیال کہ شاہ آف ایران کو اس سلسلہ میں استعمال کریں۔

یہی تو ایک ٹریجڈی ہے اس ملک میں عوام جو ہیں غریب جو ہیں مزدور جو ہیں وہ تو بھٹو

صاحب کے حامی ہیں جو وائٹ کالر ہیں جنہیں آپ شرفا کہہ سکتے ہیں وہ بھٹو صاحب کے خلاف رہے ہیں اب بھی ہیں حالانکہ ان کی شہادت کے بعد ذہنوں میں کافی تبدیلی آ گئی ہے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ ان کے خلاف ہیں اور خلاف اس لیے ہیں کہ بھٹو صاحب کے خلاف لگا تار اور مسلسل پروپیگنڈے ہوتے رہے ہیں کہتے ہیں ناں جھوٹ اگر سو دفعہ بولا جائے تو وہ سچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بعض عناصر ہیں جنہوں نے ان کے خلاف متواتر پروپیگنڈا کیا ہے یہ میں نہیں کہتا کہ بھٹو صاحب عیب سے خالی تھے۔ انہوں نے غلطیاں کی ہیں ان غلطیوں کی وجہ سے آخر کار انہیں جان بھی دینا پڑی لیکن بہت سے ایسے الزامات ان پر دھرے جاتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ وقت آئے گا تو پتہ چلے گا کہ ان الزامات کی کوئی بنیاد نہیں۔

71ء کی جنگ کے دوران جب بھٹو صاحب یو این گئے تو وہ پشاور اور کابل کے راستے گئے تھے جب وہ پاکستان واپس آ رہے تھے تو ہمیں یہ اطلاع ملی کہ وہ اسی راستے سے واپس آئیں گے اس کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ جب وہ آئیں گے انہیں گرفتار کر لیا جائے گا اس کے بعد پتہ چلا کہ یحییٰ خان ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر فرمائیں گے پھر انہوں نے تقریر کینسل کر دی۔ اس کے بعد اور بھٹو صاحب کے پہنچنے سے پہلے اسلام آباد ہیڈ آفس سے مجھے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر کا ٹیلی فون آیا کہ بھٹو صاحب نیویارک سے آ رہے ہیں ان کے متعلق جو بھی کاغذات اور Tapes (ٹیپیں) ہیں وہ تمام جلا دیں۔ میں نے کہا یہ کس نے حکم دیا ہے اس وقت ہمارے ہیڈ آفس کی پوزیشن یہ تھی کہ آغا محمد علی نے چارج لے لیا تھا لیکن ان کے پیش رو این اے رضوی جو ان کے بہت دوست تھے اور یحییٰ خان سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ رضوی صاحب کا ایوب خان کے زوال میں اور یحییٰ خان کو انتقال اقتدار میں بڑا حصہ تھا۔ آغا محمد علی بیچارہ سیدھا سادا افسر تھا۔ کوئی زیادہ عقل نہیں تھی ان کو خود بھی اس بات کا احساس تھا اور ان کو ڈائریکٹر بننے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ آغا محمد علی نے این اے رضوی سے چارج تو لے لیا تھا لیکن ابھی تک وہ ان کے انڈر سٹڈی تھے۔ ایک طرح سے دو عملی چل رہی تھی تو جب مجھے ہیڈ آفس سے ڈپٹی ڈائریکٹر کا فون آیا کہ بھٹو صاحب کے متعلق جو بھی کاغذات اور ٹیپس ہیں وہ تمام جلا دیں میں نے ان سے پوچھا یہ کس کا حکم ہے تو انہوں نے بتایا کہ دونوں صاحبان کا میں تو غصے سے بھرا ہوا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ ایسٹ پاکستان میں ہماری شکست کے ذمہ دار یحییٰ خان بھی ہیں اور بڑی حد تک ان کے مشیر این اے رضوی وغیرہ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ آغا محمد علی بیچارے تو اس گنتی میں نہیں تھے چنانچہ میں غصے سے بھرا ہوا تھا میں نے اس ڈپٹی ڈائریکٹر سے کہا: ''ان حرامزادوں کو بتا دو کہ انہوں نے ملک کو تباہ کیا ہے اور اب وہ اپنی حماقتوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔'' وہ ڈپٹی ڈائریکٹر بیچارہ گھبرا گیا میں نے اسے کہا ''میں ٹیلی فون پر کوئی حکم نہیں مانوں گا'

آپ مجھے لکھ کر بھیجیں۔" اس نے کہا "نہیں نہیں یہ تو لکھ کے نہیں بھیج سکتے۔" پھر میں نے اس کو گالی دی "تم...... تمہیں شرم نہیں آتی کہ ٹیلی فون پر حکم بھیجتے ہو۔" اگر وہ لکھ کے بھیجتے میں تب بھی اس پر عمل نہ کرتا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ بیس دسمبر 71ء کو بھٹو صاحب نے حلف اٹھایا۔ میں اکیس کی شب سویا ہوا تھا کہ فرنٹیئر کے ہوم سیکرٹری مسعود الرؤف کا مجھے فون آیا: "راؤ صاحب' میں مسعود الرؤف بول رہا ہوں۔ مجھے گورنمنٹ کی طرف سے حکم ملا ہے کہ آپ کا دفتر سیل کر دوں۔ میرے ساتھ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی ہیں' میں صرف اطلاع دے رہا ہوں کہ میں آپ کا دفتر سیل کر رہا ہوں۔ مجھے غصہ آیا کہ یہ کیا واہیات بات ہے کہ دفتر انٹیلی جینس کا ہے اور اسے ایک صوبائی ہوم سیکرٹری آ کے سیل کر رہا ہے میں نے کہا ٹھیک ہے اگر گورنمنٹ کا حکم ہے آپ سیل کر دیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سیل کیوں ہو رہا ہے۔ اگلے روز جب میرے باقی افسران دفتر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پولیس گارد کھڑی ہے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ وہ سب میرے گھر پر آ گئے کہ صاحب کیا قصہ ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ قصہ ہے وہ کہنے لگے ہم کیا کریں میں نے کہا اس شخص کے پاس جائیں اور پوچھیں کیا کرنا ہے لیکن میں دفتر نہیں جاؤں گا گورنمنٹ کا دفتر ہے گورنمنٹ بند کر رہی ہے ٹھیک ہے میں نے اپنا گاف کٹ لیا؛ ور گاف کھیلنے چلا گیا۔

اس کے بعد مجھے راولپنڈی بلایا گیا وہاں آغا محمد علی اور این اے رضوی کو نظر بند کیا ہوا تھا اور بھٹو صاحب نے میاں انور علی صاحب کو بلا کے انٹیلی جینس بیورو کا چارج دے دیا تھا کیونکہ وہاں بھٹو صاحب اپنے اعتماد کا آدمی لگانا چاہتے تھے جب بھٹو صاحب ایوب خان کی حکومت میں منسٹر تھے تو میاں صاحب انٹیلی جینس بیورو کے ڈائریکٹر رہے تھے دونوں کی پرانی واقفیت تھی بھٹو صاحب میاں صاحب کو ذمہ دار انٹیلی جینس افسر سمجھتے تھے۔ وہاں ہیڈ کوارٹر میں ہمارے ایک سینئر موسٹ افسر تھے ارباب مختار' میاں انور علی کے آنے سے پہلے دو ایک روز انہوں نے چارج سنبھالے رکھا تھا۔ ان سے میں نے پوچھا کیا قصہ ہے یہ دفتر کیوں سیل ہوئے۔ انہوں نے کہا "سب کچھ تم کراتے ہو پھر ہم سے پوچھتے ہو' کیا قصہ ہے آپ نے ٹیلی فون پر گالی والی سنائی تھی اس سے پتہ چلا کہ ہم ریکارڈ جلا رہے ہیں' بھٹو صاحب نے فوری طور پر کہا پیشتر اس کے کہ کوئی ریکارڈ کو نقصان پہنچائے دفاتر فوری طور پر سیل کر دو۔" پھر انہوں نے میاں انور علی صاحب کو انکوائری پر لگایا کہ پتہ کرو کہاں کہاں انہوں نے ریکارڈ جلایا' چنانچہ لاہور میں اور دو ایک جگہ انہوں نے ریکارڈ جلایا تھا۔ یہ جو اپر مال پر دفتر ہے وہاں بھی جلایا تھا۔ اصل میں یہ بھٹو صاحب کے خلاف جو رپورٹیں لکھتے رہے اور ان کے ٹیلی فون ٹیپ کرتے رہے ان کیخلاف جو یہ سازشیں کرتے رہے کہ کسی طرح وہ اقتدار میں نہ آئیں اصل میں یہ ریکارڈ وہ جلانا چاہتے تھے تاکہ بھٹو صاحب کو پتہ نہ چلے کہ یحیٰی خان ان کے خلاف کیا کارروائیاں کرتا رہا۔ یہ تھا اس کا مقصد۔

رضوی صاحب نے بھٹو کے آنے سے پہلے یہ حکم دیا تھا اوران کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے ریکارڈ جلانا شروع کر دیا تھا۔اب دیکھیں ناں کس طرح سے لوگ تاریخ کو مسخ کرتے ہیں ریکارڈ کا جلایا جانا بھٹو صاحب کے خلاف قدم تھا۔ان کے خلاف ایک سازش تھی ان کو دھوکہ دینا مقصود تھا تا کہ جو افسران بھٹو صاحب کے خلاف سازشیں کرتے رہے تھے اور جو سازشیں اس وقت کے حکمران کرتے رہے تھے وہ کسی طرح سے بھٹو صاحب کے نوٹس میں نہ آئیں۔ باقی سب نے تو جلانا شروع کر دیا لیکن میں اڑ گیا' ٹیلی فون پر گالی گلوچ ہوا اس سے بات بھٹو صاحب کے نوٹس میں آئی پھر انہوں نے فوری طور پر یہ دفاتر سیل کرنے کا حکم دیا تا کہ ریکارڈ نہ جلا سکیں۔

اس وقت مجھے پتہ نہیں چلا' بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بات بھٹو صاحب تک کیسے پہنچی' حیات محمد خاں شیر پاؤ سرحد پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے۔مرحوم بہت ہی اچھے انسان تھے۔اس زمانے میں بڑے ایکٹو تھے۔ پیپلز پارٹی چونکہ اقتدار میں آنے والی تھی۔شیر پاؤ صاحب نے اپنی طرف سے ہر جگہ اپنے آدمی رکھوا دیئے۔ مثلاً ٹیلی فون ایکسچینج وغیرہ میں بھی تو پنڈی سے میری جو باتیں ہوئیں مجھے تو علم نہیں تھا کہ کوئی آدمی سن رہا ہے بعد میں پتہ چلا کہ آئی ایس آئی اس وقت ہماری گفتگو ٹیپ کر رہی تھی تو جیسے ہی بھٹو صاحب نے حلف اٹھایا فوراً شیر پاؤ نے انہیں اطلاع دیدی کہ یہ ریکارڈ جلا رہے ہیں۔

رضوی صاحب کو اس بات میں کوئی بے اصولی نہیں نظر آئی کہ یہ غلط قدم ہے یا غلط بات ہے بلکہ انہوں نے کہا کہ جب انگریز جا رہے تھے تو ہم نے بوریاں بھر بھر کے ریکارڈ جلایا تھا۔مطلب یہ ہے کہ یہ اس ذہن کی پیداوار ہیں کہ ہر حکمران چاہے وہ سکھ ہو چاہے وہ انگریز ہو اس کا حکم مانتے ہیں۔اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ جب انگریز جا رہے تھے تو ہندو یہ کوشش کر رہے تھے کہ جو بھی چیزیں وہ بچا سکتے ہیں بچا لیں ہمارے افسران کا حال یہ تھا کہ وہ بڑے فخر سے کہہ رہے تھے کہ جب انگریز جا رہے تھے تو ہم نے بوریاں بھر بھر کے ریکارڈ جلایا۔ پھر اسی اندازِ فکر کو انہوں نے قائم رکھا کہ جب حکومت تبدیل ہو جائے تو پچھلی حکومت کا ریکارڈ جلا دیا جائے۔

ہر انسان کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے رضوی صاحب مرحوم شریف آدمی تھے لیکن ان بیچاروں کا مسئلہ یہ تھا کہ پنجاب پولیس ہمیشہ بڑی ان پڑھ ہوتی ہے' ان کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد تھی کہ وہ ایم اے تھے' جہاں عام طور پر لوگ میٹرک فیل ہوں بہت ہوا تو کوئی ایف اے ہو گیا۔ وہاں رضوی صاحب ایم اے پاس تھے اور انسپکٹر ہو گئے ایم اے ان کے نام کا ایک حصہ ہی تھا۔ جب وہ شروع شروع میں سروس میں آئے تو ہر شخص ان کو مسٹر این اے رضوی ایم اے کہتا تھا چونکہ وہ ان پڑھوں میں ایک پڑھے لکھے تھے ویسے بھی انگریزی وغیرہ تھوڑی بہت بول لیتے تھے۔ان کو یہ بڑا احساس تھا کہ وہ بہت قابل

ہیں۔ انہیں احساس برتری تھا ویسے انہوں نے درویشی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا لیکن ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی ایک احساس تھا کہ وہ اندھوں میں کانا راجہ ہیں تو جب کسی کو انہوں نے متاثر کرنا ہوتا تو کوئی کوٹیشن بول دیتے کسی بڑے مصنف کا حوالہ دے دیا، اس سے جوان پڑھ تھے وہ بڑے متاثر ہوتے تھے یہ سچوایشن پاکستان بننے کے بعد بدل گئی کیونکہ یہاں جو بھی افسر آتے تھے ان میں ایم اے ہونا عام بات تھی۔

رضوی صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اشاروں کنایوں میں باتیں کرتے تھے۔ جب میں انگلینڈ میں انٹیلی جینس کی جاب پر تھا تو رضوی صاحب اتفاق سے وہاں آئے۔ وہاں ایک کرنل صاحب تھے آج کل میجر جنرل ہیں میرے بڑے اچھے دوست تھے علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے وہ بھی رضوی صاحب کو جانتے تھے یہ 70ء کے الیکشن سے تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے کہ رضوی صاحب امریکہ جارہے تھے وہاں ایئرپورٹ پر ہماری ان سے ملاقات ہوئی اس زمانے میں عوامی لیگ کی بڑی ہوا تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات پر الیکشن لڑ رہے تھے ایسٹ پاکستان میں ریجنل ازم بڑے زوروں پر تھی سارے پاکستانی فکرمند تھے کیا بنے گا کرنل صاحب نے پوچھا' رضوی صاحب پاکستان میں کیا ہو رہا ہے رضوی صاحب نے کہا' کہاں کیا ہو رہا ہے کرنل صاحب نے کہا' ایسٹ پاکستان میں مجیب چھ نکات پر اتنا زور دے رہا ہے۔ اس کا کیا ہوگا رضوی صاحب کہنے لگے فکر کی کوئی بات نہیں ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے بتایا اتنا تھا' ایک دفعہ گیا ہوں تو اتنا رہ گیا ہے ایک دفعہ اور جاؤں گا تو ختم ہو جائے گا چونکہ مجیب الرحمٰن کی بات ہو رہی تھی اس لیے ہم یہی سمجھے کہ مجیب الرحمٰن کا اثر و رسوخ اتنا تھا۔ رضوی صاحب گئے تو اتنا رہ گیا ایک دفعہ اور جائیں گے ختم ہو جائے گا ہمیں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی اور تسلی بھی کہ ہمارے ملک میں' ہماری سروسز میں اتنے کارآمد لوگ موجود ہیں۔ اس کے بعد جب میں انگلینڈ سے پاکستان واپس آ گیا کرنل صاحب بھی آ گئے شکست ہو گئی میں نے ان صاحب کو فون کیا کہ آپ کو یاد ہے ایک دفعہ رضوی صاحب انگلینڈ آئے تھے اور انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا تھا کہ اتنا تھا۔ ایک دفعہ گیا ہوں تو اتنا رہ گیا ہے۔ ایک دفعہ اور جاؤں گا تو اتنا رہ جائے گا۔ وہ صاحب کہنے لگے ہاں مجھے یاد ہے۔ پوچھا کہ آپ کے خیال میں رضوی صاحب کس چیز کے متعلق کہہ رہے تھے کہ اتنا تھا' اتنا رہ گیا اور اتنا رہ جائے گا میں نے کہا شیخ مجیب کے متعلق وہ بولے' نہیں رضوی صاحب پاکستان کے متعلق کہہ رہے تھے یہ کہہ کے کرنل صاحب نے بڑی گالیاں دیں ان کو۔

بھٹو صاحب نے اقتدار میں آتے ہی بعض لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی مثلاً جنرل حبیب اللہ' احمد داؤد اور ولیکا وغیرہ کو گرفتار کر لیا اسے انتقامی کارروائی سے تعبیر کیا گیا اس حوالے سے لوگوں نے اس بات کو سخت ناپسند کیا۔

ایسی انتقامی کارروائیوں کو لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ پنجاب کا تو مجھے پتہ نہیں میں فرنٹیئر میں تھا، جب جنرل حبیب اللہ کو ہری پور جیل میں بھیجا گیا مشہور یہ ہوا کہ ان کی کسی پارٹی میں بھٹو صاحب کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اس لیے ان کو گرفتار کیا گیا ہے۔ سرحد میں ایسی باتوں کو پسند نہیں کیا جاتا وہاں اس قسم کی روائتیں ہیں کہ دشمن کے ساتھ بھی گھٹیا سلوک نہ کیا جائے۔ اس لیے وہاں لوگوں نے یہ بات پسند نہیں کی پھر ہمارے افسران اس قسم کی واہیات باتیں کرتے ہیں کہ انہیں اگر حکم ملے تو وہ اپنی نوکری پکی کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش کریں گے مثلاً حکم یہ تھا کہ جنرل حبیب اللہ جب جیل میں جائے تو اس کی فلم ٹی وی پر دکھائی جائے پولیس انہیں ہری پور جیل لے گئی لیکن ٹی وی والے پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تو ضرور فلم بنانی ہے چنانچہ فلم لینے کے لیے جنرل حبیب اللہ کو پھر جیل سے باہر لایا گیا اس قسم کے قصے وہاں مشہور ہونا شروع ہو گئے جسے لوگوں نے پسند نہ کیا کہ نئی گورنمنٹ تعمیری کاموں کی بجائے اتنا وقت اس قسم کی انتقامی کارروائیوں میں ضائع کر رہی ہے۔ ایک امریکن قونصلر نے پولیس کا پیچھا کیا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جنرل کو کہاں لے جا رہے ہیں اس لیے کہ اس کی اپنی فیملی اتنی خوفزدہ تھی کہ وہ اس کے پیچھے نہیں جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے امریکن قونصلر سے درخواست کی جس نے آ کر انہیں اطلاع دی کہ اس کو ہری پور جیل لے جایا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس فیملی کے امریکن قونصلر سے اتنے مراسم تھے۔

یہ بھی ہوا کہ بھٹو صاحب نے یحییٰ خان اور اس کے حوارلوں کے متعلق اخبارات اور ٹیلی ویژن میں ایک پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ان کی بدعنوانیاں بڑے بڑے جلی حروف میں پیش کی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی اس لحاظ سے کہ کس کو پتہ نہیں تھا کہ یحییٰ خان بدعنوان تھا' یا کون آدمی تھا جو یحییٰ خان کو پسند کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ کو ان باتوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے تعمیر نو میں صرف کرنا چاہیے تھا۔

لوگوں نے مارشل لا کے خلاف بڑی تنقید کی تھی لیکن بھٹو صاحب خود ہی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے خیال یہ تھا کہ وہ جلد ہی کوشش کریں گے کہ مارشل لا اٹھے لیکن بھٹو صاحب کی سیاست کا اپنا ایک انداز تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہنا چاہتے ہیں چنانچہ اس کے حق میں تقریریں اور بیان بازی شروع ہو گئی کہ اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ایک سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہو۔ سرکاری افسر پاکستانی شہری بھی ہوتا ہے ظاہر ہے جو زیادہ پڑھے لکھے ہوں گے وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ملک کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا ہے تو ہم تین دوست تھے اسلم باجوہ جائنٹ سیکرٹری آصف وردگ ڈپٹی سیکرٹری اور میں پشاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جینس تھا ہمیں لوگ ''تھری مسکیٹرز'' کہا کرتے

تھے ہمارا اس وقت بھی تاثر تھا کہ یہ بڑی زیادتی ہے چنانچہ عبدالحمید جتوئی سندھ سے پیپلز پارٹی کے اچھے خاصے بااثر آدمی تھے۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ ان کا سندھ کی سیاست میں اچھا خاصا اثر ہے' بزرگ سیاستدان ہیں' بڑے اچھے آدمی ہیں ہم تینوں اس جذبے سے سرشار ان کے پاس پہنچے کہ انہیں کہیں گے کہ یہ بڑی زیادتی ہے یہ نہیں ہونا چاہیے' آپ بھٹو صاحب سے کہیں کہ انہیں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نہیں رہنا چاہیے جتوئی صاحب نے کہا ہاں میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ بھٹو صاحب کی سیاست کا اپنا ایک خاص انداز تھا مثلاً یہ کہ لوگ توقع کریں گے کہ یہ ہمیشہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہنا چاہتے ہیں لیکن وہ (بھٹو صاحب) اچانک اعلان کریں گے' کہ وہ مارشل لا ختم کر رہے ہیں اس سے لوگ حیران رہ جائیں گے اور اس کا بڑا خوشگوار اثر ہوگا، ان کے اپنے ساتھی بھی یہی سمجھتے رہے کہ بھٹو صاحب واقعی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بیان بازی شروع کر دی' پھر بھٹو صاحب نے اچانک مارشل لا ختم کرنے کا اعلان کر دیا ان کے ساتھیوں کی پوزیشن بڑی خراب ہوئی۔

اسی زمانے میں میرا تبادلہ پشاور سے کراچی بطور ڈی آئی جی سپیشل برانچ ہو گیا۔ میں ابھی لاہور ہی پہنچا تھا' مجھے پتہ چلا کہ 1400۔ افسر نکالے گئے ہیں میں نے دوستوں سے پوچھا کہ میرا تو نام نہیں۔ اگر میرا نام ہے تو جاؤں ہی ناں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا نام نہیں ہے اسلم باجوہ صاحب چودہ سو کی لسٹ میں آ گئے' حالانکہ ہم تینوں عبدالحمید جتوئی صاحب سے قومی جذبے کے تحت ملے تھے اور ہم تینوں کا کیریئر بڑا غیر معمولی رہا تھا۔ بعد میں بھٹو صاحب کے زمانے میں ہی وردگ صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ اس لسٹ میں میرے کافی دوست تھے تو حکومت کا یہ اقدام بھی پسند نہیں کیا گیا۔ اس سے بھی سرکاری افسروں میں کافی ناراضگی ہوئی جو آخر وقت تک چلتی رہی بہرحال جب کوئی گورنمنٹ آتی ہے تو اس کا سب سے پہلا وار سرکاری افسروں پر ہوتا ہے اس کا ایک پس منظر ہے بھٹو صاحب کی عادت تھی ہر کام جلدی جلدی میں کرنے کی' یہ کام بھی بہت ہی جلدی میں کیا گیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ بتاؤ کس کس کو نکالا جائے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ کس کی ریپوٹیشن خراب ہے یا کون غیر مستعد اور نافرض شناس ہے۔ اس فہرست میں اکثر لوگ وہ بھی تھے کہ جن سے پیپلز پارٹی کا کوئی آدمی کسی طور سے ناراض تھا مثلاً مجھے یاد ہے کہ آخر وقت تک کوشش ہوتی رہی کہ اس کا نام لگا دو اس کا نام ہٹا دو آخر وقت میں شیر پاؤ نے کوشش کر کے فہرست میں سے فرنٹیئر کے ایک دو نام نکلوائے نہ جانے کس طرح سے لسٹ بنی' کس نے بنائی' بڑا اوٹ پٹانگ طریقہ استعمال کیا گیا' بہت سے بے گناہ لوگوں کو اس میں شامل کر لیا گیا

صرف اس لیے کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے کسی آدمی کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔

یہ اقدام بالکل اچھا نہیں تھا لیکن یہاں جو حکومت بھی آتی ہے اس کی نیت کبھی بھی صاف نہیں ہوتی وہ کبھی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ وہ حکومت چھوڑیں گے فوجی حکومتوں کا تو جمہوری ذہن ہوتا ہی نہیں۔ لیکن ہماری سیاسی حکومتوں نے بھی جمہوری ذہن نہیں دکھایا وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو دبا کے رکھا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری افسروں کو اس قدر اپنے ہاتھ میں لیا جائے اس قدر ان کو استعمال کیا جائے کہ پھر وہ جائز اور ناجائز میں فرق نہ سمجھیں انگریزوں کے زمانے سے ایک روایت چلی آ رہی تھی وہ تھی سکیورٹی آف سروس (ملازمت کا تحفظ) ایک آدمی جو بھرتی ہوتا تھا اس کو پتہ ہوتا تھا کہ 55 سال کی عمر تک اس نے نوکری کرنی ہے شاذ و نادر کسی کے خلاف کارروائی ہوتی تھی ان میں سینس آف سکیورٹی (احساس تحفظ) تھی کہ اسے کوئی نکال نہیں سکتا۔ انگریزوں نے اسے جان بوجھ کے رائج کیا تھا ان کے ملک میں بھی یہ روایت ہے کہ آپ کسی شخص کو نوکری سے نکال نہیں سکتے اس سے سرکاری افسروں میں یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ جو سیاستدان وزیر آتے ہیں ان کی نوکری کچی ہوتی ہے ہم تو پکی نوکری پر ہیں چونکہ ان کو خیال ہوتا تھا کہ ان کی نوکری پکی ہے وہ سیاستدانوں کا، وزیروں کا غلط حکم نہیں مانتے تھے مجھے اچھی طرح سے علم ہے کہ جب ہم لوگ شروع میں پولیس میں آئے تھے تو ہمارے آئی جی اور ڈی آئی جی وغیرہ جو ہوتے تھے ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو غلط حکم نہیں مانتے تھے جبکہ سیاستدانوں کا بغیر غلط حکم منوائے کام نہیں چلتا اس لیے کہ ہماری سیاست اجتماعی سیاست نہیں کہ اجتماعی فائدہ ہو۔ اجتماعی کوشش ہو ہماری سیاست تو یہ ہے کہ جو آدمی وزیر ہو جائے لوگ اس کے علاقے سے آئیں گے کہ میرے بیٹے کو نوکری دلوا دو میرے بھائی کو فلاں جگہ ٹرانسفر کرا دو میرے فلاں کو فلاں جگہ پروموٹ کرا دو میرا فلاں غلط کام کروا ان کے کام انفرادی ہوتے ہیں ان میں بھی زیادہ تر کام وہ ہوتے ہیں جو قاعدے اور قانون کے مطابق ہو نہیں سکتے ایسے کام کرنے سے اگر سرکاری افسر انکار کر دے تو وزیر صاحب کے خیال میں ان کی ساری وزارت ختم ہو گئی۔ وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔

سول سرونٹس (سرکاری ملازمین) یا سول سروس کو سب سے پہلے ایوب خان نے کمزور کیا۔ چونکہ وہ نہ الیکشن کرانے کا ارادہ رکھتا تھا نہ جمہوریت بحال کرنے کا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ جمہوریت کا جامہ پہن کے یا غیر فوجی کپڑے پہن کے ڈکٹیٹر بنا رہے اس کے لیے ضروری تھا کہ سرکاری افسر اس کا ہر جائز ناجائز حکم مانیں اور وہ لوگوں پر سختی کر کے ان کو قابو میں رکھیں تا کہ ایوب خان کے خلاف یا اس کے نظام کے خلاف یا فوجی حکومت کے خلاف کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سرکاری

ملازمین کا تحفظِ ملازمت ختم کیا جاتا۔ چنانچہ سب سے پہلی سکریننگ ایوب خان نے کی۔ جس سے سرکاری افسروں کی ایک طرح سے کمر ٹوٹ گئی اور وہ سوچنے لگے کہ وہ پریذیڈنٹ یا اس کے وزیروں کے رحم وکرم پر ہیں اس کے بعد پھر ہر گورنمنٹ نے پہلا وار سرکاری افسران پر کیا۔ ایوب خان نے تو پچاس ساٹھ نکالے ہوں گے۔ یحییٰ خان نے آ کے 303 نکال دیئے بھٹو صاحب آئے تو انہوں نے چودہ سو نکال دیئے میں یہ نہیں کہتا کہ سارے سرکاری افسر فرشتے ہیں ان میں سے بیشمار بے ایمان بھی ہیں چونکہ ملازمت کا تحفظ ہوتا تھا۔ ان کو نکالنا آسان نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چند خراب لوگوں کی وجہ سے انسٹی ٹیوشن (ادارہ) ہی تباہ کر دیا جائے۔ اب ایسا مرحلہ آ گیا ہے کہ سرکاری افسر کو اگر نوکری کرنی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کو جائز حکم ملا ہے یا ناجائز جو حکم اس کو ملا ہے اس نے وہ بجالانا ہے اس لیے کہ اب ملازمت کا کوئی تحفظ نہیں ہے سرکاری افسر کے سامنے چانس یہ ہے کہ اگر اس کو غلط حکم ملتا ہے اس کے ضمیر کے خلاف اس کو حکم ملتا ہے تو اس کے سامنے کیا چانس ہے ایک تو یہ کہ وہ غلط حکم مانے لیکن اگلی حکومت جب آئے گی تو وہ اس کے خلاف کارروائی کرے گی اور اگر وہ اس حکم کو نہیں مانتا تو جو موجودہ حکومت ہو گی وہ اس کو نکال دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آج نکلے یا کل نکلنا اس نے بہر صورت ہے اگر سول سروس میں، سرکاری افسروں میں یہ ذہن ہو جائے تو اس ملک میں کوئی ترقی کوئی دور رس خوشگوار نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اس لیے پھر جائز اور ناجائز میں، اچھے اور برے میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ جو افسر حکومت کا جائز اور ناجائز حکم مان لیتے ہوں وہ وقت کی حکومت کے تو منظور نظر ہوتے ہیں لیکن اگلی حکومت انہیں نکال دیتی ہے۔ وہ کھیپ نکل جاتی ہے اور اگلی ایک کھیپ تیار ہو جاتی ہے۔ اگلی حکومت آئے گی تو یہ کھیپ بھی نکل جائے گی اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ سول سروس جس میں پولیس بھی ہے اور باقی ادارے بھی ایک طرح سے ختم ہو کے رہ گئے ہیں تھوڑی بہت کسر جو رہ گئی تھی وہ یوں پوری ہو رہی ہے کہ فوج سے ناتجربہ کار آدمیوں کو براہ راست بڑے بڑے سویلین عہدوں پر لگایا جا رہا ہے مثلاً پہلے یہ ہوتا تھا کہ پولیس سروس میں اگر فوج سے آتے بھی تھے ان کی باقاعدہ ٹریننگ ہوتی تھی پھر چار پانچ سال وہ اے ایس پی رہتے تھے پھر جا کے کوئی دس بارہ سال وہ ایس پی رہتے تھے اب یہ ہے کہ آپ فوج سے کسی کرنل کو کسی میجر کو لے آئیں اور کسی بڑے عہدہ پر بغیر کسی ٹریننگ کے لگا دیں چونکہ وہ ناتجربہ کار ہوتے ہیں اس لیے ان کے ماتحت ان کی عزت نہیں کرتے انہیں پتہ ہوتا ہے کہ ان ناتجربہ کار افسروں کو کوئی کام نہیں آتا دوسرے وہ جو ساری عمر انتظار میں ہوتے ہیں کہ انہیں ترقی ملے گی ان کی ترقی بند ہو جاتی ہے۔ اس طرح سول سروس کی کارکردگی ایک طرح سے ختم ہو کے رہ گئی ہے جب تک ہماری سول سروس اس حال میں رہے گی اس ملک میں حالات

کبھی بھی نہیں سدھر سکتے اس لیے کہ گورنمنٹ کی جو پالیسیز ہیں ان پر عمل درآمد تو سرکاری افسروں نے ہی کرنا ہے۔گورنمنٹ کی نیت کتنی بھی اچھی ہو یا سکیمیں کتنی بھی اچھی ہوں لیکن عمل درآمد کرنے کے لیے لوگ نہیں ہوں گے تو کس طرح بات بنے گی۔

پیپلز پارٹی میں بہت زیادہ تعداد نا تجربہ کار اور نوآموز سیاست دانوں کی تھی جنہیں حکومت کرنے کا یا اس کے طریق کار کا کوئی خاص پتہ نہیں تھا دوسرے یہ کہ ہماری سیاست میں ہمیشہ ایجی ٹیشن سے گورنمنٹ بدلتی ہے۔تو جو سیاستدان ایجی ٹیشن کے ذریعے آتے ہیں ان کا ذہن ایجی ٹیٹر کا ہوتا ہے اور جب اچانک گورنمنٹ ملتی ہے تو وہ ذہن اتنی جلدی نہیں بدلتا پھر یہ ہے کہ سرکاری افسروں کے خلاف ان کا ایک خاص رویہ ہوتا ہے اور حکومت میں آنے کے باوجود وہ ایڈمنسٹریٹر کی بجائے ایجی ٹیٹر کی سی باتیں کرتے ہیں۔پیپلز پارٹی کے بیشتر ورکر ایوب خان کے خلاف ایجی ٹیشن میں حصہ لے چکے تھے پھر یحییٰ خان کے زمانے میں بھی ایک طرح سے مہم چلتی رہی اس لیے ان ورکروں میں جذبہ تھا کہ سرکاری افسروں سے انتقام لیں گے اس لیے سرکاری افسر بڑے ہراساں تھے کہ پتہ نہیں یہ لوگ ہمارا کیا حشر کریں گے۔ ایک قصہ مجھے یاد ہے کیمبل پور کے عاشق کلیم صاحب ہوتے تھے بالکل نوجوان کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔کوئی زیادہ تعلیم بھی نہیں تھی بھٹو صاحب نے انہیں گورنر کا ایڈوائزر لگا دیا انہوں نے اپنی پہلی تقریر یہ فرمائی ''اے سرکاری افسرو، اچھی طرح سے کان کھول کے سن لو اگر تم لوگوں نے اپنے طور طریقے نہ بدلے تو میں تمہیں زمین میں زندہ گاڑ کے تم پر کتے چھوڑ دوں گا'' یہ بات بھٹو صاحب کے نوٹس میں آئی تو وہ ناراض ہوئے اور کھر سے کہا اب ان الو کے پٹھوں کے لیے میں سکول بھی کھولوں۔یہ بھی بتاؤں کہ کیا تقریر کرنی ہے اور کیا نہیں کرنی۔

دوسری طرف جیسے عوام میں ذہنی انقلاب آیا تھا کہ غریب آدمی بھٹو صاحب کے آگے پیچھے اور اردگرد جمع ہو گئے وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو صاحب غریبوں کے ہمدرد ہیں اسی طرح سرکاری افسروں اور سرکاری محکموں میں بھی ایک انقلاب آیا تھا۔کم تنخواہ دار ملازموں کے ذہن میں اپنے سینئرز کے خلاف ایک نفرت تھی، مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ایک دفعہ بھٹو صاحب پشاور آرہے تھے ائرفورس کی بیس میں ان کا جہاز اترنا تھا ہم سب لوگ ان کے انتظار میں تھے۔ائرمینوں کی ایک پلاٹون خود بخود بیس پچیس کی تعداد میں وہاں آگئے۔اور اس انتظار میں تھے کہ بھٹو صاحب آرہے ہیں ہم ان سے بات کریں گے اور اپنے مطالبات پیش کریں گے ان کے افسران نے انہیں بڑا منع کیا لیکن وہ اسی پر مصر تھے بڑی مشکل سے بڑی منت سماجت کر کے انہیں وہاں سے لے گئے۔

یہاں تک ہوا کہ شیر پاؤ وہاں گورنر تھے گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے کھول دیئے گئے کہ گورنر صاحب لوگوں سے ملیں گے پہلے تو انہیں کوئی وہاں سے گزرنے نہیں دیتا تھا اس اعلان کے بعد لوگوں نے سمجھا کہ واقعی شیر پاؤ ہمارا اپنا آدمی ہے وہ وہاں پہنچنا شروع ہو گئے یہاں تک کہ ائرفورس کے باوردی ملازم بھی آ کے اپنے مطالبات پیش کرنے لگے پھر وہاں اتنا ہجوم ہو گیا کہ گورنر ہاؤس کے سارے جنگلے ٹوٹ گئے شیر پاؤ کے جوتے بھی وہاں رہ گئے وہ بڑی مشکل سے جان بچا کے اندر بھاگے جب ایک نظام ختم ہوتا ہے دوسرا شروع ہوتا ہے۔ تو اس کی تبدیلی بڑی مشکل ہوتی ہے اس کے بعد شیر پاؤ صاحب نے گورنمنٹ ہاؤس کی گارد پہلے سے بھی زیادہ کردی ایک عوامی گورنر کو پہلے سے بھی سخت انتظام کرنا پڑا۔

❖

پولیس سٹرائیک

71/72 میں ایک ذہنی انقلاب آیا آہستہ آہستہ وہ ساری روایتیں ختم ہونا شروع ہوگئیں۔

کچھ دوست میرے ہاں آئے ہوئے تھے ان میں سرکاری افسر تھے کچھ پولیس افسر تھے گپ شپ لگ رہی تھی کہ اچانک آواز آئی جیسے کوئی توڑ پھوڑ کررہا ہے نعرے بھی لگ رہے ہیں بڑے زوردار۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہوگیا میرا نوکر بھاگ کے گیا ساتھ ہی ہماری پولیس پوسٹ تھی اس نے آ کے بتایا کہ پولیس کے سپاہی پوسٹ کی توڑ پھوڑ کررہے ہیں اور یہ پتہ نہیں کہ مجمع ادھر آئے گا یا کسی اور طرف چلا جائے گا اس سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جو فورس امن وامان قائم کرتی ہے جس پر لوگوں کا انحصار ہوتا ہے کہ وہ ان کے جان ومال کی حفاظت کریں گے اگر وہی باغی ہوجائیں بے قابو ہوجائیں تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کیا ہوگا ہم اس انتظار میں تھے کہ یہ سارا سیلاب جو توڑ پھوڑ کررہا ہے رائفلیں ان کے ہاتھ میں ہیں کدھر جاتا ہے اب تو ہمارا گھر ہی توڑیں گے چونکہ میں انٹیلی جنس میں تھا اس لیے ان کا رخ ڈی آئی جی کی کوٹھی کی طرف ہوگیا ڈی آئی جی وہاں موجود نہیں تھے ان کی بیوی اور بچے بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کے میرے گھر بھاگ آئے ان کے شیشے توڑ دیئے گئے فرنیچر وغیرہ بھی توڑ دیا گیا پھر مجمع آگے بڑھا سارے پشاور میں انہوں نے ہڑتال کرادی ٹیلی فون ان کے قبضے میں، اسلحہ ان کے قبضے میں ساری جگہوں پر انہوں نے فون کردیئے پھر انہوں نے جلوس نکالا اور آئی جی صاحب کو مجبور کیا کہ وہ پیٹی اتار کے جلوس میں شامل ہوجائیں چنانچہ وہ بھی پیٹی اتار کے جلوس میں شامل ہوگئے بنگش صاحب تھے آئی جی اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ ہم پولیس لائنز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کس طرح سے ان کو قابو کریں تو دیکھا کہ ٹرک پر ٹرک بھر کے آرہے ہیں ڈیرہ اسماعیل خاں سے ایبٹ آباد سے کوہاٹ سے اور وہ ہوائی فائر کرتے ہوئے دھڑام دھڑام پولیس لائنز میں آگئے بڑی سنگین پچوایشن تھی۔

بھٹو صاحب نے اپنے ایک مرکزی وزیر جنرل اکبر خاں (کانپر لسی والے) کو بھیجا کہ آپ جا

کے سچوایشن دیکھیں، کیا کرنا چاہیے خوش قسمتی سے انہوں نے میاں انور علی صاحب کو بھی بھیج دیا کہ آپ بھی جا کے صورت حال دیکھیں جنرل اکبر خاں کے متعلق پٹھانوں میں یہ تاثر ہے کہ یہ پاگل فیملی ہے ویسے بھی بڑا غیر مستحکم سا آدمی ہے شیر پاؤ تو بیچارہ نو عمر تھا اس کو تجربہ بھی نہیں تھا وہ سچوایشن سے بہت گھبرایا وہ ان کے کہنے پر چل رہا تھا اکبر خاں نے فیصلہ کیا کہ فوج سے کہا جائے کہ وہ راتوں رات پولیس لائنز اور تھانوں کا محاصرہ کر لے اس کے بعد وہ پولیس کو ہتھیار پھینکنے کا الٹی میٹم دے اگر پولیس ہتھیار پھینک دے تو اسے گرفتار کر لیا جائے اگر وہ ایسا نہ کریں تو تھانوں کو پولیس کو توپوں سے اڑا دیا جائے ہم نے کہا یہ تو بالکل پاگل پن ہے اگر خدانخواستہ پولیس والے اس طرح سے مارے گئے تو صورتحال بڑی سنگین ہو جائے گی اس لیے اس قسم کا ایکشن نہیں ہونا چاہیے میاں انور علی صاحب وہاں سب سے سنیئر افسر تھے ہم نے سوچا کہ میاں صاحب سے بات کرتے ہیں اس وقت ہم جتنے بھی افسر تھے ہم سب نے اسے اجتماعی مسئلہ بنا لیا تھا یہ تمیز نہیں تھی کہ جو آئی جی ہے یا ڈی آئی جی ہے یا ایس پی ہے وہی ذمہ دار ہے بلکہ ہم سب مل کے اسے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے ہم نے میاں انور علی صاحب سے کہا کہ آپ پریذیڈنٹ صاحب (بھٹو) سے بات کریں کہ یہ آدمی (جنرل اکبر خاں) تو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اس نے اس قسم کی سنگین تجویز بنائی ہے میاں انور علی صاحب نے پریذیڈنٹ کو فون کیا بھٹو صاحب نے کہا ٹھیک ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کے مشورے سے چلے لیکن آپ کوشش کریں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے چنانچہ بھٹو صاحب نے اکبر خاں کو فون کیا کہ تمہاری سکیم کا کوئی فائدہ نہیں تم یہ نہیں کرو گے تم جو بھی تجویز یا سکیم بناؤ، میاں انور علی کا مشورہ لے کے بناؤ۔

ہڑتالی پولیس کے مطالبات بڑے عوامی قسم کے تھے ان میں سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ پولیس یونین بنانے کی اجازت دے دی جائے ان کے مطالبات مان لیے گئے انہوں نے یونین بنا لی پولیس میں بھی بارگیننگ ایجنٹ (سودا کاری ایجنٹ) بن گیا اس کا یہ فائدہ ہوا کہ سنگین صورتحال ٹل گئی اور اس کے جو خطرناک نتائج ہو سکتے تھے وہ ختم ہو گئے اس کے بعد پھر پنجاب میں پولیس ہڑتال ہوئی میں یہاں نہیں تھا لیکن گورنر کھر صاحب نے اسے ذاتی طور پر ہینڈل کیا۔

جب ہڑتال شروع ہوئی اس وقت کسی سیاسی جماعت کا اس میں ہاتھ نہیں تھا میں وہاں موجود تھا اس لیے مجھے علم ہے یہ ہڑتال ایک واقعے کے نتیجے میں اچانک ہو گئی کوئی پلاننگ نہیں تھی چوک یادگار میں نیپ کا جلسہ تھا وہاں پولیس بھی موجود تھی پیپلز پارٹی کے لوگوں نے اس جلسے میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی پولیس نے انہیں روکا پیپلز پارٹی کے ورکروں نے پولیس کو مارا اور گالیاں سنائیں۔ اس بات پر ان میں

جھگڑا ہو گیا پولیس نے سٹرائیک کر دی۔

جب سٹرائیک ہو گئی تو اس کے پھیلانے میں ظاہر ہے نیپ نے ضرور حصہ لیا ہو گا اس لیے کہ پھر سٹرائیک سارے صوبے میں پھیل گئی، لیکن نیپ کے متعلق ایسی کوئی براہ راست شہادت نہیں ملی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ نیپ کی ہمدردی ہڑتالیوں کے ساتھ تھی اور ان کی کوشش بھی یہی تھی کہ کسی طرح پیپلز پارٹی کی حکومت ناکام ہو کیونکہ نیپ اور پیپلز پارٹی میں غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی ولی بھٹو بھائی بھائی کا دور ختم ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ولی خان، شیر پاؤ کو جان بوجھ کر لڑکا کہا کرتے تھے۔ مثلاً وہ لڑکا مجھے ملا تھا۔ "لڑکا اچھا ہے" گورنر کو لڑکا کہنا عجیب سا لگتا ہے ان کا خیال یہ تھا کہ بھٹو صاحب نے شیر پاؤ کو گورنر بنا کے غلطی کی ہے۔

فرنٹیئر میں ہم لوگوں نے نہ اکبر خاں کی سکیم پر عمل کیا نہ ہم کو فوج کی ضرورت پڑی لیکن بعد میں جب پنجاب میں پولیس سٹرائیک ہوئی وہاں بڑا سنگین معاملہ ہوا۔ لائل پور میں ایڈمنسٹریشن بڑی خراب تھی۔ میں نے سنا ہے کہ بھٹو صاحب نے گل حسن سے کہا تھا کہ وہ فوج استعمال کریں۔ رحیم خاں سے کہا تھا کہ ائر فورس چکر لگائے دونوں نے اس بات کی مخالفت کی میرا خیال ہے یہی وجہ تھی کہ بھٹو صاحب نے بالآخر ان کو ہٹا دیا دیکھیں شکست ہو چکی تھی لیکن ان کے دماغ سے یہ بات نہیں نکلی تھی کہ وہ سول اتھارٹیز کے ماتحت نہیں اور جب چاہیں کسی حکم کو ڈیفائی کر سکتے ہیں بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ فوج میں اس قسم کا جو بوناپارٹ ازم ہے وہ ختم کیا جائے یہی وجہ تھی کہ گل حسن اور رحیم خاں کو نکال دیا۔

بھٹو صاحب کو اقتدار میں لانے سے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے اقتدار میں آنے کا پہلا زینہ ہے ان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب چار پانچ مہینے میں حالات پر قابو نہیں پا سکیں گے پھر وہ اقتدار پر قبضہ کر لیں گے لیکن جیسے ہی بھٹو صاحب نے گل حسن کو کمانڈر انچیف بنایا۔ ان دونوں کی آپس میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ رسہ کشی اس بات پر تھی کہ ان میں سنیئر کون ہے رحیم خاں پہلے سے ائر مارشل تھے وہ سمجھتے تھے کہ میں سنیئر ہوں گل حسن سمجھتے تھے کہ میں فوج کا کمانڈر انچیف ہوں۔ فوج کی تعداد دوسری فورسز کے مقابلے میں زیادہ ہے مارشل لا بھی وہی لگاتی ہے اس لیے ان کی بالادستی ہوتی ہے گل حسن کوشش یہ کر رہے تھے کہ آئندہ جو مارشل لا لگائیں گے اس کا ابھی سے فیصلہ ہو جائے کہ میں سنیئر ہوں یا رحیم خاں۔ ہر فنکشن پر جہاں یہ موجود ہوتے تھے اپنی اپنی سینارٹی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باقاعدہ ایک دوسرے کو دھکا دے کے پہلے کھڑا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک بات پہنچی کہ جب کوئی اہم شخصیت آتی تو یہ آپس میں تقریباً کشتی لڑتے تھے کہ میں پہلے ہوں میں پہلے کھڑا ہوں گا باقاعدہ اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا۔ بھٹو صاحب نے انہیں چلتا کیا تو وہ جھگڑا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ٹکا خاں آئے وہ سیدھا سادا سولجر ہے

ملنگ آدمی ہے ان کے زمانے میں اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ نہیں ہوا۔

شخصی اقتدار میں جب آدمی نیا نیا اقتدار میں آتا ہے تو ایک دور ہو جاتا ہے جن لوگوں نے اس کی امداد کی ہوتی ہے ان کی موجودگی میں وہ بے اطمینانی سی محسوس کرتا ہے اس کا قد کاٹھ نہیں نکلتا مثلاً ایوب خان آئے انہوں نے جب تک جنرل اعظم خاں جنرل برکی اور جنرل شیخ کو ٹھیک ٹھاک نہیں کر لیا اس وقت تک ان کا قد کاٹھ اور سیاسی پر پرزے نہیں نکلے اس طرح ضیاء الحق کو دیکھیں۔ جنرل جہاں زیب، جنرل چشتی، جنرل غلام حسن، جنرل اقبال، ایئر مارشل ذوالفقار، ایڈمرل چودھری محمد شریف، یہ سب محسوس کرتے تھے کہ وہ دوڑ میں شریک ہیں انیس بیس کا فرق ہے بعض دفعہ انیس بیس کا فرق بھی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ چشتی خاص طور پر یہ سمجھتے رہے کہ وہ ان کی مونچھ کا بال ہیں اور ان سے زیادہ قابل ہیں یا زیادہ حق دار ہیں ضیاء الحق آہستہ آہستہ ان کو ٹھکانے لگاتے رہے پھر جا کے انہوں نے محسوس کیا کہ اس دوڑ میں یہ شریک نہیں ہیں تو یہ ایک دور ہوتا ہے ان میں خاص طور سے جو لوگ جمہوریت کے راستے سے نہ آئے ہوں۔

بھٹو صاحب کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہاری ہوئی قوم ایک ہاری ہوئی فوج ایک خوفزدہ قوم کو کیسے سہارا دیا جائے اس میں آئندہ زندہ رہنے کا کیسے جذبہ پیدا ہو جس طرح ہمارے نوے ہزار فوجی ہندوستان کی قید میں تھے۔ ان کے متعلق بنگلہ دیش اور ہندوستان کے عجیب عجیب مطالبات تھے یہاں تک کہ ان پر مقدمات چلائے جائیں بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ اس سے قوم کی مزید بدنامی ہو گی پھر ایک اور سنگین مسئلہ تھا کہ ویسٹ پاکستان میں بے شمار بنگالی تھے فوج میں بھی اور سول میں بھی۔ اس وقت ہمارے ویسٹ پاکستانی یہ سمجھتے تھے کہ اس ساری بدقسمتی، ساری بدنامی اور ساری شکست کے ذمے دار بنگالی ہیں تو بھٹو صاحب کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان بنگالیوں کو کس طرح سے تحفظ دیا جائے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو جس طرح سے ہینڈل کیا اس سے ان کے تحمل، تدبر اور بردباری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سارے جذباتی ماحول میں صرف بھٹو صاحب تھے جنہوں نے اس سلسلے میں ہوش قائم رکھا اس لیے کہ اگر خدانخواستہ یہاں بنگالیوں کا قتل عام شروع ہو جاتا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوتے ہمارے قیدی واپس نہیں آ سکتے تھے۔

اگر بھٹو صاحب ایک اشارہ بھی کر دیتے جیسا کہ جذباتی لیڈر بعض دفعہ کر جاتے ہیں تو قوم کا سارا غم و غصہ ان بنگالیوں پر نکلتا اس فساد میں ذرا دیر نہ لگتی دوسرے اگر لوگوں کا بس چلتا تو وہ اپنی شکست کا بدلہ ان بنگالیوں سے لیتے مجھے خود اس کا علم ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو بڑے تحمل سے ہینڈل کیا بنگالی

سرکاری افسروں کو اپنی اپنی جگہ پر رہنے دیا۔ یہاں تک کہ جو حساس محکمے تھے وہاں جو بنگالی تھی انہیں بھی نہ چھیڑا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کو دفتروں سے فارغ کیا اور کہا کہ اپنے گھروں میں بیٹھیں۔ تنخواہ آپ کو ملتی رہے گی پھر انہوں نے آہستہ آہستہ ان کو کیمپوں میں اکٹھا کیا تا کہ آخری وقت تک ان کے جان و مال کی حفاظت ہوتی رہے اس طرح سے انہوں نے اس مسئلے کو حل کیا۔

سیاسی طور پر یہ ایک بڑی سخت گڑبڑ تھی کہ صرف پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دریائے سندھ دو پارٹیوں میں، دو طبقوں میں، دو مکتبہ ہائے فکر میں ڈیوائڈنگ لائن ہے۔ مجھے یاد ہے قیوم خان بڑے دل برداشتہ تھے کہ بھٹو صاحب آرہے ہیں بھٹو صاحب تقریروں میں کہا کرتے تھے ڈبل بیرل خاں آگے بھی خان، پیچھے بھی خان بھٹو صاحب کو یہ بھی علم تھا کہ یحییٰ خان نے قیوم خان کو الیکشن میں سپورٹ کیا تھا۔ پیسے بھی دیئے تھے قیوم خان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب انہیں رہنے نہیں دیں گے دوسری بات یہ تھی کہ پیپلز پارٹی اور نیپ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھیں ان کا پروگریسو پروگرام تھا دونوں اپنے آپ کو کسانوں اور مزدوروں کی جماعتیں کہتی تھیں۔ حالانکہ نیپ کے سلسلے میں یہ بات درست نہیں۔ لہٰذا قیوم خان بہت دل برداشتہ ہوئے ان کی بقا کا مسئلہ بھی تھا انہیں خدشہ تھا کہ بھٹو صاحب انہیں جیل بھیج دیں گے۔ بھٹو صاحب کے متعلق مشہور بھی تھا کہ وہ انتقامی ذہن رکھتے ہیں چنانچہ قیوم خان گروپ نے کوشش کی کہ نیپ سے معاہدہ کر کے سرحد میں حکومت بنالیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ ولی خان قیوم خان کے ساتھ کبھی صلح نہیں کرتے چنانچہ قیوم خان نے پیش کش کی کہ میں استعفیٰ دیتا ہوں آپ یوسف خٹک کو صدر چن لیں اور نیپ سے مل کے حکومت بنالیں تا کہ پیپلز پارٹی کے حملے سے بچا جا سکے۔ اس کی تیاری مکمل ہوگئی۔ قیوم خان سیاست سے ریٹائر ہونے کے لیے بالکل تیار تھے ادھر نیپ کی ہائی کمان کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کا کوئی نہ کوئی معاملہ ہو جائے گا کیونکہ دونوں قیوم خان کے بھی خلاف تھے چنانچہ کچھ عرصہ ایسے لگا کہ نیپ اور پیپلز پارٹی میں صلح جوئی کی باتیں ہو رہی ہیں نیک نیتی سے ہیں۔ بلکہ بھٹو صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ ولی خان کے گھر ٹیلی فون لگایا جائے تا کہ ان سے بات وات ہو سکے۔ مرکزی کابینہ کے لیے ولی خان نے اپنے دو آدمی نامزد بھی کر لیے تھے۔ ایک تو ارباب سکندر خاں خلیل تھے دوسرا یاد نہیں ادھر یہ تیاری ہوئی ادھر اچانک پتہ چلا کہ بھٹو صاحب نے قیوم خان کو بلا لیا۔ نیپ والے بڑے پریشان ہوئے قیوم خان کو منسٹر لے لیا گیا چنانچہ نیپ نے وزارت میں شامل ہونے کے زور شور سے جو تیاریاں شروع کر رکھی تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ جو وزارتیں آفر کی گئیں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک محکمہ تو انڈسٹری تھا دوسرا شائد فنانس کا تھا بہر حال اہم قسم کے قلمدان تھے اور یہ جو

خیال تھا کہ نیپ اور پیپلز پارٹی کی حکومت بنے گی اور چلے گی۔ قیوم خان کے کیبنٹ میں لینے سے ماحول بدل گیا۔ بلکہ دوستی اور بھائی چارے کا ماحول شک و شبے کے ماحول میں بدل گیا اور نیپ نے سمجھ لیا کہ بھٹو صاحب صحیح معنوں میں سیاستدان ہیں۔ وہ ہمیں کبھی بھی اقتدار میں شامل نہیں کریں گے۔ بھٹو نے سرحد اور بلوچستان میں اپنے گورنر بھی بنا لیے۔ نیپ سے انہوں نے مشورہ نہ کیا۔

میں 61ء۔62ء میں پہلے بھی دو سال کراچی میں رہا تھا اب کے میں نے وہاں کا ماحول کافی حد تک بدلا ہوا پایا۔ ایک تو میں نے دیکھا کہ امن و امان کی صورت حال خراب ہے مزدور گھیراؤ پہ گھیراؤ کر رہے ہیں ہڑتالیں ہو رہی ہیں وہ اپنے مطالبات زبردستی منواتے ہیں دوسری طرف سندھی اور غیر سندھی معاملہ کافی حد تک خراب ہو گیا تھا اصل میں سندھی بیچارے ہمیشہ سے دبے ہوئے تھے کیونکہ وہاں غیر سندھیوں کا ہولڈ رہا تھا پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہمارا صوبہ ہے چنانچہ پانسہ پلٹا۔ اس سے غیر سندھیوں کو غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس کشمکش نے کافی خراب صورت اختیار کی ہوئی ہے ممتاز بھٹو صاحب وہاں گورنر تھے ان کے ایڈوائزر سارے کے سارے سندھی تھے اس سے غیر سندھیوں کو احساس ہوا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ ویسے غیر سندھیوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ بھی نہیں دیئے تھے سندھ میں خاص طور سے۔ میں وہاں ایک مہینہ رہا کیونکہ ممتاز بھٹو کے ساتھ میرا گزارا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیشہ سے میری طبیعت یہ رہی ہے کہ میں غلط کام نہیں کرتا جبکہ ممتاز بھٹو اور جو بھی اس وقت مشیر اور سیاستدان تھے ان کا خیال تھا کہ سرکاری افسر کو جو بھی حکم ملے اس کو یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز اس کو فوراً اس پر عمل کرنا چاہیے چنانچہ بعض باتوں پر میرے ان سے اختلافات ہوئے میں نے کہا میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے سنٹرل گورنمنٹ سے کہا کہ یہ شخص میرے لیے بیکار ہے اس کو آپ بیشک واپس لے جائیں۔ وہاں سے میں پنڈی گیا۔ میرا تبادلہ انٹیلی جینس میں ہو گیا۔

کراچی میں ایک مہینہ قیام کے دوران میں نے جو بات محسوس کی اور اب میں سوچتا ہوں کہ بھٹو صاحب اگر کسی کے محسن تھے تو وہ دولتمند تھا آپ حیران ہوں گے کہ میں کیا بات کہہ رہا ہوں لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے زمینداروں پر احسان کیا ہے لیکن یہ طبقہ اتنا محسن کش ہے کہ اس کے باوجود اس نے بھٹو صاحب کی جان لی۔ روٹی، کپڑے اور مکان کا نعرہ بھٹو صاحب کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ ایوب خان کی ذات میں سب سے نمایاں چیز یہ تھی کہ انہیں پیسے سے بڑی محبت تھی انہوں نے سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی دے دی اور خود بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے اور انہی کے دور حکومت میں 22 خاندان

مشہور ہوئے۔ مطلب یہ کہ ایوب خان کے دور میں امیر اور غریب کا فرق اتنا بڑھ گیا کہ لوگ بغاوت پر اتر آئے اور 22 خاندانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرا۔ بھٹو صاحب ذہین سیاستدان تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سماجی انصاف کی بہت ضرورت ہے جذبہ موجود تھا بھٹو صاحب کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اس جذبے کو پہچانا اور اس کو سیاسی شکل دی اور اس کو استعمال کیا اور اسی نعرے کی وجہ سے اقتدار میں آئے جب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے تو المیہ مشرقی پاکستان کی وجہ سے ایک تو جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں کے خلاف بڑی نفرت تھی آپ کو شاید یاد ہو کہ یحییٰ خان کے آخری دنوں میں، بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے سے پہلے غریب آدمی اگر ٹیکسی ڈرائیور ہے تو وہ سمجھتا تھا کہ ٹیکسی مالک کی نہیں اس کی ہے نوکر سمجھتے تھے کہ جس مکان میں مالک رہتے ہیں وہ ان کا ہے لوگوں نے چیزیں تک مارک کر لی تھیں کہ جب حکومت بدلے گی تو ہم فلاں فلاں چیز پر قبضہ کریں گے اگر بھٹو صاحب اس وقت ملک میں سوشلزم یا کمیونزم یا سماجی معاشی انقلاب لانا چاہتے تو ان کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ سرمایہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا اس ملک میں نام ونشان نہ رہتا۔ سماجی انقلاب آسان چیز تو نہیں ہوتی اس میں ایسا ہوتا ہے کہ نا معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اگر کسی شخص نے اس انقلاب کا راستہ روکا یا یہ کہ اس انقلاب کو ایک بہت ہی ہلکا سا دھارا بنایا تو وہ بھٹو صاحب کی ذات تھی اور انہوں نے اس طرح کیا کہ سب سے پہلے جس آدمی کو انہوں نے پکڑا اور سزا دی وہ مختار رانا تھا جو ان کی اپنی پارٹی کا تھا کراچی میں مزدوروں پر فائرنگ ہوئی میرا خیال ہے کہ جتنے مزدور اس فائرنگ میں مرے اس سے پہلے کراچی کا اتنا ریکارڈ نہیں تھا یہ جو سختی کی یہ صرف اس لیے کی کہ وہ انقلاب کہیں سیلاب کی صورت اختیار نہ کر لے اس طرح سے جو زرعی اصلاحات تھیں ان میں بھی بنیادی طور سے کوئی صورت حال تبدیل نہیں ہوئی جو بڑے بڑے زمیندار تھے وہ بڑے بڑے زمیندار ہی رہے اب بھی ہیں یہ صحیح ہے کہ انہوں نے بہت ساری صنعتوں کو بنکوں کو اور انشورنس کمپنیوں کو نیشنلائز کیا لیکن جو انقلاب آ سکتا تھا جس کا کہ امکان تھا جس کے لیے میدان بالکل تیار تھا وہ انقلاب تو نہیں آیا اور وہ جو سرمایہ دار تھے وہ کسی نہ کسی صورت میں بچ گئے اور مفاد پرست عناصر اس ملک میں رہا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان سرمایہ داروں کو اور بڑے بڑے زمینداروں کو بھٹو صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس سیلاب کا راستہ روکا لیکن یہ ضرور ہے کہ بھٹو صاحب نے اس کے ساتھ ساتھ غریبوں کو زبان بھی دی ان کو خودداری بھی دی۔ ان کو عزت نفس بھی دی اور انہوں نے پہلی دفعہ غریبوں کو یہ محسوس کرایا کہ اس ملک میں ان کا بھی حصہ ہے جو مزدوری کرتے ہیں صحیح معاوضہ ان کا حق ہے جو مزارع ہیں ٹھیک ہے ان کی زمینیں نہیں ہیں لیکن ان کو بھی اس میں حق ہے ان کو بھی مکان بنانے کا حق ہے چنانچہ

انہوں نے مزارع کے لیے پانچ پانچ مرلہ کی سکیم بنائی تا کہ وہ پہلی دفعہ اپنے گھر کے مالک ہوں انہوں نے اپنی کتاب ''اگر میں قتل کر دیا جاؤں'' میں لکھا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ سوشل جسٹس (سماجی انصاف) بغیر انقلاب کے بھی ممکن ہے اور اس کی انہوں نے کوشش کی لیکن سرمایہ داروں نے بھٹو صاحب کی اس بات کو معاف نہیں کیا کہ مزدوران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہہ سکیں۔ معاوضہ دو اور صحیح دو کیونکہ یہ ہمارا حق ہے یا مزارع زمیندار کے برابر آ کے بیٹھ جائے تو انہوں نے بھٹو صاحب کی اس بات کو معاف نہیں کیا۔ بالآخر اس بات کی سزا انہوں نے بھٹو صاحب کو دی کہ انہیں پھانسی لگوا دی۔ یہ سرمایہ داروں، بڑے بڑے زمینداروں، تاجر طبقے اور مذہبی لوگوں نے کیا۔ یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں تھا بلکہ ایک بڑی گہری سازش تھی۔

❖

پاکستان میں ایجنسیوں کا کردار

فروری 73ء کی بات ہے میں سرکاری دورے پر کابل گیا ہوا تھا اس وقت سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ (ایس پی ای) ہوتی تھی مجھے وہیں اطلاع ملی کہ آپ کو اس کا سربراہ لگایا گیا ہے۔ سردیوں کے دن تھے کابل میں ان دنوں بڑی زبردست برفباری ہوئی پھر بھی میں نے وہاں کافی چل پھر کے دیکھا۔ لوگوں سے میل ملاپ بھی کیا وہاں کی جو ہوا تھی اس کو محسوس کیا مجھے ایک فائدہ یہ تھا چونکہ میں انٹیلی جنیس میں رہا تھا اور کابل کی سیاست اور حالات بھی میرے ذمہ تھے اس وقت میں نے ان حالات وغیرہ کو کافی سٹڈی کیا پھر جب میں پشاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنیس تھا تو اپنی عادت کے باعث میں نے پٹھانوں کی تاریخ اس علاقے کی تاریخ جغرافیے۔ ثقافت رسم و رواج وغیرہ کا کافی مطالعہ کیا اس کے علاوہ کابل کے متعلق اخبارات سے بھی معلومات ملتی تھیں اپنے لوگ جو وہاں جاتے تھے ان سے کافی تعلق تھا۔

کابل سے واپسی پر اپنا چارج دینے سے پہلے کہ وہاں کے حالات کی رپورٹ دی۔ یہ فروری 73ء کی بات ہے اس رپورٹ کے آخر میں میں نے ایک نوٹ لکھا۔ ”بظاہر وہاں حالات بالکل پرامن ہیں کوئی سیاسی یا معاشی تحریک نظر نہیں آتی حالات بالکل نارمل دکھائی دیتے ہیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ افغانستان کی ہوا میں کوئی تبدیلی ہے اور بادشاہت جو اس وقت بڑی مضبوط نظر آتی ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس کا تختہ الٹ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر نیشنلسٹ عنصر جو تشدد پسند ہے وہ اقتدار میں آ جائے گا اس کے ساتھ ہماری بات چیت اور زیادہ مشکل ہو جائے گی اس لیے کہ وہ اندرونی حالات کو ٹھیک نہیں کر سکیں گے پھر وہ اپنے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے پاکستان کے خلاف زیادہ شور مچائیں گے اس لیے افغانستان کے ساتھ تعلقات صحیح سطح پر لانے کے لیے پاکستان کے پاس وقت بہت کم ہے وقت کا پوری طرح سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

میرا تو تبادلہ ہو چکا تھا میں نے نوٹ لکھا اور نیا چارج سنبھال لیا وہ نوٹ فارن آفس میں گیا نہ

انٹیلی جینس کے محکمے میں کسی نے اس طرف توجہ دی۔ انٹیلی جینس کا اصل کام یہ ہے کہ آئندہ آنے والے واقعات پر نظر رکھے وہ وہاں کوئی نہیں کرتا۔ ساری بھاگ دوڑ اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ موجودہ حکومت کے خلاف کیا سازشیں ہو رہی ہیں اس کے مخالفین پر کس طرح نظر رکھی جائے۔ ان کو کس طرح سے دبایا جائے۔

ایک روز میں نے اچانک اخبار میں دیکھا کہ سردار داؤد نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا ہے۔ اس پر گورنمنٹ کی طرف سے انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ پر بڑی لعن طعن ہوئی کہ کسی نے بتایا نہیں کہ یہ ہونے والا ہے۔ یہ کیسا انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ ہے کہ ہمارے پڑوس میں اتنے اہم واقعات ہو جاتے ہیں اور ہمیں پتہ نہیں ہوتا ہمیں اخباروں کے ذریعے پتہ چلتا ہے چنانچہ پھر بھاگ دوڑ ہوئی کوئی ڈائری ہو کوئی نوٹ ہو اس پر میں نے بتایا کہ فروری میں میں نے نوٹ لکھا تھا اور اس میں میں نے نشاندہی کی تھی اس میں میں نے وقت تو نہیں بتایا تھا کہ ایسا فلاں وقت ہوگا اور فلاں آدمی کرے گا جو چیز میں نے محسوس کی اس پر مزید توجہ دی جا سکتی تھی پھر وہ نوٹ نکالا گیا ہمارے انٹیلی جینس کے محکمے نے بڑے فخر سے کہا کہ ہم نے تو اتنے مہینے پہلے آپ کو بتا دیا تھا آپ ہی نے کچھ نہیں کیا وہ نوٹ جو فائلوں میں کہیں پڑا تھا اچانک بڑا اہم ہو گیا اور ہمارے محکمے کے بڑا کام آیا کہ ہم نے تو بتا دیا تھا آپ ہی نے کچھ نہیں کیا۔ ہمارے ہاں ایسے بڑے لطیفے ہوتے ہیں مثلاً لوگوں میں یہ عام خیال ہے کہ ہر آدمی کے پیچھے انٹیلی جینس لگی ہوئی ہے۔ لوگ کمرے کے اندر بیٹھ کے بھی بات کرتے ہیں تو ضیاء الحق کو پتہ چل جاتا ہے اسی طرح بھٹو صاحب کو پتہ چل جاتا تھا اسی طرح ایوب خان کو پتہ چل جاتا تھا یہ سب افسانوی باتیں ہیں جو لوگ جانتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ ہماری انٹیلی جینس میں کتنی زیادہ غیر مستعدی ہے۔ ان کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ دایاں ہاتھ یا بایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر گورنمنٹ نے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ مخالفوں پر توجہ رکھی جائے ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا جائے اور ان کو ہراساں کیا جائے تو ساری انٹیلی جینس گورنمنٹ کے مخالفوں کے پیچھے لگی رہی ہے۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر لیں گے کہ ہماری انٹیلی جینس کتنی مستعد ہے جب میں انگلینڈ میں تھا 68ء میں ایوب خان وہاں آ رہے تھے۔ پاکستان سٹوڈنٹس نے جن میں ویسٹ پاکستانی بھی تھے زیادہ تعداد بنگالیوں کی تھی انہوں نے ایک چھوٹا سا پمفلٹ نکالا اس کا عنوان تھا Black Book on the Misdeeds and Sins of Ayub Khan (ایوب خان کی بداعمالیوں اور گناہوں کی سیاہ کتاب)

میں نے وہ پمفلٹ لیا اور یہاں بھیج دیا کہ لندن میں طلبہ نے پریذیڈنٹ کے خلاف ایجی

ٹیشن کی ہوئی ہے اور یہ پمفلٹ تقسیم کیا ہے بات آئی گئی ہوگئی کوئی پندرہ دن بعد میرے ہیڈ آفس سے مجھے چھٹی آئی سنا ہے کہ اس قسم کی کوئی بلیک بک تقسیم ہوئی تھی آپ مہربانی کر کے اس کی کاپی ہمیں بھیج دیں میں نے فی الفور اس کی ایک اور کاپی بھیج دی اور لکھا کہ جس روز مظاہرہ ہوا تھا میں نے اس کی کاپی آپ کو اپنے فلاں فلاں نوٹ کے ساتھ بھجوائی تھی چونکہ آپ ایک اور کاپی منگوا رہے ہیں وہ میں بھجوا رہا ہوں مطلب یہ کہ جو پہلا نوٹ اور پمفلٹ میں نے بھیجا تھا اس کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا پندرہ دن گزرے تھے کہ ایک اور چٹھی آگئی کہ فارن آفس نے ہمیں بتایا ہے کہ اس قسم کی کتاب وہاں تقسیم ہوئی تھی آپ اس کی ایک کاپی بھیجیں میں نے انہیں لکھا کہ میں فلاں فلاح تاریخ کو فلاں فلاں نوٹ کے ساتھ پہلے بھی دو کاپیاں بھجوا چکا ہوں اب تیسری کاپی بھی بھجوا رہا ہوں دو مہینے بعد بعد پھر ایک اور چٹھی آگئی۔ I.S.I نے ہمیں بتایا ہے کہ اس طرح سے کوئی کتاب تقسیم ہوئی ہے اس پر مجھے بڑا غصہ آیا اصل میں انٹیلی جینس کا ایک اصول ہے کہ وہاں جو مختلف سیکشن ہوتے ہیں ایک سیکشن کو دوسرے سیکشن کا پتہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے تا کہ بات باہر نہ نکلے۔ جس کا کام ہو اس کو وہ انفارمیشن ملے اصول یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو پتہ نہ ہو کہ بایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے میں نے انہیں لکھا کہ آپ نے یہ اصول اتنا اچھا اپنایا ہے کہ آپ کے دائیں ہاتھ کو بھی یہ پتہ نہیں کہ وہ خود کیا کر رہا ہے یہ کتاب میں آپ کو تین دفعہ بھیج چکا ہوں ہر بار آپ یہی لکھتے ہیں کہ فلاں سے سنا ہے فلاں نے بتایا ہے۔

اسی طرح بھٹو صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ 65ء کی جنگ میں پاکستان کو سب سے بڑا خطرہ ہندوستان کی آرمرڈ ڈویژن سے تھا ہماری انٹیلی جینس آخر وقت تک یہ پتہ نہ کر سکی کہ وہ آرمرڈ ڈویژن کس سیکٹر میں ہے اور کہاں سے انہوں نے حملہ کرنا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان کا D.R موٹر سائیکل پر گزر رہا تھا۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا اس کے بیگ سے پتہ چلا کہ ہندوستان نے آرمرڈ ڈویژن سیالکوٹ کے چونڈہ سیکٹر میں جمع کی ہوئی ہے۔ ہماری آئی ایس آئی فوجی انٹیلی جینس کا محکمہ ہے۔ بنیادی طور پر اس کا کام یہ ہے کہ دشمن کی فوجوں سے پاکستان کو جو خطرہ ہے اس کے متعلق معلومات رکھے۔ ساری انرجی سارا پیسہ اس پر خرچ کرے لیکن ایوب خان کے زمانے سے اس کا رول یہ ہوگیا کہ سول انٹیلی جینس سے بھی زیادہ ان کی توجہ اندرونی سیاست اور سیاستدانوں پر مرکوز ہوگئی اس میں میں بھٹو صاحب کو بھی قصوروار سمجھوں گا کہ انہوں نے اس سسٹم کو بدلنے کی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے انہیں سب سے زیادہ قربانی دینا پڑی نہ صرف یہ کہ کوشش نہیں کی بلکہ ان کو اندرونی کام کے لیے اور زیادہ وسائل دیئے یہاں تک کہ انہوں نے سول انٹیلی جینس پر بھروسہ نہیں کیا پھر یہ کہ جنرل جیلانی واحد آدمی تھے جنہیں بھٹو صاحب نے تبدیل نہ کیا جو یحییٰ خان کے زمانے سے ہی بڑے کلیدی عہدوں پر رہے نہ صرف یہ کہ ان کو ڈسٹرب نہیں

کیا بلکہ ان کو پروموشن بھی دی پھر بھٹو صاحب ختم ہو گئے جیلانی صاحب وہیں اپنے عہدے پر قائم رہے بلکہ ان کو ترقی ملی بہر حال اس کی وجوہ اور ہیں۔

سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ (S.P.E) ایک طرح سے انٹی کرپشن ایجنسی تھی بھٹو صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو ایف ای آئی کے خطوط پر استوار کیا جائے میرے پہنچنے سے پہلے سکیمیں وغیرہ بن گئیں تھیں میں نے جا کے سکیم کو مکمل کیا بجٹ وغیرہ اور اس کی تنظیم کتنی شاخیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ اس کا نام تبدیل کیا جائے کئی نام تجویز ہوئے۔ بھٹو صاحب نے ایف آئی اے پسند کیا فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی میری یہ تجویز تھی کہ ملک میں انکم ٹیکس، کسٹمز اور ایکسائز کا روپیہ لوگ مل ملا کے رشوت دے کے بچا لیتے ہیں۔ لاکھ خرچ کیا کروڑ بچا لیا میرا خیال یہ تھا کہ اگر ہم اسے صحیح طور سے منظم کریں تو اس سے نہ صرف خرچہ نکل آئے گا بلکہ حکومتی خزانے میں کروڑوں روپیہ آ سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ کسی ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں وہ آخر کار انسانوں ہی کے ذریعے حاصل کرنا ہوتے ہیں اور جو سٹاف ہمیں ملتا ہے ظاہر ہے اس کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں اس لیے جس طرح اور محکموں میں رشوت ہے مجھے خدشہ تھا کہ وہی رشوت ایف آئی اے میں شروع ہو جائے گی اگر اس پر کنٹرول نہ کیا گیا تو یہ رشوت کا ایک سپر ادارہ بن سکتی ہے چوروں کو پڑ گئے مور والی بات ہو گی۔ لوگ رشوت لیں گے ان سے پھر ایف آئی اے والے رشوت لیں گے میرا خیال یہ تھا کہ اس پر سخت کنٹرول نہیں رکھا جائے گا تو یہ لوگوں کو ہراساں کرنے کا ایک اور ذریعہ بن سکتی ہے بہر حال میں ایف آئی اے کی اوائل عمر میں اس کے ساتھ منسوب رہا مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایجنسی لوگوں کی بعد میں توقعات پر پوری اتری کہ نہیں اتری۔

ایک تو سعید احمد خاں کی شخصیت تھی۔ بھٹو صاحب نے شروع میں چارج لینے کے تین چار مہینے کے بعد ہی سعید احمد خاں کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا ہر شخص نے بھنویں چڑھائی کہ یہ کیسے ہو گیا اس لیے کہ سعید احمد خاں کی پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے کبھی بھی اچھی ریپوٹیشن نہیں رہی تھی بہر حال جب وہ اس جگہ پر لگ گئے پھر انہوں نے پر پُرزے نکالنے شروع کیے۔ پرائم منسٹر ہاؤس ایک ایسی جگہ ہے کہ وہاں کا چپڑاسی بھی اگر چاہے تو بھٹو صاحب کا نام لے کے بہت فائدے اٹھا سکتا تھا۔ وہاں سے ٹیلی فون کرتے ہیں جی میں پرائم منسٹر ہاؤس سے بول رہا ہوں کوئی بڑا آدمی بھی ہوتا تو وہ بھی سننے پر مجبور ہو جاتا تھا اگر کوئی ہوشیار آدمی ہے، بے ضمیر آدمی ہے بے اصول آدمی ہے پھر تو وہ اس کا بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے سعید احمد خاں کی عادت تھی کہ ادھر کی بات سن لی ادھر کی بات سن لی ایک رپورٹ بھٹو صاحب کو بھیج دی عام طور سے جو رپورٹیں ہوتی تھیں وہ کسی نہ کسی کی چغلی ہوتی تھی کہ فلاں یہ کر رہا ہے فلاں وہ کر رہا ہے چنانچہ

انہوں نے اپنا عمل دخل انٹیلی جنیس میں ایف آئی اے میں ایس پی ای میں سارے محکموں میں شروع کر دیا۔ سعید احمد کسی کو ٹیلی فون کر دیتے تھے کہ میں پرائم منسٹر ہاؤس سے بول رہا ہوں بس جناب لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

جب میں ایس پی ای میں گیا مجھ سے پہلے چودھری فضل حق تھے ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا دیکھو میاں! تم یہاں آ تو گئے ہو سعید احمد خاں سے اپنے مراسم اچھے رکھنا بس پھر کوئی فکر کی بات نہیں میں نے ان کا مشورہ سن لیا ان کا اپنا طریق کار تھا۔ میں نے بھی دیکھا کہ ان کا زیادہ تر وقت پرائم منسٹر ہاؤس میں گزرتا تھا سعید احمد خاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور سعید احمد خاں صاحب حکم جاری کر رہے ہیں فلاں انکوائری ہے اس کو پکڑو۔ اس کو چھوڑ دو میں نے دیکھا کہ سارے کا سارا کام سعید احمد خاں کا دیا ہوا تھا۔ ان کی رپورٹوں پر لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے پھر یہاں تک ہو گیا اور انہوں نے اپنا طریق کار یہ بنا لیا یعنی جس کو پولیس میں طریقہ واردات کہتے ہیں۔ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ ایک چھوٹا سا نوٹ لکھ کر وہ بھٹو صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ فلاں فلاں آدمی آپ کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہا ہے اس کے خلاف ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ بھٹو صاحب نے 'یس' کر دیا یا دستخط کر دیئے سعید احمد خاں نے ٹیلی فون پکڑا اور کسی آئی جی کو ایس پی ای کے کسی آدمی کو انہوں نے حکم دیا کہ فلاں آدمی کے خلاف یہ شکایت ہے انکم ٹیکس کی فارن ایکسچینج کی کوئی نہ کوئی بات منسوب کر کے اس کے خلاف کارروائی شروع ہو جاتی اس آدمی کی پکڑ دھکڑ ہوتی۔ ظاہر ہے کہ وہ پوچھتا کس نے اس کی شکایت کی ہے اسے جواب ملتا سعید احمد خاں نے وہ سعید احمد خاں کے پاس پہنچتا جناب سعید احمد خاں پہلے سے تیار ہوتے تھے سودے بازی کرتے کہ اتنا دے دو، آپ کے خلاف کارروائی نہیں ہوگی چنانچہ سعید احمد خاں ایک لاکھ دو لاکھ تین لاکھ، جتنے پر بھی سودا ہوتا وہ بتاتے اور کہتے اس کی انکوائری ختم کر دو یہ تھا ان کا طریقہ واردات تھا۔

تو جب میں ایس پی ای میں گیا ہوں تو میں نے دیکھا کہ زیادہ کام سعید احمد خاں کا دیا ہوا ہے کراچی گئے تو ایس پی ای کے افسران کو بلا کے انکوائری ان کے سپرد کر دی لاہور آئے یہاں کی انکوائری ان کے سپرد کر دی لیکن ایس پی ای کا جو بنیادی کام تھا وہ نہیں ہو رہا تھا تو جب میں نے محسوس کیا کہ بدنامی تو ہماری ہوتی ہے پکڑ دھکڑ ہم کرتے ہیں پیسے سعید احمد خاں بناتا ہے۔ آئی جی میں ہوں یہ میری ذمہ داری ہے کہ کام ٹھیک ہو جو غلط کام ہوگا اس کا حرف مجھ پر آئے گا ایک آدمی وہاں بیٹھا ہوا ہے، جس کی کوئی ذمہ داری نہیں جو ایس پی ای کے اچھے برے کا ذمہ دار نہیں وہ اس کو غلط استعمال کر رہا ہے اور لاکھوں روپے بنا رہا ہے۔ قیوم خان وزیر داخلہ تھے وہی ایس پی ای کے انچارج تھے چنانچہ میں نے ان سے بات کی کہ میں

نے یہاں نیا سلسلہ دیکھا ہے کہ ہماری ساری محنت سعید احمد خاں کے آگے پیچھے بھاگنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ وہ پرائم منسٹر ہاؤس کا ایک لیٹر ہیڈ لے کے اس پر آرڈر لکھتے ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بھٹو صاحب کا حکم ہے اور پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے سارے ہی بڑے بڑے بزنس مین ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ اس نے لوگوں سے پیسے لیے ہیں اگر کسی نے نہیں دیے تو اس کو ڈی پی آر کے تحت جیل میں ڈال دیا پتہ نہیں لوگوں کے خلاف یہ کیا کیا کرتا ہے۔ قیوم خان صاحب نے پوچھا اچھا پھر کیا کریں میں نے کہا سعید احمد خاں صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ انکوائری کے لیے آپ ہمیں لکھیں بھٹو صاحب آپ کو لکھیں یہ تو ایک آدمی نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اس میں اڑائی ہوئی ہے۔ قیوم خان بڑے سمجھ دار آدمی تھے عمر رسیدہ تھے لیکن ذہنی طور سے وہ بڑے الرٹ تھے فوراً بات کو سمجھتے تھے میں نے وزیروں میں قیوم خان کا سا صاف ذہن آدمی نہیں دیکھا کہ فوراً بات کو سمجھ جاتے تھے اور فوری طور سے کارروائی کرتے تھے اس لیے کہ انہیں ایڈمنسٹریشن کا تجربہ تھا وہ بنیادی طور پر بہت ذہین آدمی تھے اور موثر آدمی تھے۔ ان میں بھی خرابیاں ہوں گی لیکن جہاں تک ایڈمنسٹریشن کا تعلق ہے وہ فوری طور پر بات کو سمجھتے تھے پھر فوری طور سے کارروائی کرتے تھے چنانچہ انہوں نے مجھے کہا نوٹ لکھو کہ کتنی انکوائریاں سعید احمد خاں نے کیں اور کس کے خلاف کرائیں چنانچہ میں نے ایک نوٹ بنا کے دیا جسے وہ لے کے بھٹو صاحب کے پاس پہنچ گئے اور انہیں کہا کہ یہ آدمی آپ نے بٹھایا ہوا ہے اس کا کام کیا ہے اگر اس نے اس طرح کرنا ہے تو پھر رہنے دیں کسی کو آئی جی لگانے کی ضرورت نہیں اس کی یہ بھی شکایت ہے کہ یہ آپ کے نام پر پیسے کماتا ہے یہ سن کر بھٹو صاحب کو بڑا غصہ آیا انہوں نے حکم دے دیا کہ سعید احمد خاں براہ راست کسی محکمے سے بات چیت نہیں کرے گا یا چٹھی نہیں لکھے گا اگر اس کو کسی انفارمیشن کی ضرورت ہے تو وہ وقار احمد کو لکھے اور وقار احمد آگے اس محکمے کو لکھے مطلب یہ تھا کہ اس کا براہ راست تعلق ختم کیا جائے اور اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں لیکن سعید احمد خاں بھی بڑا ڈھیٹ آدمی تھا وہ تو ایسی چیز ہی نہیں کہ اس کو شرم آ جائے اس کو پتہ چلا کہ یہ راؤ رشید نے کیا ہے اس نے میرے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی لیکن میں نے کم از کم اپنا محکمہ سعید احمد خاں کو غلط استعمال کرنے نہیں دیا لیکن اس کی حرکتیں یہ رہیں کہ کراچی گیا تو میرے کسی ڈی آئی جی کو بلا لیا اور زبانی زبانی اس سے بات کی یہ چیز اس نے جاری رکھی چوری چوری لیکن اس کے بعد مجھ سے اس نے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ بہر حال اس کی شکائتیں بڑی تھیں اور رہیں۔

ایک اور واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے میرا ایک دوست تھا وہ یحییٰ خان کا بھی دوست تھا بھٹو صاحب کے برسر اقتدار آتے ہی زیر عتاب آ گیا تھا۔ وہ میرے گھر پر مجھے ملنے کے لیے آیا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو اس نے بریف کیس کھول کر دکھایا۔ وہ نوٹوں سے بھرا

ہوا تھا کہنے لگا ''یہ میں سعید احمد خاں کے پاس لے جا رہا ہوں اور یہ دوسری قسط ہے جو میں اس کو دے رہا ہوں۔ اس حرامزادے نے میرے خلاف انکوائری شروع کر دی ہے وہ وعدہ تو کرتا ہے کہ ختم کر دوں گا لیکن ختم نہیں ہوئی ہے اب کہتا ہے میری لڑکی کی شادی ہے پیسے چاہئیں۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے یہ تو پھر تمہارا اپنا معاملہ ہے کہ تم سمجھتے ہو ایسا کرنا چاہیے وہ کہنے لگا اگر میں ایسا نہ کروں تو وہ اور جھوٹی سچی شکایت پرائم منسٹر سے کرے گا۔

اس کے خلاف اور بھی اس قسم کی بڑی شکائتیں تھیں اور بھی بہت سے لوگوں سے اس نے پیسہ بنایا۔

اسی دوران میں نے دیکھا کہ دس دس بارہ بارہ' پندرہ پندرہ سال پرانی انکوائریاں ہمارے دفتر میں پڑی ہوئی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں۔ ہمارے دفتروں میں ایک بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی ہو تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح ضائع کرے وہاں انبار کے انبار لگتے رہتے ہیں کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان کاغذوں کو دیکھ کے جو نہایت ضروری ہیں ان کو رکھ لے اس لیے کہ کوئی یہ ذمہ داری نہیں لینا چاہتا چنانچہ افسر بدلتے رہتے ہیں محکمے بدلتے رہتے ہیں محکمے کے سربراہ بدلتے رہتے ہیں لیکن جو کاغذ ایک دفعہ وہاں پہنچ گیا وہ پھر پیچھا نہیں چھوڑتا میں نے قیوم خان صاحب سے کہا کہ پندرہ سال پہلے کوئی درخواست آئی ہے نہ وہ انسان رہا نہ وہ حالات رہے لیکن وہ انکوائری ہماری جان نہیں چھوڑتی کہنے لگے کیا کریں میں نے کہا یہ کرتے ہیں سب انکوائریز کو دوبارہ دیکھتے ہیں کہ آیا وہ ضروری ہیں یا غیر ضروری ہیں جو غیر ضروری ہیں انہیں داخل دفتر کر دیتے ہیں کہنے لگے آپ کی تجویز ٹھیک ہے لیکن اس میں خطرہ یہ ہے افسران اس آدمی کے پاس پہنچ جائیں گے کہ ہم تمہاری انکوائری ختم کر رہے ہیں پیسے لاؤ اس پر ہم نے یہ کیا کہ جو انکوائریاں تین سال سے پرانی تھیں ان سب کو جمع کر کے ہیڈ کوارٹر میں جائزہ لیا اس میں ستر فیصد بیکار تھیں ان کو ہم نے داخل دفتر کر دیا تاکہ لوگوں کی جان چھوٹے انکوائری میں کچھ ہوتا بھی نہیں ہے اور نام انکوائری ہوتا ہے اس سے پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔'' کہ کوئی افسر کہے کہ جی میرے پاس اتنے کیس ہیں'' ...... ''میرے پاس جی اتنی انکوائریاں ہیں'' پتہ لگا کہ یہ فضول سی بات تھی۔

اگر قیوم خان کے علاوہ اور کوئی منسٹر ہوتا تو وہ اس بات پر توجہ نہ دیتا نہ اس کی اہمیت کو سمجھتا نہ ذمہ داری لیتا لیکن انہوں نے ایک بات کو سمجھ کے غور کر کے کہا ٹھیک ہے کر دو تاکہ پچھلا جو گند ہے وہ نکلے اور آئندہ کے لیے لوگ تیاری کر سکیں۔ خان عبدالقیوم خان آدمی بہت قابل بڑے سمجھدار اور پڑھے لکھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

لیکن انکی مجبوری یہ تھی کہ وہ سیاستدان تھے اور سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ان کے بے

شمار روابط تھے۔ تعلقات تھے ہمارے سیاستدانوں کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اجتماعی مطالبے کبھی نہیں کرتے ان کے سارے مطالبات انفرادی ہوتے ہیں ان کے سارے مسائل بھی انفرادی ہوتے ہیں فلاں کا چاچا آ گیا فلاں کا ماما آ گیا قیوم خان صاحب کی بڑی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خوش کریں مطلب یہ کہ ان کی فیور کریں احسان چڑھائیں مقصد یہ کہ ایف آئی اے بن رہی ہے بڑی جگہیں ہوں گی اپنے لوگوں کو بھرتی کریں گے چنانچہ ان کی طرف سے مطالبہ آنا شروع ہو گیا کسی کو اے ایس آئی لے لیں کسی کو سب انسپکٹر لے لیں جو کام بغیر کسی سسٹم کے کیا جائے اس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے میں نے کہا میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا یا تو آپ اپوائنٹ کریں تاکہ میری ذمہ داری نہ رہے لیکن یہ نہیں کہ آپ کے زبانی کہنے پر میں کسی کو اپوائنٹ کروں اس سے میں نے محسوس کیا کہ ہمارے تعلقات میں کھچاؤ سا آ گیا ہے۔ تعلقات خوشگوار نہیں رہے لیکن پرواہ میں نے بھی نہیں کی۔

مرزا شمس الحسن ان کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا اس سے خان صاحب کے بڑے پرانے تعلقات تھے۔ اس آدمی کی شہرت بڑی خراب تھی وہ پیسے ویسے کمایا کرتا تھا قیوم خان صاحب خود تو بڑے ایماندار تھے لیکن اس آدمی کے کوئی معیار نہیں تھے۔ اس کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح سے فلاں کی سفارش ہو جائے شمس الحسن ہو یا کوئی اور ہو میں نے کسی کی سفارش نہیں مانی لیکن آپ حیران ہوں گے میں نے وہاں ایک سال گزارا تو بھٹو صاحب نے کہا کہ اس کو ہم پنجاب میں آئی جی بنا کے بھیج رہے ہیں قیوم خان صاحب نے سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ بڑا اچھا کام کر رہا ہے اس کو صرف ایک سال ہی ہوا ہے اس نے ایک بڑا اچھا کام شروع کیا ہوا ہے اب آپ اس کو ڈسٹرب کریں گے۔ ایف آئی اے نئی نئی آرگنائزیشن بن رہی ہے اس کے کام میں بھی رکاوٹ پڑے گی آپ مہربانی کر کے اس کو نہ بھیجیں' یہ پنجاب جا کے خراب ہو گا' کیوں آپ اچھے افسر کو خراب کرتے ہیں بہرحال بھٹو صاحب نے کہا کہ نہیں ہمیں یہ چاہیے' چنانچہ فیصلہ ہو گیا تو پھر خان قیوم خان صاجب نے مجھے چٹھی لکھی جسے میں پڑھ کے حیران رہ گیا میرا خیال تھا کہ میں نے ان کی سفارش نہیں مانی ان کے کام نہیں کیے وہ میرے خلاف ہوں گے لیکن چٹھی پڑھ کے میں حیران رہ گیا اس میں انہوں نے مجھے لکھا کہ آپ نے ایک سال میں جو گند ایف آئی اے سے نکالا ہے اور جس طرح سے کام کیا ہے وہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے جانے کے بعد F.I.A کا کیا بنے گا چونکہ مجبوری ہے میں نے بڑی مشکل سے اپنی رضامندی دی ہے کہ تمہاری ٹرانسفر ہو جائے۔

اس سے انسان کی دانش مندی کا پتہ چلتا ہے ٹھیک ہے میں نے ان کے کام نہیں کیے تھے لیکن انہیں یہ خیال ضرور تھا کہ اس نے ذاتی پسند یا ناپسند کی بجائے اصول پرستی کی ہے انصاف پسندی کی ہے اور

جرات سے کی ہے اس لیے بجائے اس کے کہ میری عزت ان کے دل میں گھٹتی' وہ اور زیادہ بڑھی یہی سبق اگر ہمارے لوگ سیکھ لیں خاص طور سے سرکاری افسر کہ صحیح کام کرنے سے عزت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں وقتی طور پر اگرچہ اس سے تکلیفیں ہوتی ہیں لیکن اسے اپنانے سے میرا خیال ہے کہ ہمارے سسٹم کی بہت ساری خرابیاں دور ہو جائیں۔

بھٹو صاحب نے آتے ہی انٹیلی جنس بیورو کا چارج میاں انور علی صاحب کو دیا تو اس دوران ہم نے سنا کہ بھٹو صاحب نے سعید احمد خاں کو بھی پرائم منسٹر ہاؤس میں لگا دیا ہے ہمیں بھی اس بات پر بڑا تعجب ہوا تھا کہ سعید احمد خاں کہاں پہنچ گئے۔ بھٹو صاحب کی قربت میں کیونکہ ان کی ریپوٹیشن بڑی خراب تھی بہرحال سعید احمد خاں نے آتے ہی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور یہ رعب ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ بڑا پاٹے خاں افسر ہے اور سارے محکمے' خاص طور سے پولیس اور انٹیلی جنس' انہیں رپورٹ کیا کریں گے۔ اس پر میاں انور علی صاحب نے کوشش کی کہ مزاحمت کریں کہ انٹیلی جنس کا ریکارڈ باہر کا شخص اس طرح سے اپنے پاس نہ منگوائے۔ انہوں نے کہیں لکھ دیا' ہمیں معلوم نہیں وہ کون ہے' کس لیے منگواتا ہے' اس پر بھٹو صاحب بہت ناراض ہوئے انہوں نے کہا اس کو اپنا چیف سیکورٹی افسر میں نے لگایا ہے یہ سب کو پتہ ہونا چاہیے کہ جو چیزیں یہ مانگتا ہے وہ اس کو فوراً مہیا کی جائیں چنانچہ سب کو پتہ چل گیا کہ سعید احمد خاں بھٹو صاحب کے خاص اعتماد کا آدمی ہے اور بھٹو صاحب نے کسی مشن پر اس کو لگایا ہے بہرحال دنیا نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے آدمی کو ساتھ رکھنے قربت دینے کے کیا نتائج ہوتے ہیں اور بھٹو صاحب کو بالآخر اس کی سزا بھگتنا پڑی۔ میں ایس پی ای میں تھا کہ وقار صاحب نے مجھے کہا کہ سعید احمد خاں بڑا خطرناک آدمی ہے اس کو پرائم منسٹر ہاؤس سے نکالنا چاہیے ورنہ یہ بڑی بدنامی کرائے گا۔ پہلے ہی کافی بدنامی ہو چکی ہے میں نے کہا بات تو ٹھیک ہے اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے وقار احمد کہنے لگے کس کو وہاں ہونا چاہیے آدمی کوئی اعتبار کا ہو۔ مجھ سے کہنے لگے تم چلے جاؤ میں نے کہا میں وہاں بالکل نہیں جانا چاہتا میں ایک کیریئر افسر ہوں جبکہ یہ سیاسی پوسٹ ہے میری نوکری ابھی باقی ہے میں وہاں جا کے ملوث ہو جاؤں گا بھٹو صاحب کے ساتھ سیاست میں منتھی ہو جاؤں گا' میرا تو کیریئر ایسا نہیں رہا کہ میں کسی سیاست میں ملوث رہا ہوں یہ ذمہ داری کسی ریٹائر آدمی کو دے دیں اور میں نے دو چار نام تجویز بھی کیے لیکن بات بڑھی نہیں سعید احمد خاں وہاں جمے رہے میں 73ء میں ہی پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ جاتا لیکن بڑی مشکل سے بچا۔ میں اپنی ساری سروس کے دوران میں کسی سیاسی پارٹی یا کسی سیاسی لیڈر کے ساتھ کبھی وابستہ نہیں رہا یہ میرا ریکارڈ ہے اور نہ میں نے کبھی یہ کوشش کی کہ اپنی پوسٹنگ کے لیے یا اپنی ٹرانسفر کے لیے یا پروموشن کے لیے سفارش کراؤں میں نے اس کی کبھی کوشش نہیں کی۔

ہمارے ملک میں یہ فیشن ہے کہ آدمی کسی اہم جگہ پہنچ جائے اس کے پاس طاقت ہو تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ راہ و رسم ہوں میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا بھٹو صاحب نے پروموشن دی تھی کہ میں اور کچھ نہیں تو کبھی وقت لے کے ان کا شکریہ ادا کرتا جیسا کہ ہمارے ملک میں ایک روایت ہے کہ جناب بہت بہت شکریہ آپ نے بڑی مہربانی کی میرے بال بچے آپ کو دعائیں دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ طریقہ ہوتا ہے لیکن میں نے اس کی کوئی کوشش نہیں کی ایک سال تک میں ایف آئی اے میں رہا۔ میں بھٹو صاحب سے نہیں ملا اور نہ ملنے کی کوشش کی، ورنہ مشکل نہیں تھا' ظاہر ہے سرکاری طور سے میں بہت ساری چیزیں پڑھتا رہتا تھا مجھے وہ مارک کرتے تھے اس بہانے سے بھی میں راہ رسم پیدا کر سکتا تھا کہتے ہیں ۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

تقریبیں تو بہت تھیں لیکن میں نے کوشش نہیں کی اس لیے کہ میں نے پولیس سروس میں ہمیشہ اپنی محنت پر ہی اکتفا کیا۔ یہ کوشش نہیں کی کہ پل (Pull) یا پش (Push) سے کام لوں یا یہ کہ اپنی راہ سے ہٹ کے تعلق واسطہ رکھوں تا کہ میرے کیریر میں وہ مجھے امداد دے سکیں۔ خدا کا فضل تھا کہ اس کے باوجود مجھے اچھی جگہ ملتی رہی اور اپنے وقت پر میری پروموشن ہوتی رہی۔

ایوب خان کی کیبنٹ میں بھٹو سب سے نوعمر وزیر تھے۔ شروع شروع میں ان کا امیج کھلنڈروں کا سا تھا۔ اس لحاظ سے اخباروں میں ان کا ذکر اذکار سنتے رہتے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں راولپنڈی میں تعینات ہوا۔ یہ مئی 1963ء کی بات ہے' بطور ایس ایس پی راولپنڈی بڑی اہم پوسٹنگ تھی پہلے مجھے پریذیڈنٹ ایوب خان نے کال کیا اس کے بعد باقی جو اہم شخصیتیں تھیں ان سے ملا۔ بھٹو صاحب سے بھی ملا ان کی کوٹھی میری کوٹھی کے نزدیک تھی ان سے جب میں ملنے گیا تو باہر تشریف لائے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ رسمی سی ملاقات تھی پندرہ بیس منٹ بیٹھے ہوں گے میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پالشڈ اور کلچرڈ آدمی ہیں۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ میری یہ عادت بھی نہیں تھی کہ صرف ملاقات کے لیے لوگوں کے پاس جاؤں۔ ان کے ساتھ میرا شروع شروع میں رابطہ بھی نہیں تھا کیونکہ فارن منسٹر تھے۔ پنجاب کی سیاست اور داخلی معاملات میں ان کا عمل دخل نہیں تھا۔ سرکاری طور پر بھی اور نجی طور پر بھی ان سے کوئی خاص ملاقات نہیں رہی۔

64ء میں میرا تبادلہ انٹیلی جنس میں ہو گیا۔ ایک دفعہ میں کراچی دورے پر گیا بھٹو صاحب بھی کراچی سے راولپنڈی واپس جا رہے تھے' ائرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں جاتے ہوئے انہوں نے مجھے دیکھ لیا یہ میں ضرور کہوں گا کہ ان کی یادداشت بہت تیز تھی۔ اس پہلی ملاقات کو انہوں نے یاد رکھا اور

میری طرف بڑھ کے آئے اور پوچھا آپ کا کیا حال ہے' ٹھیک ٹھاک ہو' کہاں جا رہے ہو یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔

پنڈی کے بعد میں کراچی میں دو سال رہا۔ وہاں وہ آتے رہتے تھے۔ وہاں ہم ان کے قصے بھی سنتے رہتے تھے۔ نائٹ کلب میں جایا کرتے تھے مطلب یہ کہ ان کے بارے میں میری زیادہ واقفیت اخبارات کی خبریں تھیں یا وہ واقعات جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔

انہیں اپنی شخصیت پر بڑا اعتماد تھا یوں بھی وہ بہت ذہین آدمی تھے۔ اس کے علاوہ مجھے ان کے متعلق کوئی خاص تجسس نہیں ہوا۔

❖

آئی جی پولیس پنجاب

میں پنجاب کیسے آیا، بھٹو صاحب نے کھر صاحب کو ہٹا کے رامے صاحب کو چیف منسٹر بنایا تھا۔ صاحبزادہ رؤف علی یہاں آئی جی تھے' وہ میرے دوست تھے علی گڑھ میں بھی ہم ساتھ پڑھتے رہے۔ ساہیوال میں بھی ساتھ ساتھ لیکچرر رہے۔ ایک ساتھ مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ ہماری ٹریننگ بھی ایک ساتھ ہوئی ہماری پُرانی دوستی تھی کھر صاحب سے ان کا پُرانا تعلق تھا جب صاحبزادہ رؤف علی ملتان میں رہتے تھے۔ صاحبزادہ فاروق علی وہاں وکیل تھے' کھر صاحب اس وقت کچھ بھی نہیں تھے تاہم صاحبزادہ فاروق علی کے وہ بڑے دوست تھے اس وقت سے ان کے مراسم تھے۔ میرا خیال ہے اواخر 72ء کی بات ہے جب کھر صاحب نے انور آفریدی کی جگہ انہیں آئی جی لگایا تھا۔ رامے صاحب چیف منسٹر ہوئے تو ان کا خیال تھا کہ صاحبزادہ رؤف علی کھر کے آدمی ہیں حالانکہ مجھے پتہ ہے کہ اندرونی طور سے صاحبزادہ صاحب کو شکایت تھی کہ کھر صاحب کو جتنی انہیں سپورٹ دینی چاہیے تھی وہ ان کو نہیں ملی۔ بہر حال رامے صاحب اور رؤف علی صاحب مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑے مختلف تھے پھر ایک عجیب سا واقعہ ہوا کہ ان دونوں کا اکٹھے رہنا بڑا مشکل ہو گیا آپ نے سنا ہو گا کہ لبرا جیولرز کے دکان پر ڈاکہ پڑا تھا۔ لبرٹی میں' یہاں ایک ڈی ایس پی ہوتا تھا' چودھری محمد صادق پولیس کے محکمے میں جو ماتحت ہوتے ہیں۔ ایک لحاظ سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں بڑے کاریگر لوگ ہوتے ہیں بڑے مستعد ہوتے ہیں لیکن ہوتے بڑے بے اصولے کہ اپنے افسر کو غلط مشورہ دیں گے غلط راہ پر ڈال دیں گے۔ اس کیس کا انچارج چودھری صادق تھا۔ معلوم نہیں کس طرح سے اس کی تھیوری یہ تھی کہ یہ ڈاکہ راجہ منور کے بھائی راجہ غالب کے ایما پر ڈالا گیا ہے۔ یہ مجھے پتہ نہیں کہ سیاسی طور سے اس تھیوری میں کیا اینگل تھا' بہر حال' انہوں نے کہا کہ ڈاکہ ڈالنے والے آدمی راجہ غالب کی کوٹھی میں چھپے ہوئے ہیں' اس نے کچھ اس طرح سے یقین دلایا کہ وہ آدمی اس وقت بھی کوٹھی میں موجود ہیں' صاحبزادہ رؤف علی کو یہ رپورٹ ملی تو انہوں نے کہا

ٹھیک ہے اس کوٹھی کی تلاشی لو۔ راجہ غالب اور حنیف رامے کی بڑی دوستی تھی' اس لیے کہ ان کی بیویاں ہیں آپس میں یا تو رشتے دار یا بہت قریبی دوست رہی ہیں۔

چیف منسٹر بننے سے پہلے راجہ غالب اور رامے کافی عرصہ ایک ہی گھر میں رہے۔ بہر حال' راجہ غالب کی طرف سے رامے صاحب کو فون آیا کہ میرے گھر کی تلاشی ہو رہی ہے یہ حنیف رامے کے چیف منسٹر بننے کے فوراً بعد کی بات ہے یہ بڑا عجیب تھا کہ چیف منسٹر کے دوست ہوں اور ان کے گھر کی تلاشی ہو' رامے صاحب خود پہنچ گئے اور پوچھا کیا بات ہے پولیس نے بتایا کہ اس طرح سے لبرا جیولرز کے ڈاکہ پڑا ہے ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ ادھر چھپے ہوئے ہیں۔ رامے صاحب نے کہا' ٹھیک ہے میں بیٹھتا ہوں آپ تلاشی لیں اگر کوئی نہ نکلا تو پھر میں آپ سے سمجھوں گا وہاں کوئی نہیں تھا' رامے صاحب نے کہا کہ یہ صاحبزادہ رؤف علی کھر کا آدمی ہے۔ مجھے فیل کرنا چاہتا ہے میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا ویسے بھی ہر چیف منسٹر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا آدمی رکھے میں نے رامے صاحب کا نام ہی سنا تھا ان سے کبھی کوئی واقفیت نہیں رہی تھی۔ ان کے ایک انفارمیشن آفیسر اعظم خلیل میرے پاس راولپنڈی پہنچے اور کہا کہ میں رامے صاحب کا پبلک ریلیشنز آفیسر ہوں میں آپ کے پاس رامے صاحب کا میسج لے کے آیا ہوں وہ چاہتے ہیں کہ آپ پنجاب میں آئی جی آ جائیں۔ میں نے کہا میں یہاں بہت خوش ہوں کہ ایف آئی اے بن رہی ہے میں نے اس کی بنیاد ڈالی ہے ایک چیز بنانے میں انسان زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے وہ تو ایک بنا بنایا محکمہ ہے۔ لوگ آئیں گے جائیں گے جبکہ اس کو کسی جگہ پہنچا کے مجھے کامیابی کا احساس ہوگا۔ اس لیے میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ ایک تو یہ وجہ ہے اور دوسری یہ کہ وہاں جو آئی جی لگے ہوئے ہیں وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اس محکمے کی بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ٹرانسفر اور پوسٹنگ پر آپس میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں آنے والا جانے والے کا دشمن ہوتا ہے جانے والا آنے والے کا دشمن ہوتا ہے میں دوستی کو دشمنی میں تبدیل کرنا نہیں چاہتا اگر میں ان کی جگہ گیا تو وہ سمجھیں گے کہ شاید میں نے سازش کر کے انہیں ہٹایا ہے تیسری بات یہ ہے کہ صوبائی سطح پر محکموں میں وزیروں کی' سیاستدانوں کی بڑی مداخلت ہوتی ہے وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا مزاج ہی ایسا نہیں کہ میں یہ برداشت کر سکوں لڑائی جھگڑے ہوں گے ٹینشن ہوگی۔ مجھے پاٹے خانی کی یا معتبری کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں آرام سے بیٹھا ہوں اس لیے میرا انتخاب غلط ہے میرے جیسا آدمی رامے صاحب کو سوٹ نہیں کرے گا۔

اس کے بعد میں لاہور میں پولیس کے ایک فنکشن پر آیا وہاں رامے صاحب بھی تھے وہ آ کے میرے پاس بیٹھ گئے تھوڑی دیر تک مجھ سے بات وات کرتے رہے اس کے بعد اعظم خلیل میرے پاس آئے اور کہنے لگے میں نے رامے صاحب سے بات کی ہے ایک تو انہوں نے کہا ہے کہ رؤف صاحب

کے رہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انہوں نے تو جانا ہی ہے ان کی جگہ آپ آئیں یا کوئی اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ آئیں تو یہ بہتر ہے کہ آپ ان کے (صاحبزادہ رؤف) دوست ہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہوگا کہ آپ کے خلاف سازش شروع ہو جائے جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے جہاں تک مداخلت کا تعلق ہے رائے صاحب کہتے ہیں کہ میں آپ کے کام میں مداخلت نہیں کروں گا اس کے باوجود میں نے انہیں کہا' میری کوئی خواہش نہیں ہے میں نے صاحبزادہ رؤف علی سے بھی کہا کہ میں نہیں آنا چاہتا۔ آپ اگر رہنا چاہتے ہیں تو اپنا ٹرانسفر کینسل کرا لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا خوشی ہوگی جب مجھے پتہ چلا کہ کام ہونیوالا ہے میں کراچی چلا گیا تاکہ معاملے سے بچا جا سکے لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ بھٹو صاحب کا فیصلہ ہے۔ رائے صاحب اگر چاہتے بھی لیکن بھٹو صاحب نہ چاہتے تو کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہاں صحیح فیڈریشن تو نہیں ہے بلکہ عجیب روایت ہے کہ چیف سیکرٹری اور آئی جی کی پوسٹنگ سنٹرل گورنمنٹ کرتی ہے حالانکہ پولیس کا محکمہ صوبائی سبجیکٹ ہے لیکن پولیس افسر ایس پی سے لے کر آئی جی تک سنٹرل گورنمنٹ بھیجتی ہے دوسری طرف چیف منسٹر آئی جی کے ذہن میں یہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں نے تمہیں سلیکٹ کیا ہے۔ وہ آئی جی پر احسان کرتا ہے تاکہ آئی جی اس کے مفادات کا خیال رکھے وزیر اعظم یا صدر یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کو وہاں آئی جی بنایا ہے وہاں آپ میرے آدمی ہوں گے مرکزی حکومت کے مفادات کا دھیان آپ رکھیں گے۔

میں دورے پر کراچی چلا گیا وہیں مجھے راولپنڈی سے فون آیا کہ میں پرائم منسٹر کا اے ڈی سی بول رہا ہوں۔ پرائم منسٹر صاحب آپ سے بات کریں گے۔ بھٹو صاحب نے پوچھا آپ کہاں ہیں میں نے کہا کراچی میں کہنے لگے میں نے آپ کو پنجاب میں لگایا ہے واپس آئیں اور وہاں جا کے چارج سنبھالیں۔ میں نے کہا وہاں جانے سے پہلے میں آپ سے ملنا چاہوں گا۔ انہوں نے کہا واپس آئیں تو میرے اے ڈی سی کو فون کرنا وہ آپ کو وقت دے دے گا۔

میں پنڈی واپس پہنچا تو میں نے اے ڈی سی کو ٹیلی فون کیا اس نے کہا شام کو آجاؤ۔ یہ اگست 74ء کی شام کا وقت تھا بھٹو صاحب باہر لان میں بیٹھے تھے، بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ مرتضٰی بھٹو بھی ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا بھٹو صاحب سگار پی رہے تھے میں نے کہا آپ نے مجھے آئی جی پنجاب لگایا ہے بڑا مشکل سا جاب ہے بہرحال آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے کوشش کروں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو میرے متعلق کچھ غلط فہمی ہے کہ جب میں انگلینڈ میں تھا کہنے لگے نہیں وہ تو پرانا قصہ ہو گیا اگر میرے دل میں کوئی شکوہ ہوتا تو میں آپ کو پنجاب میں نہ لگاتا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے دل میں آپ کے خلاف کوئی بات نہیں ہے میں نے آپ کو بڑی چھان بین کے بعد لگایا ہے مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے اگر

کوئی پرابلم ہو تو جب بھی چاہو تم مجھ سے آ کے مل سکتے ہو اس کے علاوہ انہوں نے مجھے کوئی خاص ہدایت نہیں دی۔

اہم عہدوں پر لگاتے وقت بھٹو صاحب بڑی احتیاط کرتے تھے وہ صرف ریکارڈ ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس دوران جو آدمی ان سے ملنے آتا اس سے ضرور پوچھتے فلاں آدمی کیسا ہے۔ اس طریق کار کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہے کہ آپ کسی کو اہم جگہ پر لاتے ہیں تو تسلی کر کے لگاتے ہیں صرف کاغذوں سے یا اس کے سروس ریکارڈ سے تو پتہ نہیں چلتا نقصان اس کا یہ ہے کہ کوئی اس کو اچھا کہے گا کوئی اس کو بُرا کہے گا کوئی اس کو ایماندار کہے گا کوئی اس کو بے ایمان کہے گا کوئی اس میں ہزار خرابیاں نکالے گا جب مختلف آراء ملیں گی تو آپ کنفیوژ ہو جائیں گے' بہر حال' میرے ساتھ بھی یہ سلسلہ رہا کہ اس دوران میں' ایک دو مہینے میں جو بھی ان سے ملنے جاتا تھا' اس سے میرے متعلق ضرور پوچھتے تھے کہ کیسا پولیس افسر ہے۔ اس کے بعد فیصلہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔

فیصلہ کرنے میں کافی دیر لگا دیتے تھے ان کا خیال تھا یہ طریق کار بڑا صحیح تھا آپ حیران ہوں گے کہ وہی طریق کار انہوں نے ضیاء الحق صاحب کے سلسلے میں استعمال کیا اور بعد میں ان کو اندازہ ہوا کہ کتنی غلط چائس تھی' بجائے اس کے کہ دنیا بھر سے پوچھتے اس سے بہتر تھا کہ وہ سروس ریکارڈ پر جاتے اس وقت جنرل ٹکا خاں کمانڈر انچیف تھے۔ ان کی بات مانتے تو ضیاء الحق کا کبھی نمبر نہیں آتا۔ یہ آٹھویں نمبر پر تھے' ان سے پہلے سات لیفٹیننٹ جنرل ریٹائر کیے گئے پھر انہیں بنایا گیا لیکن انسان کا جو مقدر ہوتا ہے' وہ اس سے بہت سارے کام کراتا ہے جن کا کہ کوئی جواز نہیں ہوتا ورنہ ضیاء الحق جیسا آدمی بھٹو صاحب کو کبھی پسند نہیں آ سکتا تھا۔ اس سٹیج پر جو آدمی پہنچ جائے اس کی کمزوری خوشامد ہوتی ہے۔ ضیاء الحق کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ...... سخت خوش آمدی تھا۔

چونکہ بھٹو صاحب نے میرے سلسلے میں بھی بے شمار آدمیوں سے پوچھا ہوا تھا کہ کیسا آدمی ہے کیسا رہے گا وغیرہ وغیرہ تو مہینوں تک جو آدمی میرے پاس آتا یہ احسان ضرور جتاتا کہ میں نے کہا تھا آئی جی کے لیے جناب راؤ رشید صاحب کو لگایا جائے۔ ہر شخص نے مجھ پر یہ احسان ضرور کیا تھا آئی جی کے لیے جناب راؤ رشید صاحب کو لگایا جائے بلکہ جب یہ حکم ہوا کہ مجھے اطلاع مل گئی۔ مجھے قیوم خان صاحب نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سعید احمد خاں کا ٹیلی فون آیا ''راؤ صاحب' کافی شافی نہیں پینی آپ نے۔'' میں نے کہا ''کافی پینی تو ہے'' کہنے لگے ''آئیں' آپ کو بڑی اچھی کافی پلائیں'' میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کی پوسٹنگ کرائی ہے میں ان کے پاس گیا ان کا خیال تھا کہ شاید مجھے اس کا علم نہیں ہے میں نے بالکل ایسے ہی پوز کیا جیسے مجھے علم نہیں' کہنے لگے ''راؤ صاحب

کب جا رہے ہیں'' میں نے پوچھا '' کہاں'' کہنے لگے ''کل تک آپ کو پتہ چل جائے گا' آپ بڑی امپارٹنٹ جگہ جا رہے ہیں'' میں بالکل یہی پوز کرتا رہا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اشاروں کنایوں سے یہ ظاہر کرنے کی فکر میں رہے کہ ان کا اس میں بڑا ہاتھ ہے آخرکار میں پنجاب پہنچ گیا۔ یہاں بھی مہینوں تک جو لوگ آتے رہے ہر ایک نے مجھ پر یہی احسان جتایا کہ میں نے ہی آپ کی پوسٹنگ کرائی ہے میں نے بھٹو صاحب کو کہا جی یہ بہت اچھے آئی جی رہیں گے۔

صاحبزادہ رؤف علی بہت اچھے پولیس افسر تھے کسی صورت میں میں ان سے بہتر کارکردگی نہیں کر سکتا تھا لیکن کھر صاحب کا جانا اور رامے صاحب کا آنا وہ ایسے حالات میں پھنس گئے ورنہ ہماری پولیس میں جتنے بھی آئی جی عہدے کے لوگ گزرے ہیں ان میں جو بہت اچھے افسر ہوتے تھے صاحبزادہ صاحب کا شمار ان میں ہوتا ہے۔

جب میں یہاں پہنچا، ڈکیتی کے دو چار بڑے سنگین واقعات ہو چکے تھے۔ لاہور میں خاص طور سے اس سے لوگوں میں بڑا ہراس تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ واقعات کسی نے جان بوجھ کر کرائے ہیں تاکہ رامے صاحب کے متعلق یہ تاثر ابھرے کہ وہ ناکام چیف منسٹر ہیں مجھے اس سچوایشن پر فوری طور سے قابو پانا تھا دوسرے یہ کہ انٹی قادیانی ایجی ٹیشن ختم ہو چکی تھی اس کا معاملہ نیشنل اسمبلی میں تھا۔ میرا خیال ہے سات ستمبر 74ء کو فیصلہ آنا تھا کہ انہیں غیر مسلم قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ اس فیصلے پر امن و امان کا بہت دارومدار تھا فرض کریں کہ قومی اسمبلی نے انہیں غیر مسلم قرار نہ دیا تو پھر ہنگامے شروع ہو سکتے ہیں چنانچہ سب سے پہلا کام یہ تھا کہ ڈکیتی کے واقعات سے جو خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا خاص طور سے لاہور میں اس پر قابو پایا جائے دوسرے پورے صوبے میں اقدامات کرتا کہ اگر اسمبلی کے فیصلے کا امن عامہ پر اثر پڑا تو اس کا پوری طرح سدباب کیا جائے اس سلسلے میں میں نے ایک تو اصغر خاں کو جو ہلاکو خاں کے نام سے مشہور ہیں ایس ایس پی لگایا اس خیال سے کہ یہ ذرا سخت مزاج ہے جرائم پیشہ لوگ اس بات سے جھجکیں گے' ڈریں گے کہ ہلاکو خاں کے پلے نہ پڑ جائیں۔ سردار عبدالوکیل خاں کو بھی لاہور میں ڈی آئی جی لگایا خیال یہ تھا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا تھا اور وہ بھی ہوشیار ڈی آئی جی تھا ہر ایک میں خرابیاں ہوتی ہیں ہلاکو خاں میں اپنی کمزوریاں تھیں وکیل خاں کی بھی اپنی کمزوریاں تھیں لیکن میں نے کبھی پولیس میں گروپ بندی نہیں کی کوشش یہی رہی کہ جو اچھا افسر ہو کسی گروپ کا ہو کسی قوم کا ہو کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو لیکن اگر اپنے کام میں اچھا ہے تو اس کی خوبیوں کے لحاظ سے قابلیت کے لحاظ سے اس سے کام لیا جائے۔

جہاں تک احمدیوں سے متعلق قرارداد کا تعلق تھا اس سلسلے میں میں نے دو دن کے اندر اندر جتنے بھی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھے ان سب کا دورہ کر کے وہاں کے ایس پی اور ڈی ایس پی سے مل کے دیکھا

کہ کیا ضروریات ہیں اس کے بعد لاہور کے سارے ڈی آئی جیز کو بلایا۔ ان کی ضروریات کے مطابق سارے انتظام کیے جو انہیں مزید پولیس کی' اسلحہ کی ضرورت تھی وہ ان کو مہیا کیا۔ پھر چند اصول طے کیے اس لیے کہ اگر سارے صوبے میں فسادات ہو جائیں خاص طور سے دیہاتوں میں تو پولیس کی اتنی نفری نہیں ہوتی کہ وہ کنٹرول کر سکے۔ پولیس کے ایک تھانے میں بارہ یا چودہ سپاہی ہوتے ہیں ان کا ایریا اتنا ہوتا ہے ان میں قصبے بھی ہوتے ہیں' شہر بھی ہوتے ہیں سڑکیں بھی ہوتی ہیں وہاں ہنگامے شروع ہو جائیں تو چودہ سپاہی تو کنٹرول نہیں کر سکتے شہروں کا علیحدہ مسئلہ تھا' کوشش یہ کی گئی کہ پولیس کی کم سے کم تعداد کو زیادہ سے زیادہ ایریا کے لیے استعمال کیا جائے اور ضلع میں ہر علاقے میں سنٹرل پوائنٹس بنا دیئے' جہاں نفری رکھی گئی کہ اگر کہیں فسادات شروع ہو جائیں وہ نفری استعمال کی جا سکے لیکن ایک عجیب بات ہوتی ہے کہ آپ کتنی ہی پلاننگ کریں جب سلسلہ شروع ہوتا ہے آپ کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جاتی ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ جتنے بھی وار پلان (جنگی منصوبے) ہیں پہلی گولی فائر ہوتی ہے تو سارے ہی اپ سیٹ ہو جاتے ہیں پھر وار پلان کوئی نہیں دیکھتا جس طرح سے سچوایشن ٹرن کرتی ہے اسی طرح سے پھر معاملہ چلتا رہتا ہے میں نے وکالت میں یہ چیز محسوس کی کہ آپ کیس کی کتنی ہی تیاری کر کے جائیں آپ سوچتے ہیں کہ اسی طرح شروع کریں گے۔ لیکن آپ منہ کھولتے ہیں تو جج ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ آپ کا سارا سلسلہ کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے بہتر طریقہ یہی ہے کہ جو بنیادی علم ہے وہ ہو اور اس پر عبور ہو پھر جیسے جیسے سچوایشن ڈویلپ ہوتی رہتی ہے اسی طرح سے آپ اس کا تدارک کرتے رہتے ہیں یہی بات پولیس کے ضمن میں بھی ہے کہ آپ کتنی تیاری کر لیں کہ آپ اس طرح سے فورس رکھیں گے اور یہ جھگڑا ہوگا تو اس طرح سے پہنچیں گے لیکن جب شروع ہوتا ہے تو ایسا کہ آپ کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو اور ساری ترکیب دھری کی دھری رہ جاتی ہے چنانچہ اسی طرح ہوا ہر آدمی اس انتظار میں تھا کہ فیصلہ ہوگا تو اس کے بعد ہنگامے شروع ہوں گے لیکن رحیم یار خاں میں اچانک کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی اور فیصلہ سے پہلے ہی دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس دکانیں جل گئیں اور جو ہم نے پلان کیا تھا کہ پولیس یوں پہنچے گی قبل اس کے کہ پولیس پہنچتی۔ پٹرول پمپ بھی جل گیا' دو چار کاریں بھی جل گئیں کچھ مکان بھی جل گئے جیسا کہ اس قسم کے ہنگاموں میں عام طور پر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹے بعد اطلاع ملتی ہے اور تین چار گھنٹے بعد پولیس تیار ہوئی یہاں بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے ڈی آئی جی سے کہا کہ ہماری ساری پلاننگ کا یہی حال ہونا ہے تو پھر تیاری نہ کریں تو بھی یہی حشر ہوگا۔ لیکن رحیم یار خاں کے واقعے سے مجھے یہ بڑی فکر ہوئی کہ اگر خدانخواستہ واقعی ہنگامے شروع ہو گئے تو پھر ان پر قابو پانا بڑا مشکل ہوگا۔

بھٹو صاحب کا اپنا کام کرنے کا طریقہ تھا انہوں نے ذہنی طور سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس اشو کو

کسی نہ کسی نہج پر پہنچانا ہے اور انہوں نے ظاہر ہے کہ جو صحیح فورم تھا یعنی نیشنل اسمبلی مسئلہ اس کے سامنے رکھا وہ جو چاہے فیصلہ کرے تا کہ ان کی ذاتی ذمہ داری نہ ہو اور یہی جمہوریت کا فائدہ بھی ہے یہی جمہوری طریقہ بھی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس میں وہ خود ملوث نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے نیشنل اسمبلی پر چھوڑا اور انہوں نے فیصلہ دے دیا اس سے یہ ہوا کہ امن عامہ کا مسئلہ ختم ہو گیا چونکہ کئی مہینے سے پولیس اسی میں ملوث تھی اس مسئلے پر بڑے ہنگامے ہو چکے تھے پولیس بڑی تھک ہار چکی تھی ہمارا خیال تھا کہ یہ ختم ہو جائے گا اور پولیس اپنے اصلی کام کی طرف توجہ دے گی لیکن پھر فوری طور سے حکم ملا کہ پرائم منسٹر صاحب کچھ روز میں پنجاب کا دورہ شروع کرنے والے ہیں۔ بھٹو صاحب نے پہلے بھی ایک دو دفعہ کھر صاحب کے زمانے میں پنجاب کا تفصیلی دورہ کرنے کی خواہش کی لیکن کھر صاحب نے انہیں ہمیشہ یہی کہا دورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لوگ بنگلہ دیش کے مسئلے پر بڑے خلاف ہیں میرا اپنا خیال ہے کہ کھر صاحب کا یہ مشورہ کسی وجہ سے خود غرضی پر مبنی تھا چونکہ ہماری فطرت میں پاٹے خانی زیادہ ہی ہے اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ ان کی اپنی شان میں کوئی دوسرا چاہے صدر یا پرائم منسٹر ہی ہو دخل دے۔

بھٹو صاحب نے اکتوبر 73ء سے دورہ شروع کر دیا ان کا پروگرام یہ تھا کہ بہاولپور سے شروع کریں گے۔ پھر بہاولپور سے ملتان، ملتان سے سرگودھا، سرگودھا سے راولپنڈی، پھر واپس لاہور آئیں گے، یہ کوئی تین چار مہینے چلنا تھا۔ ان کا پروگرام اس طرح تھا کہ دو ہفتے دورہ کریں گے اور دو ہفتے اسلام آباد اپنا باقی کام کریں گے۔ اس کے بڑے انتظامات کرنے پڑے اس لیے کہ پرائم منسٹر کی سکیورٹی کے لیے بہت انتظام ہوتا ہے۔ ایک دن میں انہوں نے تین تین جگہ جانا تھا اور وہاں پہ کھلی کچہری بھی، پھر وہاں جلسہ عام بھی ہو پھر راستوں پر بھی لوگ لگانے ہوتے ہیں۔

اس کے لیے پنجاب پولیس پر بہت بوجھ پڑا۔ بہر حال اس کے لیے ہم نے پنجاب کی ساری جگہوں سے موبائل فورس بلائیں ان کے لیے کیمپوں کا بندوبست کیا یہ بہاولپور سارے کے سارے پہنچ گئے۔ رحیم یار خان سے میرا خیال ہے انہوں نے شروع کیا پھر جہاں جلسہ ختم ہوتا تھا ہم پولیس کو وہاں سے اٹھا کے اگلی جگہ پہنچاتے تھے جہاں انہوں نے جانا ہوتا تھا بھٹو صاحب تو ہیلی کاپٹر سے سفر کرتے تھے ہمارے لوگ بیچارے لاریوں پر سفر کرتے تھے پھر ایک آدمی کو بارہ بارہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے سڑکوں پر کھڑا ہونا پڑتا تھا کبھی جلسوں میں کھڑا ہونا پڑتا تھا اس کے بعد ان کے کھانے کا سونے کا بندوبست کرنا۔ پھر وردی کا بھی خیال رکھنا کہ وہ کم از کم گندی نہ ہو۔

اس دوران میں کئی بڑے دلچسپ واقعات ہوئے۔ میرا خیال ہے بہاولپور کا واقعہ ہے سٹیڈیم میں بہت بڑا مجمع تھا بھٹو صاحب تقریر کر رہے تھے اچانک آگ کا شعلہ بلند ہوا بھٹو صاحب کی زبان سے

نکلا "یہ کیا ہے" فوراً سارے لوگوں کی توجہ اس طرف ہوگئی خیال ہوا کہ کوئی بم پھٹا ہے یا آگ لگائی گئی ہے یا کوئی اپنے آپ کو آگ لگا رہا ہے چنانچہ ڈی ایس پی اور کچھ سپاہی بھاگ کے اس کو لے آئے معلوم ہوا کہ ایک بوڑھا آدمی ہے اس سے بولا بھی نہ جائے وہ کانپ رہا تھا پتہ چلا کہ اس نے بھٹو صاحب کو درخواست دینی تھی اس کا مسئلہ تھا کہ بھٹو صاحب تک کس طرح سے پہنچا جائے پولیس تھی افسر لوگ تھے کہاں آنے دیتے کسی نے اسے سمجھایا کہ اس طرح سے آگ لگاؤ چنانچہ وہ مٹی کے تیل کی بوتل لے گیا جب بھٹو صاحب تقریر زور شور سے کر رہے تھے اس نے بوتل میں کپڑا ڈال آگ لگا کر بلند کیا تا کہ سب لوگوں کی توجہ ہوگی اور بھٹو صاحب کہیں گے بلاؤ اس کو کیا قصہ ہے اور اس کا کام ہو جائے گا۔ بھٹو صاحب نے تقریر جاری رکھی بعد میں ہم سے پوچھا ہم نے بتایا کہ یہ قصہ ہے۔ اس کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ راے صاحب نے اس کو بلایا۔ راے صاحب کانپ رہے تھے وہ آدمی بھی کانپ رہا تھا۔ پولیس افسر بھی کانپ رہے تھے اس لیے کہ اس نے آگ کیوں لگائی' ہر آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا تھا جب پتہ چلا کہ درخواست دینا چاہتا تھا پھر تسلی ہوئی۔

اب درخواست بازی کی جائز وجوہ بھی ہیں اور ناجائز بھی۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے بات یہ ہے کہ جس معاشرے میں کام اصولوں پر نہ ہوں شخصیات سے ہوں یا سفارش سے یا رشوت سے ہوں تو یہ درخواست بازی کا مسئلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو انصاف نہیں ہوتا اگر انصاف ہو اور حقدار کو اس کا حق مل جائے لیکن توقع ہر ایک کی ہوتی ہے کہ اس کا کام ہو جائے جائز ہو یا ناجائز اور ہر شخص کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر اگر اس نے رشوت دی یا اس کی مناسب سفارش ہوئی تو اس کا ناجائز کام بھی ضرور ہو جائے گا اس لیے لوگوں کی درخواستیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں اس کو پتہ ہو گا کہ اس کا کام ناجائز ہے اس کے خلاف فیصلہ ہو گیا ہے لیکن وہ آخر وقت تک کوشش کرتا رہے گا کہ کس طرح اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے چنانچہ وہ بھی اس قسم کا کیس تھا کہ اس کا زمین کا جھگڑا تھا لوئر کورٹ میں اس کے خلاف فیصلہ ہوا ہائی کورٹ میں بھی اس کے خلاف فیصلہ ہوا لیکن وہ یہ چاہتا تھا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف کسی نہ کسی طرح بھٹو صاحب حکم دے دیں۔ اس کو بڑا سمجھایا کہ یہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ تو بادشاہ کھڑا ہوا ہے وہاں پہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ نہیں ہو سکتا یہ حکم دے تو کیوں نہیں ہو سکتا۔

بہاولپور کا دورہ ختم ہوا وہ اسلام آباد چلے گئے پھر ملتان کا دورہ شروع ہوا ملتان کا دورہ اوکاڑہ سے شروع ہوا میدان سا تھا وہاں انہوں نے سٹیج بنایا وہاں مجمع آخر وقت تک سیٹ نہیں ہوا پنڈال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے لوگ بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے سارے کھڑے تھے جیسے فصل ہوا میں لہراتی ہے وہ بھی کبھی

ادھر لہرا رہے تھے کبھی ادھر لہرا رہے تھے اس لیے بھٹو صاحب تقریر جم کے نہیں کر سکے تھے اور بڑی مشکل سے اس مجمع کو قابو میں رکھا گیا' کہ وہ سٹیج تک نہ پہنچے' بہرحال' آخری وقت تک جلسہ جما نہیں' اس میں گڑبڑ رہی۔ کوئی اٹھ رہے ہیں کوئی بیٹھے ہیں کوئی جا رہے ہیں بھٹو صاحب کا موڈ آف ہو گیا چنانچہ جب جلسے کے بعد ریسٹ ہاؤس میں آئے انہوں نے مجھ سے تو نہیں کہا ڈی آئی جی سپیشل برانچ عبدالقیوم سے کہا ''مسٹر قیوم یہ کیا ہوا؟ یہ گڑبڑ کس طرح سے ہوئی میں تقریر بھی صحیح طور پر سے نہیں کر سکا۔'' وہاں سارے بڑے پریشان تھے کہ بھٹو صاحب ناراض ہو گئے اس کی اور بھی تاویلیں ہوئیں پیپلز پارٹی کے دو عنصر تھے۔ ایک وہ جو گورنمنٹ سے منسلک تھے دوسرے وہ جو گورنمنٹ سے منسلک نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ خامیاں نکالتے رہتے تھے کسی نے کہا کہ یہ جماعت اسلامی نے خراب کر دیا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو پیسے دیئے اور کہا کہ بھٹو صاحب کا جلسہ خراب کریں' کسی نے کہا' راے کا کوئی انتظام نہیں نیا آئی جی ہے وغیرہ وغیرہ چنانچہ بھٹو صاحب نے کہا کہ سب کو ریسٹ ہاؤس بلاؤ میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا گڑبڑ ہوئی۔ میں نے کہا جہاں تک لاء اینڈ آرڈر کا تعلق ہے گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ہمارا تو کام یہ ہے کہ لوگ توڑ پھوڑ نہ کریں ایک دوسرے کو مار پیٹ نہ کریں۔ آپ کی سیکورٹی ٹھیک ہو۔ اب مجمع آپ کی بات کو کس طرح سے سنتا ہے یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ تو آپ کے سیاستدانوں' آپ کے ساتھیوں کا کام ہے ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ پرائم منسٹر کے قریب بیٹھے تاکہ تصویر آئے' کہ وہ بڑا پاٹے خان ہے' پولیس اگر ان لوگوں کو ڈنڈے مارتی تو یہ بھی اچھی بات نہ ہوتی اعتراض اٹھتا کہ ڈنڈے مار مار کے سنوایا جا رہا ہے میں نے کہا کہ اگر خرابی ہوئی ہے تو ان لوگوں کی وجہ سے ہوئی ہے جو آپ کے پاس آ کے بیٹھتے ہیں وہ لوگوں کیساتھ بیٹھیں اور ان کو ٹھیک رکھیں' بھٹو صاحب ان پر برسے کہ کوئی منسٹر ایم این اے' ایم پی اے سٹیج پر نہیں آئے گا وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھا کریں گے۔

سیاستدان کا اپنا طریق کار ہوتا ہے فوجی ڈکٹیٹر کو تو ضرورت نہیں ہے نہ اس کو ووٹوں کی ضرورت ہے نہ یہ کہ وہ عوام میں پاپولر ہے کہ نہیں اس کے ہاتھ میں تو ڈنڈا ہے لیکن سیاستدان تو قائم ہی اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کو لوگوں کی حمایت حاصل رہے اور جب یہ تاثر ملتا ہے کہ لوگ اس کے حامی نہیں تو پھر اس کا حق نہیں بنتا کہ رہے چنانچہ جب بھٹو صاحب نے محسوس کیا کہ یہ عام تاثر ہے کہ اوکاڑے کا جلسہ خراب ہو گیا تو انہوں نے مجھے بلا کے کہا کہ راستے میں کہیں رکنا ہے اس کا انتظام کرو لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے تھے اچانک کرتے تھے لیکن یہ بات نہیں ہوتی سیاستدان کوئی کام اچانک نہیں کرتا مثلاً چرچل کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بڑا اچھا خطیب تھا اور فی البدیہہ بڑی اچھی تقریر کرتا تھا لیکن وہ اپنی تقریر کے ایک ایک لفظ کی کئی کئی بار ریہرسل کرتا تھا چنانچہ سیاستدان کہیں کے بھی ہوں کوئی چیز

ان میں اچانک (Spontaneous) نہیں ہوتی چنانچہ بھٹو صاحب ائر پورٹ کی طرف جارہے تھے۔ راستے میں تنور کی دکان نظر آئی وہاں اترے تنور میں چلے گئے۔

انہوں نے مجھ کو یہ نہیں بتایا کہ کہاں رکوں گا' صرف یہ کہا کہ کہیں رکوں گا انہیں تنور نظر آیا' وہاں رک گئے بھٹو صاحب وہاں بیٹھ گئے، روٹی چکھی، سالن چکھا، بیشار لوگ جمع ہو گئے انہوں نے تالیاں بجائیں' بھٹو زندہ باد وغیرہ وغیرہ جلسے کا خراب تاثر دور ہو گیا ان کی شخصیت کا عوامی تاثر بھی قائم ہو گیا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا لوگوں کے جو چہرے اترے ہوئے تھے کہ پتہ نہیں کس پر غصہ اترے گا کس کس کے تبادلے ہوں گے کون کون ہٹے گا وہ بات بھی ختم ہو گئی۔

شروع میں جب انہوں نے کھلی کچہریاں کیں تو کوئی پابندی نہیں تھی جس کی مرضی ہو آجاتا تھا' پھر آہستہ آہستہ چیف منسٹرز نے بھی اور ہم لوگوں نے بھی جو افسران تھے انہوں نے ہر چیز میں مداخلت شروع کر دی وہ اس لیے کہ ہر ایم این اے اور ایم پی اے نے لاریوں میں اپنے آدمی لانا شروع کر دیئے چنانچہ جو آدمی درخواست دیتے تھے ان کی سکریننگ ہونے لگی کہ کس کس کو اجازت دی جائے پھر یہ ہوتا تھا کہ سارے لوگ اکٹھے ہیں وہ کہہ رہے ہیں ہمارے ہاں سڑک ہونی چاہیے سکول ہونا چاہیے کالج ہونا چاہیے ان کے مطالبات پہلے چیف منسٹر رائے صاحب سنتے تھے' اس طرح ان کو پتہ ہوتا تھا کہ پیش ہونے والا کیا بات کہے گا اور وہ اس کا کیا جواب دیں گے۔ کھلی کچہری سے بھٹو صاحب کا جو اصل مقصد تھا وہ فوت ہونا شروع ہو گیا۔ بھٹو صاحب بڑے ہوشیار اور بڑے ذہین انسان تھے چھ ماہ کے ان جلسوں کے آخری مرحلے میں جب گوجرانوالہ پہنچے رائے صاحب بڑے خوش تھے کہ دورہ کامیاب رہا۔ بھٹو صاحب بڑے متاثر ہیں خاص طور سے اس بات پر کہ ہر مطالبہ جو پیش ہوتا ہے اس کا رائے کو پتہ ہوتا تھا کہ کیا پوزیشن ہے' اتنی اس کی تیاری ہوتی ہے' بڑا قابل آدمی ہے' وغیرہ وغیرہ' پھر یہ کہ بیشار آدمی جلسوں میں آتے رہے رائے صاحب اس سے بھی خوش تھے کہ وہ بہت ہی کامیاب ہو گئے کہ بھٹو صاحب بڑے پاپولر ہیں۔

گوجرانوالہ جب جلسہ عام ختم ہو چکا کھلی کچہری شروع ہوئی تو بھٹو صاحب نے کہا ہاں بھئی رائے' کدھر ہیں' پیپلز پارٹی کے سکھائے ہوئے لوگ' وہ جو سوال تم کراتے ہو چلو شروع کراؤ۔ کہنے لگے تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے پتہ نہیں کہ میرے جلسوں میں تم لوگوں کو ٹرکوں اور بسوں میں بھر بھر کے لاتے ہو یہ سن کر رائے صاحب کا رنگ پیلا زرد ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ چھ مہینے کی ساری محنت بیکار گئی۔ رائے صاحب تو سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں کتنی شاباش ملے گی۔

لطیفے کی بات اس میں یہ ہے کہ اگر بھٹو صاحب کو علم تھا تو چھ مہینے سے لوگوں کو اتنی پریڈ کرانے کی کیا ضرورت تھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پوری ایڈمنسٹریشن اور پولیس پر اس کا کتنا بوجھ ہوتا ہے اور یہ

بات انہوں نے آخری مرحلے کے لیے رکھی کہ راے یہ نہ سمجھے کہ اس نے بڑا کمال کیا ہے اور بھٹو کی آنکھ میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اس پر مجھے پولیس کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ شروع شروع میں جب میں پولیس میں آیا تو ہر محکمے کی روایتی کہانیاں ہوتی ہیں ہمارے ہاں کی ایک روایتی کہانی یہ تھی' کہ کوئی نیا نیا اے ایس آئی بھرتی ہوا اور وہ ایس ایچ او کے ساتھ دورے پر نکلا گھوڑوں پر یہ لوگ سوار تھے' دوپہر کا وقت تھا سخت گرمی تھی ایک بوڑھا آدمی سائے میں سو رہا تھا۔ تھانیدار نے کہا او ئے پانی ہے کوئی' اس نے کہا ابھی لایا وہ برتن میں لسی لے کر بھاگا بھاگا آیا اور تھانیدار کو پیش کر دی۔ تھانیدار نے لسی پی مونچھیں صاف کیں اور برتن اس بوڑھے کے منہ پر دے مارا اور گھوڑا بھگا کے چلا گیا جب واپس آئے تو وہ جو نیا بھرتی ہوا تھا اس نے پوچھا ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ بوڑھا بیچارہ تو بڑے شوق سے بھاگ کے گیا اور آپ کے لیے لسی لایا آپ نے اس کے منہ پر برتن مار دیا تھانیدار نے کہا اس لیے کہ وہ یہ تو نہ سمجھے کہ اس نے مجھ پر کوئی بڑا احسان کیا ہے۔

بہر حال یہی راے صاحب کے ساتھ ہوا اس پر بیچارے بڑے اپ سیٹ ہوئے وہاں اس طرح کے لطیفے ہوئے مثلاً میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی درباریت ہے سرگودھا میں جلسہ ہو رہا تھا۔ دور کسی نے دور لاؤڈ سپیکر لگایا ہوا تھا ہوا کے ساتھ کبھی کبھی اس کی آواز آتی تھی جس سے بھٹو صاحب ڈسٹرب ہوتے تھے کیونکہ وہ تقریر کر رہے تھے' راے صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ہر ایک کو بھگا رہے ہیں بند کراؤ یہ لاؤڈ سپیکر کہاں لگا ہے بڑے اہم عہدوں پر لوگ ہوتے تھے لیکن اپنے آپ کو اس طرح سے گراتے تھے اور اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی چپڑاسی یا معمولی عہدے کے آدمی ہوں کہ پرائم منسٹر کے ذہن پر ذرا چیز بار نہ ہو اور کوئی ایسا واقعہ اور ایسی بات نہ ہو جو ان کو ناگوار خاطر ہو اس کے لیے جناب چیف منسٹر پارے کی طرح بے چین ہیں اور ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہیں جب تک لاؤڈ سپیکر بند نہیں ہو گیا راے صاحب کو چین نہیں آیا۔ پھر ایک بڑا لطیفہ ہوا بھٹو صاحب پیپلز پارٹی کے ورکرز سے بات کر رہے تھے کہ مشہور ہو گیا کہ تاس (روسی خبر رساں ایجنسی) کا نمائندہ سرگودھا میں آیا ہوا ہے اور وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح سے اندر داخل ہو جائے اتنے میں ایک سب انسپکٹر تھا یا انٹیلی جینس کا کوئی آدمی تھا بھاگا ہوا میرے پاس آیا جی وہ تو اندر بیٹھا ہوا ہے میں بڑا حیران ہوا کہ اتنی ٹائٹ سیکورٹی میں تاس کا نمائندہ کیسے اندر چلا گیا اس نے کہا چلیے میں آپ کو دکھاتا ہوں' جا کے دیکھا تو وہ افضل سعید بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا بیوقوف! یہ تو بھٹو صاحب کے سیکرٹری افضل سعید ہیں اس پر بڑی ہنسی پڑی' افضل سید صاحب کا رنگ گورا چٹا تھا اور انہوں نے اپنے بال بھی کچھ اس قسم سے رنگے ہوئے تھے کہ بھورے لگتے

تھے اس نے کہا ہو نہ ہو روس کی خبر رساں ایجنسی کا بھی نمائندہ ہو سکتا ہے۔

اس سارے دورے میں لوگ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتے رہے، جس روز بھٹو صاحب کا ملتان میں جلسہ تھا جب میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ پرائم منسٹر صاحب بڑے اپ سیٹ ہیں کیا بات ہوئی؟ پتہ چلا کہ ائر مارشل اصغر خاں نے وہاں تقریر کی ہے اور بھٹو صاحب کے سارے دورے کا اثر ضائع ہو گیا ہے۔ میں نے انکوائری کی پتہ چلا کہ اصغر خاں نے بھی ادھر کا دورہ رکھا ہوا تھا وہ مظفر گڑھ جا رہے تھے تو ملتان مظفر گڑھ کراسنگ پر انہوں نے کھڑے ہو کے چائے پی۔ دو چار سو آدمی اکٹھے ہو گئے یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی اس پر لوگوں نے بھٹو صاحب سے رامے کے خلاف شکایت کی کہ وہاں تو ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اصغر خاں نے وہاں کھڑے ہو کے تقریر کی اور آپ کے سارے دورے کا اثر ضائع کر دیا بعض لوگ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش میں اس قسم کی فضول باتیں کرتے تھے اور خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے تھے۔

یہ دورہ فروری یا مارچ 75ء میں جا کے ختم ہوا اور اس کا آخری جلسہ لاہور میں مینار پاکستان کے سامنے ہو رہا تھا اس کے بھی ہم نے بڑے انتظامات کیے۔ بھٹو صاحب لاہور کو سیاسی کردار میں سیاسی زندگی میں اور سرکاری زندگی میں بھی ہمیشہ بہت اہمیت دیتے تھے انہوں نے پروگرام بنایا تو ان کا خیال تھا کہ لاہور کا جلسہ سب سے اچھا ہونا چاہیے۔ اس وقت کھر اور رامے کی مسلسل چل رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کے ان دو دھڑوں کو بھی اس جلسے کی اہمیت کا احساس تھا وہ طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ کھر کے حامیوں نے سٹیج کے فرنٹ میں آ کے جگہ لے لی وہ وہاں سے جلسے کو خراب کرنا چاہتے تھے ان میں سب سے نمایاں آدمی جو تھا وہ کوئی مودا کنجر تھا۔ مجھے اس کی بیک گراؤنڈ کا پتہ نہیں وہی اس آپریشن کا انچارج تھا چنانچہ جب جلسہ ہو رہا تھا تو ایک خاص جگہ سے آگے بڑھ کے ہلچل پیدا کر کے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی اب ایک آدمی تقریر کر رہا ہو لوگ اس کو نہ سنیں گڑبڑ کریں اس کا تسلسل تو ختم ہو جاتا ہے اس کا مقصد یہی تھا کہ یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ رامے صاحب کی ایڈمنسٹریشن بڑی کمزور ہے لیکن کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوئی جلسہ پھر بھی پرامن رہا کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اگر مجمع میں ہلچل ہوئی تو اس پر فوری طور سے قابو پا لیا گیا لیکن سیاستدانوں کے طور طریقے ہوتے ہیں کہ وہ بڑی پلاننگ کرتے ہیں کہ کس طرح سے ایک دوسرے کے خلاف سازش کی جائے چنانچہ پہلے تو کوشش یہ کی گئی کہ جلسے میں گڑبڑ ہو اس کے بعد جو سارے حواری تھے، پیپلز پارٹی کے کرتا دھرتا تھے وہ سب جلوس کی صورت میں بھٹو صاحب کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے وہاں ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب نے پوچھا کہ کیسا رہا جلسہ اس میں کھر صاحب کے جو لوگ تھے انہوں نے پہلے سے پلاننگ کی ہوئی تھی "بس جی کیا جلسہ رہا رامے صاحب کی وجہ سے لاہور کے جلسے میں گڑبڑ ہو

گئی لاہور کا جلسہ تو بالکل ناکام رہا" اس طرح سے وہ اشتعال دلاتے رہے پھر اس قسم کے لوگوں نے جو رامے کے خلاف تھے بھٹو صاحب کو قائل کر لیا کہ جلسہ کامیاب نہیں رہا اور بڑی گڑبڑ ہوئی ہے اور ایسا جلسے میں نہیں ہونا چاہیے تھا وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ رامے صاحب کا آئی جی پر کنٹرول ہی نہیں ہے ۔آئی جی وہاں سینہ تان کے کھڑا رہا اور چیف منسٹر بھاگ دوڑ کرتا رہا۔

میرا ذہن ہے کہ اگر اس قسم کی گڑبڑ ہو جائے تو اس میں انسان کو اپنے حواس نہیں کھونے چاہئیں پھر یہ کہ کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن رامے صاحب اتنی عدم اعتمادی کا شکار تھے کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے مجھے مبارکباد دی کہ بڑا اچھا جلسہ ہوا لیکن جب گورنمنٹ ہاؤس میں لوگوں نے ایک سازش کے تحت ان کی بھٹو صاحب سے شکایت کی لعن طعن کی اور بھٹو صاحب نے ان کو جھاڑ پلائی۔ ڈانٹا تو انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی جلسہ خراب رہا اور مجھے بلایا کہ راؤ صاحب غضب ہو گیا جلسہ تباہ و برباد ہو گیا کہنے لگے شکایت ملی ہے کہ آپ وہاں ڈنڈا پکڑے کمر پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے میں نے کہا کمر پر ہاتھ رکھنے سے تو جلسہ خراب نہیں ہوتا دوسری بات یہ کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں لوگوں کو یہ بھی سکھاؤں کہ شور نہ مچائیں۔ میرا کام وہاں یہ ہے کہ جلسہ میں مار پیٹ نہ ہو، کوئی پراپرٹی کا نقصان نہ کرے اور امن عامہ کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ کام پولیس نے پورے کیے۔ باقی جلسہ کیسا رہا کیسا نہیں رہا تقریر کا کیا اثر ہوا یہ سیاسی باتیں ہیں ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے محسوس کیا چونکہ ان کو ڈانٹ پڑی تھی لہٰذا وہ اپنا غصہ پولیس پر اتارنا چاہتے تھے۔

❖

حنیف رامے

رامے صاحب بڑے پڑھے لکھے انسان ہیں' پینٹر بھی ہیں' دانشور بھی ہیں' ان کا مساوات اخبار سے بھی تعلق رہا۔ اچھا لکھتے ہیں' اچھا بولتے ہیں' میرا خیال یہ تھا کہ اس مناسبت سے ان کا دور بدعنوانیوں اور مداخلت سے پاک ہوگا اور انہوں نے مجھے گارنٹی بھی دی تھی کہ میرے کام میں وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ میں نے اپنے محکمے میں مداخلت روکنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میرے جس ماتحت کی سفارش آتی تو میں اس کو بلا کے اس کے سامنے اس کی ذاتی فائل میں لکھ دیتا کہ اس شخص نے پوسٹنگ کے لیے یا پروموشن کے لیے مجھ تک سفارش پہنچائی جب لوگوں کے ریکارڈ خراب ہونا شروع ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ میرے ماتحت سفارش نہیں کراتے تھے بلکہ اگر انہیں کوئی کہتا کہ تمہاری آئی جی صاحب سے سفارش کر دیں تو وہ ہاتھ جوڑ کے کہتے خدا کے لیے آپ ان تک ہماری سفارش نہ کرنا۔ معاملہ الٹ ہو جائے گا۔

یہی نہیں تھا کہ جو ایم این اے یا ایم پی اے میرے دوست تھے میں ان کی سفارش نہیں مانتا تھا بلکہ چیف منسٹر بھی اگر سفارش کرے تو اس کا بھی یہی حال کرتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیروں اور وزیر اعلیٰ نے مجھ سے یہ کہنا ہی چھوڑ دیا کہ فلاں کی آپ وہاں پوسٹنگ کر دیں یا ٹرانسفر کر دیں لیکن سیاستدانوں کا اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا' چنانچہ انہوں نے رامے صاحب سے کہنا شروع کر دیا یہ پیپلز پارٹی کی حکومت ہے' آپ چیف منسٹر ہیں ہم ایم این اے ہیں' ایم پی اے ہیں' ہم نے لوگوں سے ووٹ لیے ہیں لیکن ہم کسی سب انسپکٹر کا تبادلہ بھی نہیں کرا سکتے۔ رامے صاحب کا جو عام امیج تھا ان کے اردگرد جو لوگ تھے وہ اس سے بالکل مختلف تھے وہ بڑے غیر دانش ور قسم کے لوگ تھے ان میں ایک راجہ منور صاحب بڑے ایڈوائزر تھے راجہ منور صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں۔ سیاست میں بڑی اچھی گفتگو کر لیتے ہیں لیکن جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے اور وہ کہاں تک قابل اعتبار ہیں میں اس پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس طرح

ایک کمانڈر سجاد صاحب ہوتے تھے اصل میں کمانڈر سجاد آہستہ آہستہ راے صاحب پر چھا گئے اور سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ سب سے زیادہ جو راے صاحب کو خراب اور بدنام کیا وہ کمانڈر سجاد نے کیا۔ یہ دو آدمی اس لحاظ سے قابل ذکر تھے کہ راے صاحب زیادہ تر ان کی بات مانتے تھے اس کے علاوہ فتح محمد ملک تھے شریف آدمی تھے۔ پروفیسر ٹائپ کے' وہ دانش ورانہ سطح پر ان کے مشیر تھے ایک کرنل شریف تھے' وہ کالا باغ کے ملٹری سیکرٹری ہوا کرتے تھے راے صاحب کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب نے کرنل شریف کو ان کی جاسوسی پر لگایا ہوا ہے واللہ اعلم لیکن ٹھیک ہے کرنل شریف کا کالا باغ کے زمانے کا تجربہ تھا لیکن کالا باغ کے زمانے میں اور راے کے زمانے میں بہت فرق تھا حالات بہت بدل چکے تھے وہ مطلق العنانی کا دور تھا۔ اس وقت ڈنڈا چلتا تھا' بہر حال راے صاحب کرنل شریف پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتے تھے نہ ہی ان سے زیادہ مشورہ لیتے تھے' آپ یہ سمجھ لیں کہ راجہ منور ان کے سیاسی مشیر تھے۔ ایڈمنسٹریشن کمانڈر سجاد چلا رہے تھے کمانڈر سجاد سے ہم بڑے نالاں تھے مداخلت کی بہت شکائتیں تھیں یہاں تک کہ ایک دفعہ راے صاحب کے خلاف جلوس نکلا میرا خیال ہے مزدوروں کا تھا۔ ڈی آئی جی نے ذرا سستی کی وہ جلوس اسمبلی ہال پہنچ گیا۔ وہاں انہوں نے نعرے بازی شروع کر دی۔ کمانڈر سجاد کو پتہ چلا تو وہ بہ نفس نفیس وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پولیس کو حکم دینا شروع کر دیا کہ لاٹھی چارج کر دو۔ آنسو گیس چلاؤ' میں وائرلیس پر سن رہا تھا کہ کمانڈر سجاد نے آرڈر دیئے ہیں میں نے راے صاحب سے بڑا سخت احتجاج کیا کہ کمانڈر سجاد کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہاں جا کے اس طرح سے پولیس کو حکم دے اگر خدانخواستہ گولی چل جائے یا کوئی آدمی مر جائے تو اس کے خلاف قتل کا کیس بنے گا یہ نہ مجسٹریٹ ہے نہ اسے مجسٹریٹ کے اختیارات ہیں نہ یہ پولیس کو حکم دے سکتا ہے یہ کس حیثیت سے وہاں پہنچا ہے۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں اگر اسے اتنا ہی شوق ہے تو آپ اسے ڈی آئی جی کیوں نہیں لے لیتے۔

میں نے ایک دفعہ راے صاحب سے پوچھا کہ آپ اس قسم کے آدمی کیوں اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہنے لگے راؤ صاحب بات یہ ہے کہ میری طبیعت میں نرمی بہت ہے میں لوگوں سے بدلحاظ نہیں ہو سکتا سختی سے پیش نہیں آ سکتا چیف منسٹری ایسی چیز ہے کہ ہر قسم کے لوگ آتے ہیں سر پر آ سوار ہوتے ہیں بغیر وجہ کے وقت ضائع کرتے ہیں تو میں نے کمانڈر سجاد کو اس لیے رکھا ہوا ہے کہ جو سختی میں نہیں کر سکتا جو گالیاں میں نہیں دے سکتا جو بدلحاظی میں نہیں کر سکتا وہ اس سے کراتا ہوں۔

انہوں نے ایمانداری سے اپنی کمزوری کا اظہار کر دیا لیکن جو چیف منسٹر بوقت ضرورت بدلحاظی نہیں کر سکتا سختی نہیں کر سکتا اور اس کو آدمی رکھنا پڑتے ہیں آپ سمجھ جائیں کہ اس کی انتظامی قابلیت کس حد تک ہوگی اور اس کو چیف منسٹر ہونا چاہیے یا نہیں۔ شروع شروع میں میں راے صاحب کی ایک

شریف' ایماندار انسان کی حیثیت سے عزت بھی کرتا تھا لیکن دو چار ایسے قصے ہوئے کہ راے میرے دل سے اتر گئے میں نے دیکھا کہ کچھ سیاستدانوں کے خمیر میں سازشی انداز بہت نمایاں ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان کو مجھ پر پوری طرح سے اعتبار نہیں تھا یا سیاسی طور سے وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ یہ تو قاعدے قانون کے مطابق کام کرے گا۔ چنانچہ جو سیاسی سازشیں ہوتی تھیں جو ان کے سیاسی اقدامات ہوتے تھے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میری پیٹھ کے پیچھے ہوں۔ میرے ماتحتوں سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے اور یہ بدعہدی تھی کہ وہ میرے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس میں کمانڈر سجاد ہر محکمے میں ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ بڑے بااثر ہیں گھٹیا ذہنیت کے لوگ جو ہوتے ہیں ان کو اپنی پاٹے خانی کا بڑا احساس ہوتا ہے پولیس میں بھی کمانڈر سجاد نے یہ سمجھا کہ جو وہ چاہیں گے ہو جائے گا انہوں نے چند آدمیوں کے نام دیئے کہ اس کو وہاں سب انسپکٹر لگا دیں اس کو وہاں لگا دیں اور اس کو وہاں لگا دیں اس قسم کے احکامات کی میں پروا نہیں کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک تھانیدار کو لگانا ایس پی کا کام ہے اس میں چیف منسٹر کا کیا تعلق؟ آپ چیف منسٹر ہوتے ہوئے ایک تھانیدار کے تبادلہ میں کس لیے دلچسپی لیتے ہیں۔ سجاد نے لوگوں سے اپنے تعلقات بنائے ہوئے تھے لوگوں سے پیسے ویسے لیا کرتا تھا۔

یہ کام کراتے تو راے صاحب ہی تھے جو حکم ہوتا تھا وہ راے صاحب کا ہوتا تھا ورنہ کمانڈر سجاد کی کیا پوزیشن تھی وہ تو مجھے حکم نہیں دے سکتا تھا حکم تو راے صاحب کی طرف سے ہوتا تھا کہ چیف منسٹر نے یہ کہا ہے کہ چیف منسٹر نے اس کی منظوری دی ہے تو اس بات پر میری ان سے چپقلش شروع ہوئی اس کے بعد چند باتیں اور ہوئیں۔ مثلاً

سٹوڈنٹس ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتے رہتے تھے یہاں سٹوڈنٹس میں دو گروپ تھے۔ ایک جماعت اسلامی کا دوسرا پروگریسوز (ترقی پسند) کا ان گروپوں کے پاس ہتھیار بھی ہوتے تھے ایک دوسرے پر فائرنگ بھی کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں تین چار سٹوڈنٹس کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے فائرنگ وغیرہ کے کچھ کیسوں میں مطلوب تھے ان میں سے ایک کا نام مجھے یاد ہے فاروق ٹیررِٹ۔ اس کا PPP سے تعلق تھا تین چار اور تھے میں نے پولیس سے کہا ہوا تھا کہ آپ ان کو پکڑیں تو جب بھٹو صاحب نے پنجاب کا دورہ کیا اور ان کا آخری جلسہ لاہور میں تھا آخری کھلی کچہری بھی لاہور میں تھی جو لوگ راے صاحب کی ٹانگ کھینچنا چاہتے تھے انہوں نے وہاں کہا جناب یہ کیا حکومت ہے پولیس اتنے دنوں سے تین چار سٹوڈنٹس کے پیچھے پھر رہی ہے لیکن انہیں پکڑ نہیں سکی بھٹو صاحب نے کہا انہیں تین دن کے اندر اندر پکڑا جائے اب سٹوڈنٹس ایسے لوگ ہوتے ہیں کوئی کہیں جا کے چھپ گیا کوئی کسی دوست کے پاس چلا گیا

کوئی گھر سے باہر نہیں نکلا پولیس کوشش کر رہی تھی لیکن وہ پکڑے نہیں جا رہے تھے چونکہ رائے صاحب کو حکم ملا کہ تین دن کے اندر اندر ان کو پکڑا جائے ان کو سب سے زیادہ یہ پریشانی تھی کہ ان پر پہلے سے ہی کمزور ہونے کا ٹھپہ لگا ہوا ہے تو کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو ٹف بنانے کی کوشش بھی کرتے تھے انہوں نے مجھے بلا کے کہا کہ وہ سٹوڈنٹس نہیں پکڑے جا رہے؟ میں نے کہا کوشش کر رہے ہیں کہنے لگے راؤ صاحب یہ اس طرح سے نہیں پکڑے جائیں گے۔ ان کی ماؤں بہنوں کو تھانوں میں بٹھاؤ اور ان کا چھتراؤ کرو اس پر مجھے خیال آیا یہ دانش ور ہے پڑھا لکھا انسان ہے ہمیشہ جمہوریت کی اور لوگوں کے حقوق کی بات کرتا ہے لیکن جب ان لوگوں پر تھوڑا سا وقت آن پڑتا ہے تو یہ لوگوں کے حقوق جمہوریت اور انسانیت سب کچھ بھول جاتے ہیں یہ انہیں کیسے خیال آیا کہ ان کی ماؤں بہنوں کو پکڑا جائے اور تھانوں میں ان کا چھتراؤ کیا جائے چنانچہ ایک تو مجھے اس بات پر سخت دھچکا لگا کہ رائے صاحب وڈیرے نہیں تھے جاگیردار نہیں تھے وہ تو عوام میں سے تھے متوسط طبقے سے بھی شائد نہ ہوں لیکن چیف منسٹری بڑی عزیز تھی جو لوگوں کی ماؤں بہنوں پر پولیس سے چھتراؤ کرائے۔ یہ بڑی ناگوار صورت تھی۔

لاہور کالج فار ویمن کے سامنے ایک پاگل لڑکے نثار گل نے کچھ لڑکیوں پر چھرا چلایا تھا اور ایک لڑکی بیچاری ماری گئی تھی اس پر سٹوڈنٹس میں بڑا اشتعال تھا چونکہ پیپلز پارٹی کے لوگوں کی آپس میں ٹسل تھی ان کی ضرورت تھی کہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچیں۔ اس وقت عجیب خبریں آتی تھیں کوئی کہتا تھا اس کو کسی نے پلانٹ کیا ہے شراب پلائی اور لڑکیوں کو مروایا گیا ہے جب ہم نے انکوائری کی تو پتہ چلا کہ وہ لڑکا مینٹل کیس تھا لاہور آیا اس کالج کے سامنے اس نے آئس کریم بیچنا شروع کر دی وہ ایک غریب پٹھان تھا اس نے اس قسم کی زندگی دیکھی نہیں تھی صبح سے شام تک لڑکیاں دیکھ رہا ہے آتے ہوئے جاتے ہوئے بیوقوف سا تھا لڑکیاں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اس کے ذہن پر اثر پڑا لڑکیوں سے اس کو نفرت ہو گئی یا ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی پکچر دیکھی ہو سنا یہی ہے کہ لڑکیوں نے اس کا مذاق اڑایا ایسی بات کہی جس سے اس نے تذلیل محسوس کی پٹھان تھا برداشت نہیں کر سکا اس کو غصہ آ گیا چھرا لے کے جنون میں اس نے جتنی لڑکیاں وہاں تھیں ان پر حملہ کر دیا اس میں سازش ہمیں نظر نہیں آئی۔

اتفاق سے جب یہ قصہ ہوا میں اور رائے صاحب دونوں لاہور میں تھے میں نے رائے صاحب کو بتایا کہ بڑا ہیجان ہے تو انہوں نے کہا میں پریس کانفرنس کرتا ہوں اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا ہوم سیکرٹری بھی چیف سیکرٹری بھی اور ڈی آئی جی لاہور رینج آغا رضا بھی تھے۔ آغا صاحب بہت ایماندار آدمی تھے شریف آدمی تھے۔ رائے صاحب نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس طرح سے یہ قصہ ہوا ہے اور ہم یہ کر رہے ہیں وہ کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ ایک اخبار نویس نے یہ سوال پوچھا رائے

صاحب سنا ہے نثار گل پہلے سے وہاں نہیں تھا دو آدمی اس کو ایک لمبی سی کار میں وہاں چھوڑ کے گئے اس پر ڈی آئی جی بول پڑے انہوں نے کہا ہمیں بھی یہ خبر ملی تھی ہم نے اس کی انکوائری کی ہے ایسی کوئی بات نہیں یہ وہاں بیٹھتا تھا آئس کریم بیچتا تھا۔ لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتی تھیں اس پر یہ مشتعل ہوا یہ غلط ہے کہ کوئی اس کو کار پر چھوڑ گیا چنانچہ وہ سوال ختم ہو گیا اور سوالات ہوتے رہے اس صحافی نے پھر پوچھا رائے صاحب اس کا جواب دیں ڈی آئی جی نے کہا وہ تو میں بتا چکا ہوں ہم نے انکوائری کی ہے کوئی کار اس کو چھوڑ کے نہیں گئی تھی اچانک رائے صاحب ڈی آئی جی کی طرف متوجہ ہوئے آغا صاحب آپ اس امکان کو رد کیوں کرتے ہیں جس انداز سے رائے صاحب نے کہا مجھے فوراً یہ بات کھٹکی کہ رائے صاحب نہیں چاہتے کہ یہ بات رد کی جائے ورنہ وہ کہتے بھئی اس کا جواب ڈی آئی جی دے چکے ہیں۔ میرے بھی کچھ اخبار نویس واقف تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ رائے صاحب نے یہ سوال خود کرایا تھا اور ان کا مقصد یہ کہ نثار گل کو جو دو آدمی کار پر چھوڑ کے گئے ہیں وہ کھر کے آدمی تھے اور اس کو پیسے دیئے اور شراب یا چرس پلا کے وہاں چھوڑ کے گئے تاکہ وہ یہ کام کر دے اور اس سے رائے صاحب کی بدنامی ہو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ چیف منسٹر ہے اس کا کام تو ایمانداری سے نظم و نسق چلانا ہے یہ نہیں کہ وہ اور زیادہ الجھنیں پیدا کرے۔

اس کے بعد پشاور میں بھٹو صاحب نے میٹنگ رکھی تھی رائے وہاں چلے گئے ہمیں اطلاع ملی کہ کھر کے گروپ کے سٹوڈنٹس خاص طور سے لڑکیاں صوبائی انتظامیہ کے خلاف جلوس نکالنا چاہتی ہیں مجھے نام تو ان کے یاد نہیں رہے۔ بہرحال میں شام کے وقت اپنے گھر پر تھا چیف سیکرٹری مسرور حسن خاں کا فون آیا وہ بھی دانش ور اور شریف آدمی ہیں جب میں نے نیپا کا کورس کیا تو وہ وہاں ڈائریکٹر ہوتے تھے ان سے اچھے خاصے مراسم تھے لیکن جب آدمی سے واسطہ پڑتا ہے اس وقت اس کا پتہ چلتا ہے یا راہ پیا جانیے یا واہ پیا جانیئے تو مسرور حسن خان صاحب کا فون آیا کہ چیف منسٹر صاحب کہتے ہیں لڑکیوں کو گرفتار کر لیں۔ میں نے کہا آپ اس معاملے کو سلجھانا چاہتے ہیں یا الجھانا؟ اس لیے کہ اس لڑکے نے ایک لڑکی کو مارا ہے لڑکیوں میں ہیجان ہے اگر وہ جلوس نکالنا چاہتی ہیں تو جائز بات ہے لڑکیاں نوجوان ہیں غیر شادی شدہ ہیں پولیس انہیں پکڑ کے لے جائے گی آپ لاہور میں ہنگامہ کرانا چاہتے ہیں کہنے لگے یہ چیف منسٹر صاحب نے کہا ہے میں نے کہا آپ ان سے کہیں کہ اس سے پوزیشن زیادہ خراب ہو گی وہ دوبارہ سوچ کر مجھے بتائیں تھوڑی دیر بعد پھر فون آیا کہ چیف منسٹر صاحب کہتے ہیں۔ "یہ میرا حکم ہے" رائے صاحب کبھی کبھی چنگیزی حکم سنا دیا کرتے تھے انہوں نے کہا یہ میرا حکم ہے۔

جب میں آیا تھا تو بھٹو صاحب نے مجھے کہا تھا جب کوئی مسئلہ ہو پرابلم ہو تم مجھ تک پہنچ سکتے ہو میں یہ سمجھتا تھا کہ اس سے مسئلہ سلجھے گا نہیں الجھے گا چنانچہ میں نے بھٹو صاحب کے ملٹری سیکرٹری کو فون کیا

کہ راے صاحب کا یہ حکم ہے آپ کو پتہ ہے کہ یہاں کیا سلسلہ چل رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ صوبے میں کوئی خون خرابہ ہو کوئی گڑ بڑ ہو ہمارا کام تو امن عامہ برقرار رکھنا ہے اس حکم سے امن عامہ سلجھے گا نہیں الجھے گا آپ پرائم منسٹر صاحب کو بتا دیں کہ چیف منسٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے اگر یہ حکم رہتا ہے تو میں آئی جی ہوں ظاہر ہے مجھے اس پر عمل کرنا پڑے گا لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب سے بات کی اور بات کر کے مجھے بتا دیا کہ بھٹو صاحب کہتے ہیں یہ مت کرنا اور تمہیں حکم مل جائے گا۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ بھٹو صاحب نے حکم دے دیا ہے۔ راے صاحب کو انہوں نے کافی ڈانٹا کہ تم کیا حرکتیں کرتے ہو اس میں کونسی دانشمندی ہے کونس عقلمندی ہے تم چاہتے ہو کہ میرے لیے مسائل پیدا ہوں پھر مسرور حسن خاں کا فون آیا چیف منسٹر صاحب کہتے ہیں دوبارہ سوچا ہے' ٹھیک ہے' لڑکیوں کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں سمجھ گیا کہ انہوں نے دوبارہ کس طرح سوچا ہے۔

بڑے عہدے پر فائز لوگوں کو اس طرح کی گھٹیا باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اگر آپ کو بھٹو صاحب نے کہا کہ ایسا نہیں کرنا تو آپ کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے تھا کہ بھٹو صاحب نے منع کر دیا ہے' انہوں نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہہ دیا کہ دوبارہ سوچا ہے میں نے۔

اس سے اچھے اور برے ایڈمنسٹریٹر کا پتہ چلتا ہے اور دانشور اور غیر دانشور کا بھی۔

بہر حال مجھ میں اور راے صاحب میں کھچاؤ شروع ہو گیا ایک روز ڈی آئی جی لاہور آغا رضا نے مجھے بتایا کہ چیف منسٹر نے انہیں بلا کے حکم دیا ہے کہ ایم پی اے مرزا طاہر بیگ کو اس کے گھر سے پکڑ کے لے جاؤ کسی دور ریسٹ ہاؤس میں اسے کھلاؤ پلاؤ۔ وہاں اس کو خوب شراب پلاؤ اس کے بعد اس سے استعفیٰ لکھوا کے میرے پاس لے آؤ'' آغا رضا نے بتایا کہ راے صاحب چاہتے یہ ہیں کہ میں آپ کو بتائے بغیر ایسا کروں لیکن میں نے انہیں یہ جواب دیا کہ آپ آئی جی صاحب سے بات کریں وہ مجھے حکم دیں گے تو کر دوں گا اس طرح سے ڈی آئی جی نے اپنی جان بچائی۔ میں نے ڈی آئی جی سے کہا۔ اگر راے صاحب دوبارہ پوچھیں تو آپ کیا کہیں گے انہوں نے کہا میں کہوں گا کہ آپ آئی جی صاحب کو کہہ دیں وہ حکم دے دیں تو کر دوں گا۔ چنانچہ جب ان سے دوبارہ پوچھا گیا تو انہوں نے وہی جواب دیا آپ آئی جی صاحب سے بات کر لیں اگر وہ فرمائیں گے تو کر لوں گا آخر کار میں ان کے ماتحت ہوں ان کی اجازت کے بغیر میں نہیں کرنا چاہتا چنانچہ راے صاحب سمجھ گئے پھر انہوں نے مجھے فون کیا راؤ صاحب میں نے ایک آدمی کے متعلق ڈی آئی جی کو حکم دیا ہے اس کو آپ بھی کہہ دیں میں نے کہا اس نے مجھے بتایا تھا اس سلسلے میں میں اور ڈی آئی جی آپ سے آ کے بات کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں ڈی آئی جی لاہور آغا رضا اور ڈی آئی جی سپیشل برانچ عبدالقیوم ان کے پاس گئے۔ عبدالقیوم صاحب چونکہ راے صاحب کی

برادری کے بھی تھے ان کے قابل اعتماد آدمی تھے ہم تینوں نے طے کیا کہ ہم راے صاحب کو جا کے سمجھاتے ہیں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ اگر اس نے زبردستی استعفیٰ دے بھی دیا تو پھر وہ اخبارات میں بیان دے گا کہ انہوں نے مجھ سے زبردستی کرایا ہے سوائے اس کے کہ ہماری پوزیشن خراب ہو اس کا کوئی مقصد مجھے نظر نہیں آتا بدنامی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اس قسم کا قصہ کھر کے زمانے میں بھی ہو چکا تھا اس وقت میرا خیال ہے، کوثر علی شاہ صاحب تھے شائد راے صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر کھر کر سکتا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں کھر ان کے ذہن پر ہمیشہ سوار رہتا تھا کہا کرتے تھے راؤ صاحب آپ کو معلوم نہیں میں نے شیر کو پنجرے میں بند کیا ہوا ہے۔

بہر حال میں، آغا رضا اور قیوم ہم تینوں راے صاحب کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ ان کی ایک خاص کرسی تھی۔ ہمیشہ وہ اس پر آکے بیٹھا کرتے تھے ٹیلی فون ساتھ ہوتا تھا گھنٹی بھی ساتھ ہوتی تھی ہم یہ پروگرام بنا کے وہاں پہنچے تھے کہ میں خاموش بیٹھا رہوں گا آغا رضا بات کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو ریٹائرڈ آدمی ہوں اور دوبارہ ملازمت میں لیا گیا ہوں آپ نے ابھی کئی سال سروس کرنی ہے آپ بیٹھے رہیں آپ کی یہی سپورٹ کافی ہے فیصلہ یہ تھا کہ آغا رضا بات کریں گے یہی ان کو سمجھائیں گے کہ سوائے بدنامی کے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ویسے بھی سمجھانے کی بات تھی گرفتار کرنے کا ہمارا ارادہ کسی صورت بھی نہیں تھا چنانچہ راے صاحب آئے السلام علیکم وعلیکم سلام راے صاحب کی عادت تھی کہ بیٹھے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، سوچتے بھی رہتے تھے اور اپنے ہاتھ سے فضا میں خیالی خطاطی کرتے رہتے تھے کہنے لگے کہئے کیسے تکلیف کی ہے۔ میں نے کہا آپ نے طاہر بیگ کے متعلق حکم دیا تھا اس سلسلے میں آغا صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں کہنے لگے ''ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ کا ارادہ یہ کرنے کا نہیں ہے بہر حال میں نے یہ نوٹ کر لیا ہے کہ میں نے ایک حکم دیا تھا میرا وہ حکم آپ نے نہیں مانا'' اس پر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ان کا حکم گویا قرآن کی آیت ہے میں نے کہا چیف منسٹر صاحب جہاں تک آپ کے حکم کا تعلق ہے تو میرا اور آپ کا جو رشتہ ہے وہ سرکاری رشتہ ہے۔ قاعدے قانون کا رشتہ ہے جس طرح سے قاعدے قانون کا میں پابند ہوں اسی طرح سے قاعدے قانون کے آپ پابند ہیں اگر آپ کا حکم قانونی ہوگا تو میں اس کو پورا کروں گا ہو سکتا ہے دوسروں سے بہتر کروں اگر آپ چیف منسٹر ہیں اور میں آئی جی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات پوری کرنا میرا فرض ہے چاہے وہ کتنی ہی غیر قانونی کیوں نہ ہو میں آپ کا ذاتی ملازم تو نہیں ہوں تو راے صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی گفتگو کا بڑا نرم انداز ہے ویسے بھی عام طور سے مجھے غصہ نہیں آتا لیکن انہوں نے بات ہی ایسی کی۔ کہنے لگے۔ نہیں نہیں راؤ صاحب میں آپ کو ذاتی ملازم کیسے سمجھ سکتا ہوں میں

نے کہا اس کا تو مجھے بھی پتہ ہے کہ آپ مجھے اپنا ذاتی ملازم نہیں سمجھتے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میں نے تو ایک دلیل دی ہے چونکہ آپ چیف منسٹر ہیں آپ کا شائد خیال ہو کہ سرکاری ملازم آپ کے ذاتی ملازم ہیں اس میں ذاتی ملازمت کی بات نہیں ہے اس میں رشتے قاعدے قانون کے ہیں یہ میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہنے لگے میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں میں نے کہا اس کا عزت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس قسم کا حکم میں بالکل نہیں مانتا۔ چنانچہ بیچارہ بڑا پریشان سا ہوا کہنے لگا نہیں نہیں، آپ تو ناراض ہو گئے میرا مطلب یہ تھا، وہ تھا چنانچہ انہوں نے بات ٹال دی۔ تو میں وہاں سے چلا آیا آغا رضا بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے، ہنس کے کہنے لگے آپ نے مجھے تو موقع ہی نہیں دیا آپ کو اتنی سخت بات کہنے کی کیا ضرورت تھی میں عمر میں زیادہ ہوں میں بات کرتا تو اس کا فائدہ تھا صلح صفائی کر جاتا آپ نے تو بالکل ڈنڈا ہی مار دیا میں نے کہا انہوں نے بات ہی ایسی کی تھی۔

پھر تعلقات کشیدہ سے ہو گئے دراصل کمزور آدمی جب ایڈمنسٹریٹر ہو تو آہستہ آہستہ لوگ اس پر چھا جاتے ہیں میں چونکہ کسی کی ناجائز بات نہیں مانتا تھا اس لیے عام طور سے مجھ سے کبھی ناراض رہتے تھے۔ چیف منسٹر بھی ناراض تھے ان کا سٹاف بھی ناراض تھا۔

رائے صاحب کا جو سب سے بااثر آدمی تھا شاہد حامد۔ وہ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ رائے صاحب کے ذہن پر وہ چھا گیا تھا شاہد حامد بھی مجھ سے ناراض تھے اس لیے کہ سی ایس پی کی ایڈمنسٹریشن میں بالادستی میں نے کبھی نہیں مانی۔ کئی دفعہ انہوں نے میری ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی لیکن میٹنگوں میں میں بھی معاف نہیں کرتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ رائے صاحب نے مجھے فون کیا مجھے بتایا تو نہیں اتنا کہا کہ کچھ دوست آئے ہوئے ہیں ان کی عادت تھی کہ جب وہ میٹنگ بلاتے تھے لوگوں کو دوست کہہ کر خطاب کرتے تھے چنانچہ انہوں نے کہا کہ دوست آئے ہوئے ہیں وہ میٹنگ کرنا چاہتے ہیں آپ بھی تشریف لے آئیں۔ میں گیا تو چیف سیکرٹری ہوم سیکرٹری ان کا نام یاد نہیں رہا وہ بھی سی ایس پی تھے اور شاہد حامد بیٹھے تھے۔ رائے صاحب نے کہا دوستوں کا خیال ہے کہ سپیشل برانچ کا جو ڈی آئی جی ہے وہ کیوں نہ کسی اور کو لگا دیں اس لیے کہ یہ ایسی جاب نہیں ہوتی جہاں پولیس افسر ہی لگے پھر یہ بھی شکایت ہے کہ وہ ہمیں پولیس کے متعلق خبریں نہیں پہنچاتے وغیرہ وغیرہ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے اگر آپ کا یہ ذہن ہے تو کر لیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کسی انسٹی ٹیوشن کو بنانے میں سو سال لگتے ہیں اجاڑنے میں ایک دن بھی نہیں لگتا میں نے کہا، یہ مجھے پتہ ہے کہ یہ تجویز آپ کی نہیں میرے یہ جو دوست بیٹھے ہوئے ہیں یہ تجویز ان کی ہے۔ میں نے کہا دوستوں کے ساتھ ہماری پرانی ٹسل چلی آ رہی ہے ان کا ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ پاکستان کی جو دوسری سروسز ہیں ان سب کو اپنے زیر رکھیں جب بھی کوئی موقع ملتا ہے یہ کوشش کرتے ہیں

کہ اپنی ٹانگ اوپر رکھیں چونکہ بھٹو صاحب نے آ کے ان کی چودھراہٹ ختم کی ہے۔ اس لیے یہ انتظار میں ہیں اور آپ کے نزدیک ہو گئے ہیں۔ پھر کوئی موقع ملا تو یہ پولیس کو بھی اپنے زیر کریں گے۔ مسرور حسن خان بڑے سخت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے راؤ صاحب ہمارے سامنے ہم پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ سر میں اس کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہوں۔

رائے صاحب بیچارے صلح پسند آدمی تو ہیں اس میں کوئی شک نہیں انہوں نے دیکھا کہ دوستوں میں جھگڑا ہو گیا ہے انہوں نے کہا نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ کو تبادلہ خیال کے لیے بلایا تھا پھر کبھی مل لیں گے اس میں ایسی جلدی کی بات نہیں چنانچہ وہ تجویز ختم ہو گئی۔

میں رات کو بھی ہمیشہ ٹیلی فون اپنے پاس رکھتا تھا تا کہ ایمرجنسی کی صورت میں کسی کو مشکل نہ پڑے ایک دفعہ رات کے دو بجے رائے صاحب نے مجھے فون کیا کہ آپ ذرا تشریف لے آئیں کچھ دوست بلائے ہوئے ہیں ڈریسنگ گاؤن میں ہی بیشک آ جائیں گرمیوں کے دن تھے میں نے پتلون قمیض پہنی اور پہنچ گیا وہاں بیٹھے ہوئے تھے رائے صاحب اور کمانڈر سجاد رائے صاحب اپنے ہاتھ سے ہوا میں خطاطی کر رہے تھے۔ چیف سیکرٹری بھی آ گئے سپیشل برانچ کے ڈی آئی جی بھی آ گئے۔ ڈائریکٹر اینٹی کرپشن بھی آ گئے میں سمجھا' پتہ نہیں ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے یا تیسری جنگ عظیم چھڑ گئی ہے یا کوئی بغاوت ہونے لگی ہے۔ سب انتظار میں ہیں۔ رائے صاحب اپنے خیالات میں گم ہیں جب سب آ گئے تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے اب سب دوست آ گئے ہیں تجویز یہ ہے کہ افتخار تاری کو گرفتار کرنا ہے میں نے کہا اس میں کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ یہ حکم تو تھانیدار کو ملتا وہ کر دیتا کہنے لگے نہیں اس کی بیوی کو بھی گرفتار کرنا ہے میں نے کہا کس سلسلے میں! کہنے لگے کرپشن کا کیس ہے میں نے کہا' رائے صاحب کرپشن کا کیس اینٹی کرپشن کا تھا' گرفتار انہوں نے کرنا تھا ہماری انہیں معاونت درکار تھی تو مل جاتی البتہ میں آپ سے یہ بات ضرور کروں گا کہ سیاسی گرفتاریوں میں عورتوں تک نہ پہنچیں تو بہتر ہے رائے صاحب ذہین آدمی تھے سمجھ گئے میرا اشارہ یہ ہے کہ کبھی آپ کا بھی نمبر آیا' تو آپ کی بیوی تک بھی پہنچا جا سکتا ہے۔

میں نے اشارۃً کہا' بہتر ہے کہ عورتوں تک نہ پہنچیں ذہین آدمی تھے بات سمجھ گئے چنانچہ انہوں نے تھوڑی سوچ بچار کر کے کہا ٹھیک ہے کیا کریں حکم ہے بیوی کو پکڑنا ہے۔ کس کا حکم تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا بہرحال میں نے کہا اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اگر ان کے خلاف کیس رجسٹر ہو گیا ہے بیگم کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضمانت کرا لے' اس نے کوئی قتل نہیں کیا ٹھیک ہے بات بھی پوری ہو جائے گی چنانچہ رائے صاحب نے پتہ نہیں کس کی ڈیوٹی لگائی کہ تاری کی بیوی سے کہنا' ضمانت کرا لے اور تاری کو گرفتار کر لیں۔

وہ خواہ مخواہ کا ایک ڈرامہ تھا۔ اس کام کے لیے رات دو بجے بلانے کی کوئی تک نہیں تھی

بہر حال' سیاستدانوں کے اپنے انداز ہوتے ہیں۔

ان کی مجھ سے مایوسی بڑھتی رہی اس لیے جس طرح سے وہ چاہتے تھے میں وہ کام نہیں کرتا تھا انہیں خیال آیا کہ اس شخص کی وجہ سے پولیس پر ان کا وہ کنٹرول نہیں جو چیف منسٹر کا ہونا چاہیے چنانچہ ایک اور واقعہ ہوا جس سے زیادہ بدمزگی ہوئی کہ ایک بہت ہی بدنام انسپکٹر ان کے سٹاف میں تھا شیر خاں نیازی شائد اس کا نام تھا' وہ راے صاحب کا سیکورٹی انسپکٹر لگا ہوا تھا اس قسم کے لوگ اگر اہم جگہ پر لگ جائیں تو وہ اپنے گروپ اور احباب کے لیے سفارشیں بھی کرتے ہیں فلاں کو فلاں جگہ لگا دو وہ پولیس کی خبریں بھی راے صاحب کو پہنچایا کرتا ہوگا چونکہ اس کو پتہ تھا کہ یہ تو مجھے پروموٹ نہیں کرے گا اس نے راے صاحب سے آرڈر کرالیا کہ اس کو ڈی ایس پی پروموٹ کیا جاتا ہے میں نے اس کا ریکارڈ دیکھا' بڑا خراب تھا وہ سکرین آؤٹ ہوا تھا۔ اس کے خلاف انٹی کرپشن کا کیس بھی تھا میں نے راے صاحب سے کہا' اس آدمی کا یہ ریکارڈ ہے صرف اس لیے کہ یہ آپ کے پاس لگا ہوا ہے آپ اس کو آؤٹ آف ٹرن ترقی دینا چاہتے ہیں، اس سے اچھا کام کرنیوالے موجود ہیں ان کا ریکارڈ اچھا ہے اس پروموشن کا ان پر کیا اثر پڑے گا بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کے پاس رہنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ چیف منسٹر کے سٹاف میں تو بڑے اچھے اور کلین لوگ رہنے چاہئیں چنانچہ یہی نہیں کہ میں نے اس کو پروموٹ نہیں کیا بلکہ اس کا تبادلہ کر دیا اس پر راے صاحب بڑے ناراض ہوئے کہنے لگے' میری بدنامی ہوئی ہے اور یہ کہ آپ کو میرا حکم ماننا چاہیے میں نے کہا حکم کی بات نہیں سوال یہ ہے کہ ایک انسپکٹر کو پروموٹ کرنا میرا کام ہے۔ چیف منسٹر کا یہ کام نہیں۔

مطلب یہ کہ' راے صاحب کے ساتھ اس قسم کی چخ چخ شروع ہوگئی اس دوران پھر یہ بھی ہوا کہ مجھ سے پہلے پولیس کے لیے دو مرسیڈیز گاڑیوں کے آرڈر پلیس ہو چکے تھے میرے پیش رو نے ان کا انتظام کیا تھا۔ ان کے زمانے میں وہ نہ آسکیں' اتفاق سے میرے زمانے میں وہ گاڑیاں آگئیں تو آئی جی کی جو پہلی پرانی مرسیڈیز تھی وہ میں نے ڈی آئی جی کو دے دی' نئی مرسیڈیز میرے پاس آگئی۔ سٹاف کار جو دوسری تھی وہ ایڈیشنل آئی جی کو چلی گئی اس پر لوگوں کو حسد اور جلن محسوس ہوئی۔ وزیروں نے کہا کہ ہمارے پاس پرانی ٹویوٹا کراؤن ہیں اور آئی جی مرسیڈیز میں پھرتا ہے اس پر راے صاحب نے حکم دیا کہ ان دونوں گاڑیوں کو گورنمنٹ کے پول میں ٹرانسفر کر دیا جائے میں نے انہیں جواب لکھا' کہ یہ دونوں مرسیڈیز پولیس کے بجٹ سے آئی ہیں اور پولیس کے لیے استعمال ہوسکتی ہیں یہ پول میں نہیں جاسکتیں اگر گورنمنٹ کو ضرورت ہے تو وہ اپنی منگوا لے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں بہر حال میں نے ان گاڑیوں کو پول میں نہیں بھیجا میں نے کہا ٹھیک ہے کوئی زبردستی مجھ سے لے جانا چاہتا ہے تو لے جائے ظاہر ہے آئی جی

پولیس سے کوئی زبردستی تو نہیں کرسکتا وہ بڑا کہتے رہے کہ یہ بات نہیں مانتا بہرحال انہی دنوں ان کی اور کھر کی کشمکش عروج پر پہنچ گئی اور رامے صاحب کو مستعفی ہونا پڑا جب وہ گئے ہیں مجھ سے خوش نہیں گئے جاتے ہوئے انہوں نے لوگوں کو بہت نوازا کسی کو چار کنال دیئے کسی کو دو کنال کے پلاٹ دیئے شادمان میں اور ادھر ادھر یہاں تک کہ میرے جو ایس پی تھے ان کو بھی دے گئے میں نے نہ ان سے کوئی پلاٹ مانگا نہ انہوں نے دیا نہ مجھے توقع تھی جس طرح سے میں نے ان کے ساتھ گزارا کیا تو ان کے پلاٹ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر پلاٹ مولویوں کو دیئے صحافیوں کو دیئے بے شمار لوگوں کو انہوں نے نوازا۔ نوائے وقت کے لوگوں کو دیئے ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ آئندہ سیاسی زندگی میں ان کے کام آئیں گے۔

رامے صاحب کی کھر کے ساتھ آخری جو کشمکش تھی بڑی دلچسپ تھی وہ یہ کہ جب کھر گورنر بن گئے ان کا دوبارہ گورنر بننا لوگوں کے لیے کافی تعجب کا باعث تھا لیکن بھٹو صاحب کی اپنی سیاسی سوجھ بوجھ تھی اپنے حالات کے مطابق وہ اس قسم کی باتیں کرتے تھے، اس سے یہ ہوا کہ رامے صاحب کی پوزیشن بڑی خراب ہوگئی ہم سرکاری افسران کو پتہ نہیں ہوتا تھا کدھر جائیں کبھی گورنر اپنی طرف کھینچتا ہے کبھی چیف منسٹر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ چنانچہ ہماری پوزیشن خراب بھی تھی اور دلچسپ بھی، ہم ان کا تماشا دیکھ رہے تھے اور یہ بچوں کی طرح اس بات پر آپس میں لڑ رہے تھے کھر نے کہا چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس آکے مجھ سے ملا کریں رامے صاحب نے کہا نہیں، یہ ان سے ملنے نہیں جائیں گے اس بات پر بہت دیر ان کا جھگڑا چلتا رہا۔ شکایت بھٹو صاحب تک پہنچی کھر صاحب نے کہا جی گورنر کے بھی کچھ اختیارات ہیں اس کا بھی کچھ حق ہے اگر یہ میرے پاس نہیں آئیں گے تو میرے یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ اس لیے جو افسر ہیں انہیں مجھ سے ملنا چاہیے اور اگر میں ان سے کوئی سوال پوچھتا ہوں تو انہیں بتانا چاہیے کہ کیا حالات ہیں چنانچہ اس بات پر مری میں ایک میٹنگ ہوئی مجھے بلایا مسرور حسن خاں (چیف سیکرٹری) کو بلایا کھر کو بلایا۔ رامے صاحب موجود تھے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ لیکن بعد میں رامے صاحب نے آ کے بتایا۔ پرائم منسٹر صاحب کہہ رہے تھے ٹھیک ہے ہفتے میں ایک دفعہ مل لیا کریں۔ رامے صاحب نے یہ بھی کہا لیکن چیف سیکرٹری اور آئی جی دونوں ساتھ ساتھ ملیں گے۔ علیحدہ علیحدہ نہیں ملیں گے مطلب یہ کہ علیحدہ ملنے پر کھر کسی کے کان میں کچھ پھونک نہ دیں اور رامے صاحب کے خلاف سازش نہ شروع ہو جائے مسرور حسن خاں بھی شریف آدمی تھے انہیں کسی سازش میں کوئی کردار ادا کرنے کی خواہش نہ تھی اور نہ مجھے اس قسم کی کوئی خواہش تھی چنانچہ میں اور مسرور حسن خاں ہفتے میں ایک دفعہ جا کے گورنر صاحب سے ملا کرتے تھے "ہیلو کیا حال ہیں۔" چائے پی اور آ گئے۔

پھر اس زمانے میں یہ ہوا کہ یونیورسٹی سے بھی آگے نہر کے کنارے کھر صاحب کا مکان بن رہا تھا بلکہ اس کا کچھ حصہ تیار بھی ہو گیا تھا وہاں انہوں نے رہنا شروع کر دیا ایک روز انہوں نے شکایت کی راؤ صاحب میرے گھر پر کسی نے فائرنگ کی ہے اب وہ ایسی جگہ تھی وہاں نہ پولیس تھی نہ تھانہ۔ انہوں نے بھٹو صاحب سے بھی شکایت کی کہ ان کے گھر پر کسی نے فائرنگ کی ہے۔ میں نے کہا' ٹھیک ہے میں اس کا انتظام کروں گا میں نے وہاں کچھ پولیس متعین کر دی دو چار دن بعد پھر ان کا فون آیا دیکھیں' آپ کی پولیس موجود تھی اس کے باوجود ایک کار تیزی سے گزرتی ہوئی میرے گھر پر فائرنگ کر گئی۔ اب مجھے پتہ نہ لگے کہ کھر صاحب رامے صاحب کو بے حوصلہ کرنے کے لیے خود فائرنگ کرا رہے ہیں' یا رامے صاحب کھر صاحب کو ڈرانے کے لیے فائرنگ کرا رہے ہیں باقی اور کسی کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا تو اس قسم کے قصوں میں ہمارا وقت گزرتا تھا۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھٹو صاحب نے دونوں کو فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا فیصلہ تو پہلے سے کیا ہوا ہو گا۔ ان کا ایک خاص پروگرام تھا کہ اس ٹائم ٹیبل کے تحت سب کچھ ہوتا رہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں جائیں گے نیا چیف منسٹر اور نیا گورنر ہو گا۔ اب گورنری کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔

فائرنگ کا پتہ چلا نہ پتہ چلنے کا کوئی امکان تھا' اس لیے کہ اگر کھر صاحب نے کرائی تو ان کے آدمی تھے۔ کار گزرتی ہوئی فائرنگ کر جاتی ہے میں نے اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس لیے کہ اس سے امن عامہ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ان کی ذاتی چپقلش تھی اس کا پنجاب کے صوبے کے امن وامان سے تو کوئی تعلق نہیں تھا۔

آپ حیران ہوں گے جب یہ لوگ چلے گئے میرا خیال ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر ان کی آپس میں صلح ہو گئی دونوں نے مل کے مسلم لیگ جائن کر لی حالانکہ جب رامے صاحب کا چل چلاؤ تھا تو انہوں نے پنجاب اسمبلی میں بڑی دھواں دھار تقریر کی تھی اس میں بلھے شاہ کا بھی حوالہ دیا ایشیا سرخ ہے کی ایک بنیاد بنا رہے تھے کہ چیف منسٹری چھوٹنے کے بعد وہ روٹی کپڑے اور مکان کا نعرہ صحیح طور سے اپنے ہاتھ میں لے کے چلیں گے۔ اصلی سوشلزم کی قیادت کریں گے وہ بھٹو صاحب کے خلاف تیاری کر رہے تھے لیکن پھر پتہ چلا کہ ہفتے دو ہفتے میں ایشیا سرخ ہونے کی بجائے سبز ہو گیا ہے' اس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ ان لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں کوئی سیاست نہیں ہے کوئی اصول نہیں ہے صرف ایک ہی اصول ہے کہ کسی طرح انہیں طاقت اور اقتدار میں حصہ ملتا رہے۔

سینٹ میں ایک سیٹ خالی ہوئی تھی رامے صاحب سے کہا گیا کہ آپ سینٹ کے لیے الیکشن

لڑیں اس کے لیے اور لوگوں نے بھی عرضیاں دیں۔ رائے صاحب نے بھی اپلائی کیا۔ ان کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ دوستوں نے سنایا کہ رائے صاحب جب وہاں سے واپس آئے ہیں تو کمانڈر سجاد بھی ان کے ساتھ اترے چنانچہ لوگوں نے سمجھا کہ کمانڈر سجاد بڑا وفادار آدمی ہے حالانکہ حنیف رائے صاحب چیف منسٹر نہیں ہیں لیکن یہ پھر بھی ان کے ساتھ راولپنڈی گیا مگر جو لوگ ان کو ریسیو کرنے گئے ان سے رائے صاحب نے کہا آپ کو پتہ ہے یہ کس لیے پنڈی گئے تھے۔ انہوں نے جواب دیا آپ کے ساتھ گئے ہونگے۔ رائے صاحب نے بتایا نہیں میرے ساتھ نہیں گئے یہ بھی ایک امیدوار ہیں اسی سیٹ کے لیے چنانچہ سجاد صاحب امیدوار ہو کے گئے تھے جہاز میں یہ ہوا کہ رائے صاحب جب ان کے پاس آ کے بیٹھے' انہوں نے پوچھا کمانڈر صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں کمانڈر صاحب نے بتایا میں بھی اسی کام کے لیے جا رہا ہوں' جس کے لیے آپ جا رہے ہیں'

بہرحال' رائے صاحب مخالف کیمپ میں چلے گئے اپوزیشن کی سیاست شروع کر دی تو اس میں پھر وہ زیر عتاب آئے۔

رائے صاحب سے میرا تعلق وہیں ختم نہیں ہو گیا چلتا رہا اس لحاظ سے کہ جب وہ اپوزیشن میں چلے گئے اور جس طرح سے ہمیشہ ہوتا آیا ہے اب سلسلہ شروع ہوا کہ ان کو پکڑا کس طرح سے جائے اور کب پکڑا جائے' تسلسل شروع ہو گئی' اس میں ہوا یہ کہ نہ وارنٹ تھے' نہ ڈی آئی جی لاہور نے حکم دیا ایس پی نے بغیر کسی سے پوچھے' ان کو گرفتار کر لیا اور سول لائنز میں لے گیا چنانچہ جب ڈی آئی جی کو پتہ چلا اس نے مجھے بتایا میں نے کہا مجھے تو کوئی اطلاع نہیں کہ ان کو پکڑنا ہے چیف منسٹر صادق قریشی سے پوچھا اس نے بتایا مجھے بھی پتہ نہیں کہ ان کو پکڑنا تھا' جب ایس پی کو پتہ چلا کہ غلطی ہو گئی ہے اس نے کسی پر الزام لگایا کہ فلاں نے کہا تھا پھر جلدی سے ڈی آئی جی اپنی جان چھڑانے کے لیے تھانے میں پہنچا اور اپنی کار میں رائے صاحب کو ان کے گھر میں چھوڑ آیا اب یہ جو سیاستدان ہیں بدقسمتی سے جو بھی سیاست میں آتا ہے تو سیاست میں لوگوں کا ذہن پاکستان میں چھوٹے سے چھوٹا ہوتا گیا رواداری اور لحاظ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔

پرائم منسٹر کو شکایت گئی کہ جناب رائے آپ کو گالیاں دیتا پھرتا ہے اور پولیس کا یہ حال ہے کہ ڈی آئی جی نے اپنی مرسیڈیز بھیجی کہ ان کو ان کے گھر چھوڑ کے آئے چنانچہ پھر میٹنگ ہوئی صادق حسین قریشی چیف منسٹر تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ شکایت ملی ہے میں نے کہا اگر ایسا ہو گیا تو کوئی ہرج نہیں تھا آخر کار وہ چیف منسٹر تھے' آپ بھی آج چیف منسٹر ہیں' کل آپ بھی توقع کریں گے کہ آپ کی عزت کی

جائے اگر میں اپنی بھی گاڑی بھیج دیتا تب بھی ایسی کوئی جرم کی بات نہیں تھی وہ تو ڈی آئی جی کو پتہ چلا کہ رامے صاحب کو غلطی سے پکڑلیا گیا ہے تو وہ اپنی گاڑی میں چھوڑ آئے۔

مطلب یہ کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی لوگ پرائم منسٹر کا وقت ضائع کرتے تھے۔ اس کے لیے میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔

کھر صاحب کا جانا میرا خیال ہے پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے بہت نازک مرحلہ تھا۔ اس کے بعد میں بھی بڑے سیاسی اثرات ہوئے میں سمجھتا ہوں ایک طرح سے جو تحریک چلی اور بھٹو صاحب کی جو غیر ہر دلعزیزی ہوئی اس میں پہلا دراڑ دراصل کھر صاحب والا قصہ تھا اس کے بعد جے اے رحیم کا ہوا خورشید حسن میر کا قصہ ہوا مطلب یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا میں سمجھتا ہوں کہ کھر کے جانے سے ہوا۔

پھر جب گورنری کی بات ہوئی تو کچھ لوگوں کے نام آنا شروع ہو گئے ایک چیف سیکرٹری ہوا کرتے تھے آغا افضل ان کا بڑا نام آیا کہ انہیں گورنر لگا رہے ہیں وہ کھر کے بڑے دوست تھے۔ بھٹو صاحب نے شروع شروع میں ان پر کافی اعتماد کیا تھا انہیں چیف سیکرٹری رکھا' لگایا تو انہیں یحییٰ خان نے تھا۔

کئی نام آئے لیکن بھٹو صاحب نے جو چیز کرنا ہوتی تھی وہ اپنے پاس ہی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عباسی کو گورنر بنا دیا صادق حسین قریشی کو چیف منسٹر بنا دیا بہرحال کھر صاحب اور رامے صاحب باہر گئے تو میرا خیال ہے انہوں نے سوچا ہو گا کہ دونوں کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ زیادتی ہوئی ہے پھر کھر کو قابو کیا چودھری ظہور الٰہی نے پھر سب مل کے رامے کے پاس گئے کہ تم بھی ادھر آ جاؤ اور یہ سب مسلم لیگ میں چلے گئے۔

رامے صاحب چیف منسٹر تھے تو صادق قریشی گورنر تھے پھر انہیں ہٹا کے کھر کو گورنر بنایا گیا پھر کھر اور حنیف رامے دونوں کو ہٹا دیا گیا اس دوران میں صادق قریشی کو پتہ تو تھا کہ وہ چیف منسٹر بنیں گے پہلے سے طے ہو چکا تھا لیکن اس بیچارے کو پکا یقین نہیں تھا کہ نہ معلوم کیا گڑبڑ ہو جائے کہ بھٹو صاحب اپنا ارادہ بدل دیں وہ بہت محتاط انداز سے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے کسی آدمی سے زیادہ ملنا جلنا یا زیادہ بھاگ دوڑ نہیں دکھاتے تھے کہ کہیں بھٹو صاحب کو پتہ نہ چل جائے کہ کوشش کر رہے ہیں۔

صادق حسین قریشی لگتا تو بیوقوف ہے لیکن ہے بڑا ہوشیار۔ اس کی کامیابی کا یہی راز ہے بہرحال موصوف اتنے بے خبر بھی نہیں تھے۔ انہوں نے صرف بھٹو صاحب کی بات پر توکل نہیں کیا بلخ شیر مزاری اور نصراللہ

دریشک بھی اس کے لیے کوشش کرتے رہے بلخ شیر مزاری اس لیے کہ ان کی کھر سے مخالفت تھی وہ چاہتے تھے کہ کوئی بیوقوف سا آدمی آ جائے جس پر وہ کوئی احسان رکھیں اور ہمیشہ کے لیے ان کی سیاسی معتبری رہے لیکن ان کو یہ احساس نہیں تھا کہ جس کو وہ بیوقوف سمجھ رہے ہیں وہ ان کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ نصراللہ دریشک کے ساتھ میرے ذاتی مراسم تھے وہ کبھی کبھی بتایا کرتے تھے کہ نواب صاحب کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات ہیں ایک دفعہ بلخ شیر مزاری نے مجھے اور چیف سیکرٹری کو اپنے گھر کھانے پر بلایا وہاں نواب صادق حسین قریشی بھی موجود تھے لگتا تھا کہ آئندہ کے لیے وہ انہیں تیار کر رہے تھے۔

❖

صادق قریشی

صادق قریشی صاحب سے میری پہلے واقفیت نہیں تھی۔ ان کے ایک عزیز تھے پیر ظہور حسین قریشی ملتان کے، ان سے میری دوستی تھی اب تو ان کا انتقال ہو گیا ہے وہ بہت اچھا آدمی تھا جب میں ایس ایس پی تھا اس وقت سے ہمارے مراسم تھے ان سے کبھی کبھی صادق قریشی کا ذکر وغیرہ ہوتا رہتا تھا۔ رائے صاحب کے زمانے میں جب میں آئی جی ہو کے آیا یہ گورنر تھے اس وقت رسمی ملاقات ان سے کی۔

صادق حسین قریشی کو کوئی بھی اچھا ایڈمنسٹریٹر نہیں سمجھتا تھا نہ وہ محنت کر سکتے تھے نہ ان کو کوئی بات سمجھ میں آتی تھی گپ شپ کے لیے بڑے اچھے تھے' مطلب یہ کہ شراب وراب چل رہی ہو گپیں لگا رہے ہیں اس میں بڑی اچھی کنٹری بیوشن کر سکتے تھے۔ ایڈمنسٹریشن کا انہیں کوئی پتہ نہیں تھا سب لوگ بڑے حیران ہوئے کہ بھٹو صاحب انہیں چیف منسٹر لگا رہے ہیں بلکہ میں نے سنا یہ ہے کہ اس زمانے میں جو برطانوی سفیر تھا اس نے کہا عجیب بات ہے وہ آدمی نہ ایک منٹ بات کر سکتا ہے نہ ایک منٹ بات سن سکتا ہے نہ ایک منٹ آرام سے کھڑا ہو سکتا ہے تو اس قسم کے آدمی کو بھٹو صاحب نے کیسے چیف منسٹر بنا دیا جب وہ چیف منسٹر ہو کے آئے تو بھٹو صاحب نے چیف سیکرٹری بدل دیا اور بریگیڈئر مظفر کو چیف سیکرٹری لگا کے بھیج دیا ان کی سکیم یہ تھی چونکہ صادق حسین قریشی ایڈمنسٹریشن میں کمزور آدمی ہے اس لیے مضبوط آدمی کو چیف سیکرٹری بھیجا جائے جو صوبے کی ایڈمنسٹریشن چلائے گا۔

پھر صادق حسین قریشی صاحب نہ دفتر جایا کرتے تھے نہ اسمبلی جایا کرتے تھے ہر شام سیر سپاٹے کے لیے نکل جایا کرتے تھے گھر پر ہی انہوں نے دفتر بنا لیا تھا تین چار نوجوان آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی رکھے تھے ان کو محکمے سپرد کر دیئے تھے وہی سارا نظام حکومت چلاتے تھے اور یہ حضرت نہ کسی سیاستدان سے ملتے تھے نہ کسی منسٹر سے ملتے تھے۔ منسٹر بھی بارہ بارہ پندرہ پندرہ دن کوشش کرتے تھے۔ تب بھی یہ ان کو شرف ملاقات نہیں بخشتے تھے' اگر کسی کو ملاقات کے لیے وقت دے بھی دیتے پانچ منٹ سے

زیادہ ہو جائیں تو متعلقہ سٹاف کو حکم ہوتا تھا کہ آ کر کہہ دیں ڈاکٹر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں یا آپ کا فلاں دوست ہسپتال جا رہا ہے اصل میں یہ بہانا ہوتا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ نواب صاحب نہیں چاہتے کہ آپ مزید بیٹھیں۔

راے صاحب کو میں نے دیکھا ہے کہ اس لحاظ سے ان میں بڑا صبر تھا کہ صبح سے لے کے رات کے بارہ بجے تک لوگوں سے ملتے تھے۔ صادق حسین قریشی کے پاس لوگوں سے ملنے کے لیے کہاں اتنا وقت تھا چنانچہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے لوگ مہینہ مہینہ ٹکریں مارتے تھے لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوتی تھی البتہ دو تین افسر تھے مثلاً چیف سیکرٹری تھے میں یا ایک دو اس قسم کے افسر جب بھی ضرورت ہوان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

بعض لوگ تو ایسے ہیں جب آپ فون کریں جواب ملتا ہے صاحب نماز پڑھ رہے ہیں یا صاحب مسجد میں گئے ہیں۔ وہ ذرا اسلامی بہانہ تھا۔ صادق قریشی کا بہانہ یہ تھا کہ جی ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں یا وہ خود جا رہے ہیں یا ان کی والدہ ہسپتال میں ہیں یا ان کا کوئی دوست ہسپتال میں ہے۔ جب میں آئی جی تھا میرے پاس بھی بے شمار ٹیلی فون آتے تھے۔ آدمی تنگ آ جاتا ہے یا مہمان بیٹھے ہوئے ہیں کسی کا فون آ گیا تو اردلی وغیرہ ہوتے ہیں جو خود ہی جانتے ہیں کہ اس وقت بات کرنی ہے کہ نہیں کرنی۔ وہ خود ہی بہانے تلاش کر لیتے ہیں مجھے بعد میں اس کا پتہ چلا کہ جب بھی کوئی فون آئے تو میرا اردلی کہتا تھا جی وہ باتھ روم میں ہیں میں نے اس کو بلا کے کہا خدا کے بندے اگر آئی جی باتھ روم میں ہر وقت رہتا ہے تو لا اینڈ آرڈر کیسے برقرار ہوگا تجھے کوئی اور بہانہ نہیں ملتا تو میری ریپوٹیشن خراب کر رہا ہے یہ لطیفے بھی دفتروں میں ہوتے ہیں اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں جب آدمی کسی جگہ پہنچ جاتا ہے تو لوگ کچھ زیادہ ہی تعلقات نکال لیتے ہیں اب میں وہی ہوں لیکن شاذ و نادر ہی ٹیلی فون بجتا ہے جو ہر وقت ٹیلی فون کرتے تھے بڑی تابعداری دکھاتے تھے اب کوئی نزدیک نہیں آتا تو اس وقت اسی قسم کے لوگ آپ کا سارا وقت لے لیتے ہیں صرف دوسروں کو یہ دکھانے کے لیے کہ ہمارے آئی جی سے بڑے مراسم ہیں یا ہمارے چیف منسٹر سے بڑے مراسم ہیں یا چیف سیکرٹری سے بڑے مراسم ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی خرابی ہے اور وہ پھر اتنا وقت لیتے ہیں کہ جو اصلی کام ہیں ان کے لیے بھی وقت نہیں ملتا۔ وہ تو اپنے کام کے لیے آتے ہیں آپ کے لیے تو نہیں آتے ان میں سے اکثر سفارش یا ناجائز کام کرانے کے لیے آتے ہیں بہرحال اس کے توڑ کے لیے لوگوں نے بہانے بھی رکھے ہوئے ہیں اور سٹاف کے لوگ بڑے ماہر ہو جاتے ہیں انہیں پتہ ہوتا ہے کہ صاحب ان سے نہیں ملیں گے یا اس وقت نہیں ملیں گے تو وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ٹالا جائے۔ صادق قریشی کے سٹاف میں راجہ سلیم اختر، آصف ہاشمی (آصف ہاشمی کا تعلق چیف

منسٹر کے سٹاف میں پیپلز پارٹی سے تھا) اور جاوید اکرم تھا وہ نواب صاحب کا ایک طرح سے رشتے دار بھی تھا اس طرح سے ایک دو سی ایس پی لڑکے تھے ان کی چار چار پانچ پانچ سال کی سروس تھی۔ حامد نواز تھا وہ بعد میں ان کا داماد بنا۔

حکومت وہی چلاتے تھے نواب صاحب سے زبانی زبانی حکم لے لیا کرتے تھے۔

اس قسم کے محکمے مثلاً پولیس، ریونیو وغیرہ جہاں سفارشی کام ہوتے ہیں ڈائریکٹ ڈی سی کو فون کر دیا۔ ڈائریکٹ ایس پی کو فون کر دیا بہت ساری باتوں کا ان لڑکوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ کرتے رہے ہمارے ہاں سول ایڈمنسٹریشن میں مصیبت یہ ہے کہ ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے سے اونچا جو ہے گورنر یا چیف منسٹر اس سے رشتہ بنایا جائے تا کہ ترقیوں اور تبادلے کے معاملہ میں حسب منشا فائدہ ہوتا رہے۔ اب بھی یہی ہے مارشل لا ہے اور فوج ہے اب بھی وہی سفارشیں چلتی ہیں پاکستان پیپلز پارٹی تھی یا فوج آ گئی ہے بنیادی طور سے فرق تو کوئی نہیں ہے۔

ہاں جب چیف منسٹر بے بہرہ ہو اور اس کے پاس وقت بھی نہ ہو تو پھر افراتفری ہوتی ہے بریگیڈئر مظفر مضبوط آدمی تھے ذہین آدمی تھے انہیں سول کا کوئی تجربہ تو نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی عقل، اپنی شخصیت کے زور سے حکومت چلائی بہرحال جو یہاں تھے وہ بتا سکتے ہیں کہ اچھی چلائی یا بُری چلائی میں تو یہاں نہیں تھا لیکن انہوں نے یہ عقل مندی کی کہ کسی سے بگاڑی نہیں اور جس چیز میں چیف منسٹر دلچسپی لیتا تھا وہ ہو جاتی تھی اس کے علاوہ باقی سارا کام ان کے ہاتھ میں تھا۔

وزیر اعلیٰ بننے کے بعد سب سے پہلا کام صادق حسین قریشی نے یہ کیا کہ پولیس سے چار پانچ افسروں کو قبل از وقت ریٹائر کر دیا اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے ان سے پوچھا آپ نے کسی اور محکمے کو چھ نہیں کیا پولیس کو کیوں کیا کہنے لگے اوپر سے حکم آیا ہے۔ انہوں نے ایک ڈی آئی جی افتخار ملہی کو، ایک سیالکوٹ میں ایس پی تھے انہیں میں ان کا نام بھول گیا ہوں خواجہ طفیل کو، وہ اس وقت ایس پی میانوالی تھے اور شریف چیمہ کو ریٹائر کر دیا۔ میں نے سب سے زیادہ احتجاج (پروٹیسٹ) خواجہ طفیل کی ریٹائرمنٹ پر کیا۔ میں نے کہا کہ اتنے ایماندار آدمی کو بھی آپ ریٹائر کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کسی کو ایماندار ہونے کی کیا ضرورت ہے کیوں نہ وہ خوشامدی لوگوں کی طرح ہو جائے' میں نے اتنا احتجاج کیا کہ بات بالآخر بھٹو صاحب تک پہنچی اور خواجہ صاحب بحال ہو گئے۔

خواجہ طفیل بہاولپور میں ڈی ایس پی ہوتے تھے تو بہاولپور ڈویژن میں کسی بھی قتل کیس میں لوگ باصرار ہمیشہ یہی کہتے تھے خواجہ طفیل کو لگا دیں۔ مطلب یہ کہ ہر آدمی کا ان پر اعتماد تھا۔ جب بھٹو صاحب نے بہاولپور کا دورہ کیا تو وہاں پہلی دفعہ میں خواجہ طفیل سے ملا میں نے دیکھا کہ خوش پوش ہیں خوش

شکل ہیں مجھے وہ صاف ستھری عادات کے لگے پھر ان کی پروموشن کا وقت آیا' تو میں نے انہیں میانوالی لگایا اس کے بعد میں نے انہیں کرائمز برانچ میں لگا دیا ان کی ریپوٹیشن اچھی رہی البتہ جماعت اسلامی سے ان کا تعلق اس لیے بھی بنتا تھا کہ ان کا لڑکا حافظ سلمان جمعیت طلبہ کا با قاعدہ رکن تھا اور اس کے جوشیلے کارکنوں میں رہا۔ مارشل لا لگنے کے بعد ضیاء الحق خاص طور سے خواجہ طفیل پر مہربانی کرتے رہے۔ میاں طفیل محمد ان کی بڑی سفارش کرتے رہے ہیں انہیں حج وفد میں بھی بھجوایا تھا تو مارشل لا لگنے کے بعد ان کا جماعت سے جو صحیح تعلق تھا وہ نکل آیا لیکن اس کے باوجود جہاں تک مجھے علم ہے جہاں تک میری معلومات ہیں تو وہ بڑے ایماندار اور محنتی تھے۔

نواب صاحب نے آتے ہی جن افسروں کو ریٹائر کیا تھا ان میں سے بیچارے افتخار ملہی پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی ساری شخصیت ختم ہو گئی۔ اصل میں وہ رائے کا کلاس فیلو تھا کچھ اس وجہ سے بھی وہ سیاست میں آ گیا رائے کے خلاف صادق قریشی اور دریشک وغیرہ کا گروپ اس کے خلاف ہو گیا اس چپقلش میں اس کی شکایت ہوئی ریپوٹیشن بھی اس کی خراب ہوئی اس بیچارے کو نکلنا پڑا جب ایس پی تھا تو بڑا صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔ میری اس سے پرانی جان پہچان تھی مجھے بڑا صدمہ ہوا اور اس کی حالت دیکھ کے اور زیادہ صدمہ ہوا حالانکہ اس کو مالی پریشانی نہیں تھی' اس کی بیوی سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار کی لڑکی تھی خود ملہی نے بھی زمین بنالی تھی خدا اس کو جنت بخشے مر گیا ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ بہاولپور میں رہا۔ ملتان میں رہا نکلنے پر اس نے اپنا ایسا حال کر لیا۔ داڑھی بڑھالی۔ میرے پاس آتا تھا گھنٹوں بیٹھ کے روتا تھا جس کے پاس جاتا تھا گھنٹوں بیٹھ کے روتا تھا کہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میرے بچے کیا کہیں گے آخر کار اس نے گھر سے باہر نکلنا بالکل بند کر دیا۔ پیٹ اس کا بڑھ گیا وزن اس کا بڑھ گیا اس نے اسی حالت میں اپنے آپ کو ختم کر لیا ہارٹ اٹیک ہوا اور بیچارہ مر گیا میرا خیال ہے اگر چار پانچ مہینے وہ اور زندہ رہ جاتا تو بحال ہو جاتا کیونکہ سارے بحال ہو گئے اس کے چانسز اس لیے بھی زیادہ تھے کہ جب وہ ملتان میں ڈی آئی جی تھا جنرل ضیاء الحق سے اس کی ذاتی طور سے واقفیت تھی بلکہ جنرل ضیاء الحق سے پہلی دفعہ اسی نے مجھے ملوایا تھا جب وہ ریٹائر ہوا تو وہ ان کے پاس بھی جاتا رہا۔ ان کے پاس بھی جا کے بڑا روتا رہا' پھر میں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا کہ میں نے بھی اس کی سفارش کی ہے آپ بھی ذرا مہربانی کریں اور اس کی سفارش کریں اس کا بُرا حال ہے مر جائے گا وہ اس کے لیے بھی کوشش کرتے رہے بلکہ مجھے یاد ہے کہ مرحوم کی موت سے ایک یا دو دن پہلے میں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا' آپ پرائم منسٹر سے بات کریں میں بھی کرتا ہوں' اتنے میں مجھے اطلاع ملی کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں اس کے جنازے پر بھی گیا مجھے اس کا بڑا صدمہ ہوا کہ ایک آدمی نے تھوڑی سی ہمت ہار کے کس

طرح سے اپنی زندگی ختم کی اور بچوں کی زندگی بھی ختم کی۔ اگر وہ ہمت کر کے چار پانچ مہینے نکال لیتا۔ تو بحال ہو جاتا بچوں کے ذہن میں بھی اگر کوئی بات تھی تو اس کی عزت بحال ہو جاتی۔

صادق قریشی نے بھی میرے کام میں مداخلت شروع کر دی کہ فلاں تھانیدار کو وہاں لگا دو فلاں تھانیدار کو وہاں لگا دو انہیں محسوس ہوا کہ یہ تو نہیں کرتا پھر انہوں نے مجھے لکھ کے حکم دینا شروع کر دیئے وہ بھی میں نے نہیں مانے۔ دو ایک باتوں پر پھر ان سے بڑی ٹسل بھی رہی۔ ایک تو یہ ہوا کہ میں نے دیکھا کہ ہمارے سنٹرل پولیس آفس میں کچھ بڑے پرانے کلرک بیٹھے ہوئے تھے۔ پچیس تیس سال سے اور وہ ایک طرح کے دفتری وڈیرے تھے۔ وہ اس طرح سے کہ انہیں رولز اینڈ ریگولیشنز کی بڑی مہارت تھی آئی جی کے پاس فائلیں انہی کی معرفت جاتی تھیں۔ وہ لوگ کام میں ہوشیار تھے جو ایڈیشنل آئی جی اور ڈی آئی جی آتے ہیں انہیں رولز کا پتہ نہیں ہوتا تو وہ ان پر انحصار کرتے تھے اور وہاں بیٹھ کے وہ ترقیوں میں، تبادلوں میں، پیسے کما لیتے اتنا ان کا اثر تھا کہ سارے صوبے سے لوگ ان کے پاس پہنچتے۔ ''چودھری صاحب میرا کام کروا دینا'' اس میں ایک جٹوں کا گروپ تھا اس کے ایک لیڈر تھے اس کا نام شاید چودھری بشیر عالم تھا وہ انجمن جٹاں کا سیکرٹری وغیرہ بھی تھا چودھری ظہور الٰہی اس کے چیئرمین تھے اگر آپ خود ایماندار ہیں لیکن آپ کے نیچے لوگ پیسے بناتے رہیں تو عوام کو اس کا کچھ فائدہ نہیں اگر بے ایمانی ہو رہی ہے لوگوں کی کھال کھینچی جا رہی ہے اس میں تو آپ بھی حصے دار ہیں اور اگر آپ حصے دار نہ ہوں تو بیوقوفی کی بات ہے کہ آپ لوگوں کو کھانے دیں چنانچہ میں نے اس گروپ کو توڑنے کی کوشش کی اور ان کا تبادلہ ادھر ادھر کر دیا وہ بڑے بااثر تھے۔ 25 سال سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے تار ہلانے شروع کیے سب سے پہلے چودھری ظہور الٰہی میرے پاس سفارش کے لیے آئے۔ ہمیشہ میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں نے بات اپنے بھائی کی بھی کبھی نہیں مانی لوگ اکثر مجھ سے اس بات پر ناراض ہیں یا رہتے تھے کہ یہ کسی کی بات نہیں مانتا چنانچہ ظہور الٰہی کو میں نے سمجھا دیا کہ کس لیے میں نے اس کا تبادلہ کیا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں سمجھانے کی کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں جو لوگ کام کراتے ہیں۔ وہ اس نیت سے نہیں کراتے کہ سمجھ کے چلے جائیں گے۔ میں نے جب بشیر عالم کا تبادلہ کر دیا تو چودھری ظہور الٰہی نے چیف منسٹر سے کہا آپ اس سے اندازہ کریں کہ یہ لوگ بھٹو صاحب کے وفادار ہوتے تھے اور اپوزیشن کے لوگوں سے بھی ہمیشہ ساز باز رکھتے تھے چنانچہ ظہور الٰہی کی سفارش پر صادق حسین قریشی نے یہ حکم دیا کہ ان کو واپس لے لیا جائے۔

پھر یہ ہوا کہ جب میں نے اس کا تبادلہ کیا تو بشیر عالم نے استعفیٰ دے دیا میں نے اس کا استعفیٰ منظور کر لیا اب صادق حسین قریشی نے حکم بھیجا کہ اس کا استعفیٰ کینسل کریں اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر

لگائیں میں نے کہا کہ یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا اول یہ کہ کوئی قانون نہیں کہ استعفیٰ واپس لیا جائے دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ اسے لگانا ہی چاہتے ہیں سیکرٹریٹ اتنی بڑی ہے آپ اس کو کہیں لگا دیں ڈپٹی سیکرٹری لگا دیں لیکن میرے دفتر میں یہ نہیں آئے گا۔ لیکن سیاستدان یہ باتیں نہیں سمجھتے کہ یہ قاعدہ ہے قانون ہے یا اس آدمی کا احترام کریں جو قاعدے قانون کی پابندی کرتا ہے بلکہ وہ اس بات پر کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارا آدمی نہیں ہے ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے انہیں تو کام کے آدمی کی تلاش ہوتی ہے یہ باتیں ہوئیں تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اسے یہاں سے بھجوائیں وہ بھٹو صاحب کو کہتے بھی رہے بھٹو صاحب کو مجبور بھی کرتے رہے بات ان کی بن نہیں رہی تھی پھر انہوں نے مجھے کمزور کرنے کی کوشش کی وہ چاہتے تھے کہ اس قسم کا آدمی ہو کہ جو وہ حکم دیں فوری طور سے مان لے انہوں نے ایسے آدمی کی تلاش شروع کردی جب صادق حسین قریشی چیف منسٹر آئے تو ہمیں سپیشل برانچ میں ڈی آئی جی کی ضرورت ہوئی تو میں نے ملک عطا حسین کو تار دیا وہ اس وقت آئی جی آزاد کشمیر تھے حیات محمد ٹمن، صادق حسین قریشی اور ملک عطا حسین کے تعلقات تھے یہ ایک ہی گروپ تھا جس کا مجھے علم نہیں تھا۔ ٹمن اور صادق حسین قریشی نے عطا حسین کو آئی جی لگوانے کا فیصلہ کیا اور اسے بھی امید دی کہ آپ کو آئی جی بنوائیں گے اس نے بھی اپنے کردار کا مظاہرہ کیا حالانکہ میرے ساتھ اس کے پرانے مراسم تھے لیکن بعض لوگوں کی طبیعت میں لالچ ہوتا ہے ایک محکمانہ وفاداری ہوتی ہے ایک چین آف کمان ہوتی ہے اس کی خلاف ورزی کر کے اس نے میرے خلاف اپنا براہ راست تعلق ٹمن اور صادق قریشی سے بنایا میں نے محسوس کیا کہ صادق حسین قریشی نے آہستہ آہستہ مجھ پر اعتماد چھوڑ دیا اور زیادہ کام وہ عطا حسین سے لے رہے ہیں بہرحال، اس کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ انٹریگ شروع ہوگئی۔

پھر انہوں نے کوشش کی کہ سپیشل برانچ کو آئی جی کے ماتحت نہیں ہونا چاہیے عطا حسین صاحب نے مجھے نوٹ بنا کے بھیجا اس پر میں سمجھ گیا کہ کیا چال ہے میں نے اس پر کہا کہ ڈی آئی جی سپیشل برانچ نے یہ تجویز بھیجی ہے تجویز بڑی اہم ہے تجویز یہ ہے کہ سپیشل برانچ آئی جی کے ماتحت نہیں بلکہ براہ راست ہوم سیکرٹری کے ماتحت ہونی چاہیے۔ حنیف رامے نے اپنے دور میں یہ تجویز دی تھی کہ سپیشل برانچ ہوم سیکرٹری کے پاس ہونی چاہیے۔ اب دوسری شکل آئی کہ سپیشل برانچ کا ڈی آئی جی تو پولیس کا رہے گا لیکن اس کو آئی جی کے ماتحت نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہوم سیکرٹری کے ماتحت ہونا چاہیے میں نے کہا کہ سپیشل برانچ سے خفیہ خبروں کے علاوہ سیکورٹی کا بھی تعلق ہے اس کے بعد پوچھ گچھ کا بھی تعلق ہے یہ تو پولیس افسر ہی کر سکتے ہیں۔ اگر اسے ہوم سیکرٹری کے ماتحت کیا تو اس کی اثر پذیری ختم ہو جائے گی چونکہ لا اینڈ آرڈر سے سپیشل برانچ کا بڑا تعلق ہے حالات کا آئی جی کو علم ہوگا تو وہ لا اینڈ آرڈر برقرار رکھے گا میں نے لکھا چونکہ یہ تجویز

بڑی اہم ہے اس لیے میں یہ سنٹرل گورنمنٹ کو بھجوا رہا ہوں آپ اس پر فیصلہ دیں اس لیے کہ اس کا تعلق صرف پنجاب سے نہیں ہے چار صوبوں سے ہے جو یہاں سسٹم ہوگا دوسرے صوبوں میں بھی وہی ہوگا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ پنجاب کا سسٹم تو آپ بدل دیں اور باقی ویسے کا ویسا رہے اس لیے سنٹرل گورنمنٹ سارے صوبوں کے لیے اصول طے کرے اس پر چیف سیکرٹری کی طرف سے جو نوٹ گیا ظاہر ہے کہ صادق قریشی نے اس کو کہا اس نے ڈی آئی جی سپیشل برانچ کی تجویز کو سپورٹ کیا کہ یہ تجویز پیش ہوئی ہے یہ بالکل ٹھیک ہے اس پر عمل ہونا چاہیے بھٹو صاحب نے اس پر صادق قریشی کو بڑی ڈانٹ پلائی اور کہا کیا یہ بیوقوفوں کی سی سکیم آپ میرے پاس بھیجتے ہیں اس کی کیا تک ہے کیا اس کا موقع ہے چنانچہ ان کو بھٹو صاحب سے بڑی ڈانٹ پڑی۔ بات وہیں کی وہیں رہ گئی تو اس طرح سے ان کی وہ بات بھی نہ بنی۔

پھر انہوں نے یہ کیا کہ ان کا ایک خاص آدمی تھا' اصغر علی شاہ اس کو ہوم سیکرٹری لگا دیا اس نے کوشش کی کہ آئی جی کے اوپر کوئی رعب شعب جمائے ہوتا یہ تھا کہ انسپکٹر سے ڈی ایس پی کی پروموشن میں خود کرتا تھا ڈی ایس پی کی پوسٹنگ بھی خود کرتا تھا یہ سسٹم مجھ سے پہلے سے چلا آ رہا تھا اصغر علی شاہ نے لکھا کہ یہ آپ نہیں کر سکتے ڈی ایس پی کی پوسٹنگ ہم کریں گے اور انسپکٹر کی پروموشن بھی ہم کریں گے میں نے اس کی چٹھی اٹھا کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دی دیکھیں یہ ایک سازش تھی اس کے بعد پھر اس نے چٹھی لکھی اس کا میں نے جواب دینا ہی مناسب نہیں سمجھا بہر حال یہ ٹسل چلتی رہی اس دوران میں میرا تبادلہ ہو گیا اور جب میں چلا گیا تو یہی ہوا کہ انسپکٹر کی پروموشن اور ڈی ایس پی کی پوسٹنگ ہوم سیکرٹری نے شروع کر دی اور جو مرسیڈیز کاریں تھیں ان میں سے ایک عطا حسین نے فوری طور پر صادق حسین قریشی کے گھر پہنچا دی جسے اس کالڑ کا ذاتی استعمال کرتا رہا۔

جب میں ایس پی ای (سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ) میں تھا مجھے شکایت ملی تھی کہ میرا ایک انسپکٹر ایف آئی اے سیالکوٹ گیا وہاں اس نے لوکل پولیس کے انسپکٹر یا ڈی ایس پی سے مل کے سپورٹس کے ایکسپورٹرز کو تھانے میں بلا کے ان پر الزام لگایا کہ آپ فارن ایکسچینج چوری کرتے ہیں اور صحیح حساب کتاب نہیں رکھتے بڑا ہراس پھیلایا جو جو پیسے دیتا رہا اس کو چھوڑتا رہا۔ اس طرح وہ کوئی لاکھوں روپیہ جمع کر کے چلا آیا اس کی بڑی شکائتیں آئیں تاریں آئیں میں نے انکوائری کرائی' تو پتہ چلا کہ واقعی اس میں کافی حد تک صداقت ہے' کہ اس نے لوگوں میں اس طرح سے ہراس پھیلایا اور ان سے پیسے لیے۔ میں نے اس انسپکٹر کو معطل کر دیا مجھے اس انسپکٹر کی بیک گراؤنڈ کا نہیں پتہ تھا کہ کون ہے اس کا نام قمر الزمان تھا۔ آگے چل کر یہی قمر الزماں ایک اہم ڈرامے کی شخصیت ہو جائے گا جب وہ معطل ہو گیا' اس کی انکوائری ہو رہی تھی آئی جی پنجاب صاحبزادہ رؤف علی تھے انہوں نے مجھے فون کیا اس طرح سے آپ نے ایک انسپکٹر قمر

الزماں کو معطل کیا ہے تو اس کی انکوائری وغیرہ ختم کر کے اسے بحال کر دیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اس پر الزام بڑے سنگین ہیں بے ایمانی کے الزام ہیں۔ میں نے انکوائری کروائی ہے اس نے پیسے کمائے ہیں میں اسے کیسے چھوڑ دوں اس پر صاجبزادہ صاحب نے کہا کہ مجھے گورنر نے کہا ہے انہوں نے سفارش کی ہے اور گورنر تھے صادق حسین قریشی میں نے کہا' بھئی گورنر صاحب کو بتا دو' اس قسم کا قصہ ہے' اس بد دیانتی کی شکایت ہے میں انکوائری کرا رہا ہوں اگر ثابت نہ ہوا تو میں چھوڑ دوں گا چند روز بعد صاجبزادہ صاحب کا پھر فون آیا کہ گورنر صاحب بڑا مجبور کر رہے ہیں۔ معمولی سی بات ہے انسپکٹر کا قصہ ہے چھوڑو دفعہ کرو اس کو میرا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ میرا ماتحت جو بے ایمان آدمی ہوتا تھا اس کو میں نے کبھی معاف نہیں کیا ہو سکتا ہے کہ غلط شکایت پر مجھ سے زیادتی ہوگئی ہو لیکن اگر میری تسلی ہوگئی کہ یہ بے ایمان ہے اس کو میں نے کبھی معاف نہیں کیا اس کے بعد مجھے تکلیفیں بھی ہوئیں اس لیے کہ جب مجھ پر وقت آیا۔ ان سب نے مل کے کوشش کی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے' بہرحال نقصان نہیں پہنچا' خدا کی مہربانی رہی۔

پھر رؤف نے فون کیا اور کہا کہ گورنر صاحب بہت مجبور کر رہے ہیں تو میں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں تو اسے بحال نہیں کروں گا آپ کا افسر ہے میرے پاس وہ ڈیپوٹیشن پر ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں' تو میں اس کو آپ کے پاس بھجوا دیتا ہوں آپ اس کو بحال کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی انہوں نے کہا کہ چلو ٹھیک ہے چنانچہ میں نے قمر الزماں کو معطل شدہ حالت میں پنجاب پولیس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ اس کے خلاف انکوائری کرا لیں جیسا بھی نتیجہ ہو اس کے مطابق اس کا فیصلہ کریں۔

میں اس کو خود بحال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں S.P.E کا آئی جی تھا اب بدقسمتی اس انسپکٹر کی یہ کہ جب وہ پنجاب پولیس میں گیا تو میرا بھی تبادلہ ہوگیا۔ میں پنجاب میں آئی جی ہو کے آ گیا اب مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں رہا کہ اس قسم کا کوئی انسپکٹر بھی تھا۔ ظاہر ہے بے شمار انسپکٹر سٹاف میں ہوتے ہیں شکائتیں ہوتی رہتی ہیں مجھے یاد ہی نہیں رہا آئی جی کی حیثیت سے میں پنجاب آیا تو گورنر نواب صادق حسین قریشی صاحب سے میں نے ملاقات کی' سرسری ملاقات تھی میں نے اپنا بیک گراؤنڈ وغیرہ ان کو بتایا اور کہا کہ میں نے تبادلے کی کوشش نہیں کی اور نہ میری خواہش تھی اتفاق ہے کہ میرا تبادلہ ہوگیا بہرحال میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب حکم ملتا ہے چلا جاتا ہوں کوشش کرتا ہوں محنت سے کام کرنے کی' ایمانداری سے کام کرنے کی لیکن یہ میری خواہش نہیں کہ میں پنجاب میں ضرور پانچ سال رہوں' جب تک ہوں' ہوں' نہیں ہوں تو ٹھیک ہے۔

بہرحال بات ختم ہوگئی۔ میں آ گیا اس کے تین چار روز کے بعد ان کے ملٹری سیکرٹری نے

مجھے فون کیا کہ آپ کا انسپکٹر ہے قمرالزمان اس کو آپ بحال کردیں میں نے کیس منگوایا پتہ چلا کہ یہ تو پرانا قصہ ہے۔ میں نے ہی اس کو بھیجا ہوا ہے میں نے پھر ملٹری سیکرٹری کو کہا کہ اس نے بے ایمانی کی تھی میں بغیر کسی انکوائری کے اسے کیسے بحال کروں۔ انہوں نے کہا نہیں گورنر صاحب کہتے ہیں میں نے کہا ٹھیک ہے گورنر صاحب کہتے ہیں قاعدے قانون کے تحت ہی اس کا فیصلہ کروں گا چنانچہ میں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایک ہفتے کے بعد پھر فون آیا میں نے کہا دیکھیں میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ اس طرح سے میں اس کو بحال نہیں کروں گا بس طبیعت میں ضد ہے' شروع سے۔

پھر گورنر نے میرے دوست پیر ظہور قریشی صاحب کی معرفت اس کی بڑی سفارش کرائی کہ بھئی یہ میری بات تو نہیں مانتا' دوست کی بات تو مانے گا اب بدقسمتی یہ کہ سفارش میں نے اپنے بھائی کی بھی کبھی نہیں مانی اور یہ سب کو پتہ تھا پھر ظہور قریشی نے کافی سفارش کی لیکن میں نے اس سے یہی کہا کہ آپ ایسے غلط آدمی کی سفارش کیوں کرتے ہیں، ایک کرپٹ انسپکٹر سے آپ کا کیا واسطہ ہے؟ اس سے تو پھر یہی ہے کہ مجھے آپ کے متعلق بھی شبہ ہو۔

بہرحال' پھر وہ بات بھٹو صاحب تک پہنچی کھر صاحب نے اس کی سفارش کی۔ بڑی پہنچ والا انسپکٹر تھا۔

بھٹو صاحب نے کھر کو نکال تو دیا تھا ویسے ملنا جلنا تھا بھٹو صاحب یہاں آئے تو اس کے گھر بھی گئے وہ بھی جب وہاں گیا تو ہمیشہ جا کے ان سے ملا' اسی دوران میں انکوائری مکمل ہوگئی کوئی خاص لوگوں نے بیان نہیں دیئے تو میں نے اس کو بحال کر دیا اور اس کو لاہور لگا دیا۔

ہمارے ہاں انکوائری میں یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ جب لوگ شکائتیں کرتے ہیں تو قرآن حدیث اٹھاتے ہیں جب انکوائری شروع ہوتی ہے تو پھر ہمارے پولیس والے جا کے ان کے ہاتھ پاؤں جوڑتے ہیں تو لوگ ان کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد انکوائری میں بیان صحیح نہیں ہوتے۔

ظاہر ہے اور تو کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ مجھے بحال کرنا پڑا وہ بحال ہوگیا اور لاہور لگ گیا اور لاہور میں نے اس کو ایسی جگہ پر لگایا جہاں سے کسی بے ایمانی وغیرہ کی شکایت نہ آئے البتہ اس نے یہ کہا کہ میری بچی ہے اس کی ماں نہیں ہے ایسی جگہ لگایا جائے جہاں کوارٹر ہو۔ لاہور میں پولیس افسروں کو رہائش کی پرابلم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسے لائنز میں لگا دیا جہاں کوارٹر تھا تا کہ اسے تکلیف نہ ہو بات آئی گئی ہوگئی۔ پھر نواب صاحب گورنری سے ہٹے ان کی جگہ دوبارہ کھر کو لے لیا گیا اور نواب صاحب یہاں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں انتظار کرتے رہے اس کے بعد وہ حنیف رامے کے جانے کے بعد چیف منسٹر بنے۔ گورنر نواب محمد عباس عباسی تھے کچھ عرصے بعد چیف منسٹر صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ وہ

ملتان گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا کہ ملتان میں ایک قتل ہو گیا ہے خواجہ طفیل اس وقت ایس پی کرائمز لاہور تھے کہنے لگے اس کو آپ تفتیش پر لگائیں۔ قتل ہوتے رہتے ہیں اگر کوئی بہت ہی سیاسی قسم کا یا سنسنی خیز قسم کا قتل ہو تو پھر آئی جی کو پتہ چلتا ہے' ورنہ عام طور سے ایس پی یا ڈی ایس پی یا ڈی آئی جی لیول پر ہی بات رہتی ہے چنانچہ میں نے تفتیش کے لیے خواجہ طفیل کو بھیج دیا۔

کچھ دنوں کے بعد خواجہ طفیل میرے پاس آئے۔ کہنے لگے آپ سے کچھ عرض کرنی ہے۔ میں نے کہا فرمائیں کہنے لگے وہ جو قتل ہوا ہے وہ تو وزیر اعلیٰ پنجاب صادق حسین قریشی نے کرایا ہے پھر انہوں نے مجھے اس قتل کا سارا بیک گراؤنڈ بتایا پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ قصہ کیا ہے۔

وہ یہ تھا کہ وہاں ملتان میں جو صادق حسین قریشی کا حلقہ انتخاب ہے۔ اس میں کھوکھر کمیونٹی کافی بااثر ہے اور اس میں دو گروپ ہیں' ایک تو ملک زوار حسین جو آج کل شاید یہاں ٹریبونل میں ہیں۔ پی سی ایس افسر ہیں اور ایک وہ کھوکھر، جس کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کا نام امیر بخش کھوکھر تھا وہ اپنے قبیلے میں زیادہ بااثر تھا۔ الیکشنوں میں اس کا گروپ ہمیشہ نواب صادق حسین قریشی کے خلاف ووٹ دیا کرتا تھا وہ گیلانی گروپ کے ساتھ تھا اور امیر بخش کھوکھر کو قمر الزمان نے قتل کیا ہے۔

خواجہ طفیل نے یہ بھی بتایا کہ میں نے انسپکٹر قمر الزمان سے پوچھ گچھ کی تو اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ بھی کہ جب صادق حسین قریشی نے چیف منسٹر کا حلف لیا تو سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ اسی شام قمر الزمان کو اپنی کوٹھی بلایا اور کہا کہ تمہیں ملتان کنٹونمنٹ کا ایس ایچ او بنا کے بھیج رہا ہوں۔ صادق قریشی کا مکان اسی تھانے میں تھا وہ اپنے ایک خاص اعتبار کا آدمی اپنے علاقے میں ایس ایچ او لگانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے نہیں کہا تھا انہیں پتہ تھا کہ یہ تو لگائے گا نہیں اس لیے انہوں نے بالا بالا ایڈیشنل آئی جی سے کہا۔ ایڈیشنل آئی جی اس وقت ارباب ہدایت اللہ تھے۔ ان کو ٹیلی فون کیا کہ ایک انسپکٹر ہے۔ قمر الزماں اس کا نام ہے اس کو آپ نے ملتان کے فلاں تھانے میں ایس ایچ او لگانا ہے۔ انسپکٹر کا تبادلہ ایڈیشنل آئی جی کرتا ہے اس نے لکھ دیا کہ اس طرح سے مجھے چیف منسٹر کا فون آیا اور ان کی ہدایت پر میں اس کو ایس ایچ او ملتان کنٹونمنٹ لگا رہا ہوں۔ مجھے اس کا پتہ نہ چلا کہ وہ ملتان پہنچ گیا ہے اور یہ کہ صادق قریشی سے اتنے گہرے اس کے مراسم تھے میں نے اپنی سروس میں یہ کبھی نہیں کیا کہ اپنے محکمے میں سی آئی ڈی رکھوں جو مجھے اپنے ماتحتوں کی خبریں لا کے دیتے رہیں اور مجھے باخبر رکھیں کہ کیا ہو رہا ہے اس لیے کہ اس محکمے میں جو ہونا ہوتا ہے پتہ چل جاتا ہے۔ اچھے بُرے کا اپنے ماتحتوں پر سی آئی ڈی رکھنے کا سسٹم میں نے ہمیشہ ناپسند کیا اور کبھی میں نے اس کے اچھے نتائج برآمد ہوتے نہیں دیکھے۔ ہمارے بعض پرانے پولیس افسروں میں مثلاً نجف خاں' ملک حق نواز وغیرہ میں یہ عادت تھی کہ اس

قسم کے جو بڑے سٹرانگ افسر سمجھے جاتے تھے ان کا راز یہی تھا کہ ہر ماتحت کے پیچھے انہوں نے سی آئی ڈی لگائی ہوئی تھی اور ان کی ساری کمزوریاں اور خبریں پتہ رکھتے تھے۔ اس طرح سے آپ لوگوں کو خوف زدہ تو رکھ سکتے ہیں لیکن ایک محکمے میں آپس میں جو خلوص' محبت اور لائلٹی ہونی چاہیے وہ پھر کبھی نہیں ہو سکتی۔

سو قمر الزماں کے ملتان جانے کے متعلق مجھے کسی نے نہ بتایا کیونکہ میں نے ایسا سسٹم ہی نہیں رکھا تھا چنانچہ انسپکٹر ملتان چلا گیا' خواجہ طفیل نے بتایا کہ نواب صاحب نے اس کو خاص طور پر وہاں لگایا تھا اور اپنے تھانے کے متعلق اسے ہدایات دیتے رہتے تھے۔ وہاں ان کا خاص آدمی رضی شاہ گردیزی تھا جس نے بھٹو صاحب پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا تھا۔

خواجہ طفیل نے بتایا زوار حسین صادق حسین قریشی کا خاص آدمی ہے اس نے اور صادق حسین قریشی نے قمر الزماں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ اس کو قتل کردو اس انسپکٹر نے پہلے تو امیر بخش کھوکھر سے مراسم پیدا کیے دوستی پیدا کی اس کو اعتماد میں لیا اور اس کے بعد کوئی اور پارٹی تیار کی رات کو اس کے گھر ٹیلی فون کیا کہ ہمارے پاس آ جاؤ' ہم تمہیں لینے کے لیے آ رہے ہیں پھر اس کو کار میں گولی ماردی وہ کہتا ہے کہ نواب صاحب نے لاہور سے بلا کے مجھے ملتان لگایا۔ مجھے انہوں نے حکم دیا کہ اسے قتل کردو بار بار تاکید بھی ہوتی رہی کہ ہمارا کام نہیں ہوا لیکن میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ میرا اچھا دوست ہو گیا تھا لیکن نواب صاحب کا اتنا پریشر تھا کہ میں نے اسے ہلاک کردیا۔

اس نے مان لیا کہ گولی اس نے ماری گولی مار کے کار نرسوں کے ہاسٹل کے آس پاس کہیں کھڑی کردی اور اس پر جو نشان تھے سارے مٹا دیئے اور آ کے اپنے گھر سو گیا بہر حال کھوکھر کی بیوی کو پتہ تھا کہ اس انسپکٹر کا فون آیا تھا اور اسی انسپکٹر نے اسے کہا کہ ہم تمہیں لینے کے لیے آ رہے ہیں اس کی بیوی نے یہ بھی بتایا کہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ تذبذب میں تھا تو ان سارے شواہد کا اس کی بیوی کو اور بچوں کو پتہ تھا کہ انسپکٹر نے قتل کروایا ہے یا کیا ہے' اور یہ بھی پتہ تھا کہ یہ صادق حسین قریشی کے ایما پر ہوا ہے چنانچہ منافقت لوگوں میں ہوتی ہے صادق حسین قریشی اصل میں مقتول کھوکھر کے گھر اس کی فاتحہ کے لیے پہنچے ہوئے تھے وہاں لوگوں نے کہا کہ ہم دیکھ لیں گے' ہمیں پتہ ہے ہمارا قاتل کون ہے' ہمیں کیا انصاف کی توقع ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ انہوں نے ان باتوں سے وہاں صادق حسین قریشی کی پوزیشن کافی خراب کی اس پر انہوں نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ جس کو کہیں گے اسی سے تفتیش کراؤں گا انہوں نے کہا کہ خواجہ طفیل کو اس کیس کی تفتیش پر لگائیں تو لوگوں کو تسلی دینے کے لیے اس نے کہا ٹھیک ہے۔

خواجہ طفیل کی ریپوٹیشن بے داغ تھی ایماندار سمجھے جاتے تھے۔ سفارش بھی نہیں مانتے تھے' مجھے تو اس کا علم نہیں تھا' انہوں نے خود ہی ملتان سے فون کیا اور میں نے خواجہ طفیل کو بھیج دیا۔

خواجہ طفیل کو نواب صادق حسین قریشی نے اپنی کوٹھی بلایا کیس کے متعلق ادھر ادھر کی بات کرتے رہے لیکن انہیں طفیل کو یہ کہنے کی ہمت نہیں پڑی کہ تفتیش کو کوئی خاص رخ دینا ہے یا اس انسپکٹر کو اس میں ملوث نہیں کرنا۔ ڈی آئی جی کرائمز غلام اصغر بلخ شیر مزاری کا خاص آدمی تھا اور اس وقت تک مزاری اور وریشک کے نواب صادق حسین قریشی سے تعلقات تھے لیکن خواجہ طفیل کو ڈی آئی جی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کو پتہ تھا کہ اس پر آئی جی اعتبار کرتا ہے اس لیے اگر اس کو کوئی غلط بات کہے گا تو طفیل اس کی بات نہیں مانے گا۔ خواجہ طفیل نے کہا کہ صادق حسین قریشی اگر چیف منسٹر نہ ہوتا تو میں اس کو گرفتار کر لیتا۔

قمر الزمان نے خواجہ طفیل کو یہ بھی بتایا کہ صادق حسین قریشی کے ایک نوکر کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو گیا تھا اس نے اسے لات ماری وہ بیچاری حاملہ تھی مر گئی تو انسپکٹر سارا دن بیٹھا صادق حسین قریشی کو فون کرتا رہا وہ میٹنگ میں معروف تھے شام کو کہیں جا کے فون ملا۔ انہوں نے کہا کہ اسے پکڑنا نہیں خورد برد کر دو' چنانچہ اس نے حادثاتی موت کا کیس بنا کے فائل کر دیا۔

پھر اس نے سارا واقعہ بیان کیا کہ صادق حسین قریشی سے اس کی واقفیت کیسے ہوئی یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے وہ یہ کہ قمر الزمان اپنے زمانے میں اچھا خوبصورت آدمی تھا۔ یہ گجرات یا جہلم میں کہیں تعینات تھا وہاں کوئی فاریسٹر تھا جس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی یہ اس کے پڑوس میں رہتا تھا اس کے اس عورت کے ساتھ تعلقات ہو گئے وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی بہر حال نواب کالا باغ کے زمانے میں یہ سکینڈل ہوا۔ قمر الزمان جس وقت شاہدرہ میں تھا وہیں وہ کوارٹر میں رہتا تھا کچھ سیاستدان اور سرکاری افسر اس عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ ایک دو کالا باغ کے خاص آدمی تھے۔ لاہور سے کچھ پڑھے لکھے لوگ اس کے گھر پر جایا کرتے تھے۔ اس عورت کی وجہ سے ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ کالا باغ کو پتہ لگا تو انہوں نے کہا۔ وہ کون انسپکٹر ہے اور وہ کون عورت ہے۔ جس نے میری گورنمنٹ ہلا کے رکھ دی ہے چنانچہ انہوں نے قمر الزمان کا تبادلہ ڈیرہ غازی خاں یا مظفر گڑھ کر دیا تا کہ یہ لاہور سے چلا جائے۔ انسپکٹر کہتا ہے کہ نواب صادق حسین قریشی سے میرے تعلقات وہاں ہوئے وہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے حالانکہ میں تھانے کے کسی کوارٹر میں رہتا تھا پھر بھی وہاں آیا کرتے تھے پھر اس نے کہا کہ اس وقت نواب صادق حسین قریشی سیاست وغیرہ میں نہیں تھے۔ ملتان کے زمیندار تھے پھر انہیں سیاست میں حصہ لینے کا شوق ہوا چنانچہ میں انہیں عبداللہ روکڑی کے پاس لے گیا انہوں نے پھر نواب کالا باغ سے کہہ کے انہیں صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دلوا دیا۔ اس طرح سے نواب صاحب پہلی دفعہ اسمبلی میں آئے 65ء والے الیکشن میں اب

انسپکٹر کی یہ بات کہاں تک درست ہے لیکن جس طرح سے صادق قریشی کے اس کے ساتھ تعلقات تھے' پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کے کافی مشکور وممنون ہیں اور ان کے کافی اچھے تعلقات تھے ورنہ عام طور سے ایک انسپکٹر کے اور صادق حسین قریشی جیسے آدمی کے اتنے تعلقات نہیں ہوتے۔

خواجہ طفیل نے انسپکٹر کے ساتھ ساری پوچھ گچھ کی باقاعدہ ٹیپ کی تھی اور وہ ٹیپ انہوں نے مجھے دیا۔

یہ ایسی سنگین بات تھی کہ میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کا فیصلہ کرلیا وہ کراچی سے آرہے تھے۔ میں ایئرپورٹ پر چلا گیا میں نے ان کے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز سے کہا کہ میں پرائم منسٹر سے ملنا چاہتا ہوں اور بھی لوگ کھڑے تھے میں بھی ملا۔ انہوں نے اسی وقت کہا میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ میں چلا گیا' بھٹو صاحب بڑے ذہین آدمی تھے۔ ان میں ایسا چارم تھا کہ انسان خود بخود ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔ کہنے لگے تمہیں دیکھ کے مجھے فوراً پتہ چل گیا تھا کہ تم کوئی سنجیدہ بات لائے ہو بتاؤ کیا بات ہے میں نے ان کو موٹا موٹا قصہ بتایا اور ٹیپ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ ٹیپ صادق حسین قریش کو سناؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کیا قصہ ہے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے گورنمنٹ ہاؤس بلایا۔ مجھے وہ ملاقات یاد ہے اس زمانے میں میں نے محسوس کیا تھا کہ پنجاب پولیس میں نفری کی بڑی کمی تھی پچھلے دس سال سے نفری نہیں بڑھی۔ ان کے راشن کی حالت بہت بُری تھی۔ رہائش کی حالت بُری تھی۔ ایک پریس کانفرنس میں میں نے ایک بیان دیا تھا کہ پنجاب پولیس کی نفری کم از کم دگنی ہونی چاہیے اور ان کے کھانے اور رہائش کے حالات بھی بہتر ہونے چاہئیں تو جب بھٹو صاحب نے مجھے گورنمنٹ ہاؤس بلایا تو کہا میں نے تمہارا بیان پڑھا ہے میں نے سرحد کو امداد دی ہے بلوچستان کو بھی پیسے دیئے ہیں سندھ کو بھی دیئے ہیں پنجاب کو نہیں دیئے۔ تمہارا بیان پڑھ کے میں نے پنجاب کو پانچ کروڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے آپ پنڈی جائیں اور وہاں سے پیسے لے آئیں دیکھیں' یہ ایک سیاستدان ہی کرسکتا ہے کہ صرف اخباری بیان پر انہوں نے پانچ کروڑ دے دیئے ورنہ ہم پیسے پیسے کے لیے فنانس والوں سے لڑتے تھے اس کے لیے دو دو تین تین سال لگ جاتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر خوش کرنے کے لیے یا ممنون کرنے کے لیے یا یہ سوچ کے کہ اس نے اچھا کام کیا ہے اور اپنے محکمے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے صرف میری حوصلہ افزائی کے لیے انہوں نے پانچ کروڑ دے دیا اس میں نہ چیف منسٹر نے مجھے سپورٹ کیا تھا نہ چیف سیکرٹری نے مجھے سپورٹ کیا تھا صرف میری ذاتی کوشش تھی میں پنڈی گیا اور سینکشن وغیرہ کرا کے پیسے لے آیا۔ اس دن وہ کہنے لگے میں آپ سے کئی دفعہ یہ بات کرنا چاہتا تھا کہ صادق حسین قریشی آتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اس شخص سے میرا گزارا نہیں ہوسکتا' اب تک تو میں ٹال مٹول کررہا تھا لیکن آخر چیف منسٹر کا بھی کوئی اختیار

ہے' پھر اس نے بڑا اصرار کیا ہے تو میں نے اسے کہا ہے' ٹھیک ہے اگر تم اپنی مرضی کا آدمی لانا چاہتے ہو تو لے آؤ کہنے لگے میں آپ کو سنٹر میں لے آتا ہوں' وہ اس سے بھی زیادہ اہم عہدہ ہوگا میں نے کہا مجھے تو پنجاب آنے کی کبھی خواہش نہیں تھی اور نہ میں نے کبھی آپ سے کہا کہ ضرور میں یہاں رہنا چاہتا ہوں جہاں آپ مجھے بھیجیں گے وہاں چلا جاؤں گا چنانچہ میرا تبادلہ ہو گیا۔ یہ 76ء کی بات ہے وہ مجھے 22ویں گریڈ میں پروموٹ کر کے سنٹر میں لے گئے' وہ مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنیس بیورو لگانا چاہتے تھے وہاں شیخ اکرم صاحب تھے ان کے کچھ سپورٹر تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں وہاں آؤں۔ اس میں جو خاص بات ہے اس کا احوال آگے آئے گا اس طرح سے میں اسلام آباد پہنچا۔

جب میرا تبادلہ ہوا تو چیف منسٹر کے کیمپ میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ میری برادری کے کچھ آدمی تھے حالانکہ میں نے اپنے وقت میں برادری ازم نہیں کی بلکہ وہ لوگ بڑے ناراض رہے کہ اس نے اپنا ایک آدمی اے ایس آئی بھی نہیں لیا۔ یہ میرا ریکارڈ ہے کہ پورے دو پونے دو سال میں کسی ایک آدمی کو اے ایس آئی نہیں لیا۔ اس لیے نہیں لیا کہ یہ کام ڈی آئی جی کا ہے اور اگر میں ایک کو بھی سفارشی لوں گا، تو پھر میں کسی کو بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میری برادری کے لوگ مجھ سے بڑے ناراض تھے لیکن جب میرا تبادلہ ہوا تو خون کا ایک رشتہ ہوتا ہے نا' رانا پھول اور راؤ افضل اور اقبال ٹکا نے مل کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں میری ایک دعوت کی۔ اس میں انہوں نے کافی لوگ بلائے۔ منسٹرز بھی بلائے، صادق حسین قریشی کی کوشش تھی کہ کوئی آدمی وہاں نہ جائے اس کے باوجود وہاں کافی لوگ آئے۔ وزراء بھی آئے قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران بھی آئے سرکاری افسران بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے گورنر عباسی کو بھی دعوت دی تھی اس نے بھی کہا کہ میں آؤں گا صادق حسین قریشی کی چونکہ اس کے ساتھ رشتے داری ہونے والی تھی تو سنا کہ آخری وقت میں صادق حسین قریشی نے جا کے اسے کہا' کہ آپ نہ جائیں بہر حال اس قسم کی چھوٹی باتیں جن کا ایڈمنسٹریشن سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ ہماری ایڈمنسٹریشن کے سازشی ماحول کا بہت بڑا حصہ ہیں۔

میں پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ گیا تو صادق حسین قریشی اس سے بڑے پریشان ہوئے کہ یہ ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جو زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ ان کو یہ پریشانی رہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں لاہور آتا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے سپیشل برانچ کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو دیکھتے ہیں کہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے ایک دفعہ انہوں نے میرے ڈرائیور کو بلایا اس کو پوچھا کہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے وغیرہ وغیرہ میں نے بھٹو صاحب سے بڑے زور سے شکایت کی۔ بھٹو صاحب نے صادق حسین قریشی کو اس بات پر بڑا ڈانٹا۔ اس دوران قمر الزماں کے خلاف تفتیش ہوتی رہی۔ میں تو اسلام آباد چلا گیا۔

ڈی آئی جی عاشق چودھری ہوتے تھے۔ وہ کیس ان کے سپرد کیا گیا کہ تم اس کی تفتیش کرو۔ صادق قریشی نے عاشق چودھری کا لڑکا ڈی ایس پی لے لیا۔ بہرحال صادق حسین قریشی کو اس کیس میں سے نکال دیا گیا چالان ہوا بالآخر اس انسپکٹر (قمرالزمان) کو سیشن کورٹ سے پھانسی کی سزا ہوئی وہ اور اس کے دو اور ساتھی تھے۔ سیشن جج نے جب حکم سنایا تو یہ بھی کہا تھا کہ صادق حسین قریشی کے خلاف بھی کیس رجسٹرڈ کرنا چاہیے' زبانی کہا تھا لکھے ہوئے فیصلے میں یہ بات نہیں تھی اس دوران میں کیا پریشر پڑا' یا کیا سفارش ہوئی یا یہ کہ اس نے میرٹ پر کیا' بہرحال' صادق حسین قریشی کے خلاف کارروائی نہیں ہوئی۔

❖

پولیس اور جرائم

جب بھٹو صاحب نے حنیف رامے کے دور میں پنجاب کا دورہ ختم کیا تو میں نے کرائم کی طرف توجہ دی۔ میں نے سارے اضلاع کا دورہ کیا وہاں کی کرائم سچوایشن دیکھی ہمارے ملک میں ایک تاریخی عمل تھا جو ہر محکمے پر فٹ آتا ہے کہ انتظامیہ‘ عدلیہ‘ پولیس اور ریونیو کے نظام کی بنیاد انگریزوں نے دو سو سال پہلے رکھی تھی اور اس پر یہ عمارت استوار کی قیام پاکستان کے وقت تک یہ نظام چلتا رہا چونکہ ہر اہم عہدے پر انگریز ہوتے تھے‘ وہی اس نظام کو چلاتے رہے اور اس کی جو کارکردگی ہوتی تھی اس کا وہ لحاظ رکھتے رہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کارکردگی کی وجہ ان کی ذات تھی جب یہ نظام ہمارے حوالے ہوا اس وقت سے اس میں بتدریج کمزوری پیدا ہونا شروع ہوگئی اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی ذات سے باہر کبھی بھی نہیں نکلتے۔ انگریزوں کو یہ فائدہ تھا کہ ان کی یہاں کوئی برادری تھی نہ ان کا یہاں کوئی بھائی بھتیجا تھا اس لیے انہیں اصول ذاتیات کے لیے قربان نہیں کرنا پڑتے تھے۔ ان کو یہ ایک فطری فائدہ تھا جو ہم لوگوں کو نہیں ہے۔

اپنے ملک میں بھی کچھ لوگ اصول پرست ہیں‘ یہاں بھی وہ ذاتیات کے لیے اپنے اصول قربان نہیں کرتے‘ آپ دیکھتے ہیں کہ مغرب میں جمہوریتیں اچھی طرح چل رہی ہیں کبھی ان میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی لیکن ہمارے ہاں چونکہ خاندان کا‘ ذات برادری کا‘ فیملی کا‘ ابھی تک بہت زیادہ اثر ہے۔ اپنی فیملی‘ اپنا خاندان‘ اپنی برادری یا ضلع ہر چیز پر سبقت لے جاتا ہے اس کے لیے ہم اصول قربان کردیتے ہیں مثلاً بھرتی‘ پوسٹنگ اور ٹرانسفر میں دیکھیں گے کہ یہ اپنا آدمی ہے‘ اپنی برادری کا ہے‘ اپنے ضلع کا ہے اس حوالے سے کریں گے۔

میں 1951ء میں بھرتی ہوا ایک سال ٹریننگ لی پنجاب میں پوسٹنگ ہوئی اس وقت ہمارے معیار اور تھے کام اور ڈسپلن میں دو تین مثالیں پیش کروں گا ایک تو یہ تھا کہ اگر کوئی سیریس کیس ہو جائے تو

قاعدے قانون کے مطابق اس علاقے کے گزٹیڈ افسر انچارج کو وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچنا ہوتا تھا اور جب تک تفتیش کوئی خاص رخ اختیار نہ کرے اس کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ جو سنجیدہ اور اہم کیس ہیں ان کی تفتیش ماتحتوں پر نہیں چھوڑنی چاہیے۔ گزٹیڈ افسر خود ان کی تفتیش کرے تاکہ بے ایمانی یا تساہل کا کوئی امکان نہ رہے۔ مجھے یاد ہے میں کیمبل پور (اب اٹک) میں اے ایس پی تھا جب بھی قتل کے کیس کی رپورٹ آتی تھی حالانکہ اس وقت گزٹیڈ افسر کے پاس کار نہیں ہوتی تھی نہ سرکاری ٹرانسپورٹ ہم استعمال کر سکتے تھے تو جو بھی ٹرانسپورٹ ہمیں ملتی تھی مثلاً بس پر جانا پڑے بس پر جاتے تھے گھوڑے پر جانا پڑے گھوڑے پر جاتے تھے پیدل جانا پڑے پیدل جاتے تھے لیکن بغیر وقت ضائع کیے پہنچتے تھے۔ جب میں آئی جی ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس سلسلے میں یہ قاعدہ قانون لوگ بھول چکے تھے رسم پوری کرنے والی بات رہ گئی تھی۔

اسی طرح سے انسپکشن کا تھا مثلاً یہ ضروری تھا کہ ایس پی ہر تھانے کو چھ مہینے میں ایک دفعہ ضرور ملاحظہ کرے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس معاملے میں بھی بڑا تساہل بڑھتا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ نگرانی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی نگرانی کرنے والے خود اپنے کام میں تساہل برتتے جا رہے تھے اس طرح سے معیار آہستہ آہستہ گرتا جا رہا تھا۔

میں نے کوشش کی کہ قانون اور قاعدے پر کسی نہ کسی طرح سے دوبارہ عمل شروع ہو پھر کئی اور مسئلے تھے اصل میں پولیس کا کام جرائم کو کنٹرول کرنا تھا لیکن زیادہ تر وقت سیاسی بھاگ دوڑ یا وزراء کی یا گورنروں کی یا چیف منسٹر کی یا پرائم منسٹر کی آمدورفت پر گزر جاتا تھا۔ سیاسی حکومت ہو تو اس میں ہر قسم کی ایجی ٹیشن ہوتی ہے کبھی مزدور کر رہے ہیں، کبھی طلبہ کر رہے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جو تم پیزار ہو رہی ہے تو پولیس کا باقی وقت اس میں گزر جاتا تھا جو اصل کام ہیں مثلاً جرائم پہ کنٹرول کرنا اس سے توجہ ہٹ گئی تھی باقی ڈیوٹیز زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھیں۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا تھا کہ پورا پورا مہینہ سٹوڈنٹس ایجی ٹیشن جاری ہے ہر روز ہر تھانے میں پولیس سٹینڈ ٹو ہوتی تھی۔ صبح سے شام تک بیٹھے ہیں نہ مقدمے کی طرف کوئی دھیان ہے نہ جرائم پر کنٹرول ہے سارا دن اگر اس طرح رہیں گے تو رات کون باہر جا کے ڈیوٹی دے گا۔

ایک تو یہ بڑا پرابلم ہو گیا اس کی وجہ سے دیہات کے تھانے بھی متاثر ہوتے ہیں مثلاً انگریزوں کے زمانے میں سردیوں میں دیہی دورے ہوا کرتے تھے اور اس میں ایس پی یا گزٹیڈ آفیسر تھانوں کی انسپکشن کے لیے گھوڑوں پر ہر گاؤں میں جاتے تھے۔ آج کل اس کی کہاں فرصت ہوتی ہے وہ تو خیر سیاسی حکومت تھی لیکن آج کل فوجی حکومت ہے اس میں بھی سارا دن کبھی ضیاء الحق آ رہا ہے کبھی ضیاء

الحق جا رہا ہے آج سائیکل پر کوئی سفر کر رہا ہے چنانچہ جتنے بھی گزٹیڈ افسر جنہیں اضلاع میں جرائم پر کنٹرول کرنا ہوتا ہے وہ خود ہر روز حاضر باشی میں لگے رہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ پولیس کی نفری کا تعلق جرائم سے بھی ہے اور ملک کی آبادی سے بھی ہے تو جوں جوں آبادی بڑھتی ہے پولیس کی تعداد بھی بڑھنی چاہیے لیکن ہوتا یہ ہے کہ آبادی بڑھتی رہتی ہے اور پولیس کی نفری بڑھانے کے لیے گورنمنٹ کے پاس بجٹ نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ اتنی کم نفری ہوتی ہے مسائل زیادہ ہو جاتے ہیں جرائم ہوتے ہیں تو پھر پولیس آسان راستے اختیار کرتی ہے وہ جرائم رجسٹر ہی نہیں کرتی یہ عام شکایت ہے۔

بہرحال میرا خود یہ مسئلہ تھا کہ سیاسی مسائل تھے' ایجی ٹیشن وغیرہ تھے یا پھر باہر کے جو سربراہ حکومت آتے تھے' ان کے دورے یا پھر پرائم منسٹر کا دورہ اس وجہ سے بھی ہم لوگوں کو بہت کم وقت ملتا تھا لیکن کوشش یہی ہوتی تھی کہ امن وامان برقرار رہے۔

پولیس سٹرائیک کے بعد پولیس میں ڈسپلن نہیں رہا۔ پنجاب پولیس کا ڈسپلن مثالی ہوا کرتا تھا۔ اس میں کافی خرابی پیدا ہوگئی تھی اور اس سٹرائیک کے اثرات بہت حد تک باقی ہیں مثلاً جب میں شروع شروع میں آیا۔ چمبہ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ جو عام استقبالیہ تھا اس میں اکٹھے ہو کے دس پندرہ کانسٹیبل پہنچ گئے حالانکہ یہ کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اتنے سپاہی ایجی ٹیشن کی صورت میں آئی جی کے پاس پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ آپ کے پاس شکایت لے کر آئے ہیں۔

1952ء میں ہم اے ایس پی تھے تو جب اے ایس پی آتے ہیں تو قاعدے کی رو سے اپنے سینئر افسران سے گھر پر رسمی طور پر ملاقات کرتے تھے چنانچہ جب ہم لوگ 52ء میں آئے تو قربان علی خاں ہمارے آئی جی تھے ان کا اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ ہم لوگوں کو یہ ہمت نہیں پڑی کہ ہم جا کے ان سے کرٹسی کال (خیر سگالی کی ملاقات) کرتے۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کو اتنا ڈرایا گیا کہ یہ کوئی بھوت ہے اگر کوئی گیا' تو وہ کھا جائے گا چنانچہ اے ایس پی ہوتے ہوئے ہم کو ہمت نہیں پڑی کہ ہم جا کے کرٹسی کال کرتے بلکہ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ہم میں سے ایک اے ایس پی انیس الرحمٰن عارف ہمت کر کے آئی جی کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے اندر بلا لیا' بلا کے انہوں نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا' کہنے لگے کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں یا کوئی حقیقت ہے کہ ایک اے ایس پی مجھ سے ملنے آ گیا ہے' وہ تو اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی آ کے ملے لیکن محکمے میں ان کا اتنا خوف پھیلایا گیا تھا کہ لوگوں کو ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جا کے ملتے تو انیس الرحمان عارف نے آ کے بڑے فخر سے بتایا کہ میں آئی جی سے مل کے آیا ہوں اور وہ

بڑے اچھے طریقے سے ملے ہیں۔

جب میں آئی جی بن کے پہنچا تو دس پندرہ کانسٹیبل ڈیپوٹیشن لے کر پہنچ گئے ایک ذہنی انقلاب آ چکا تھا' ڈسپلن کا یہ حال ہو گیا تھا۔

مجھے بطور آئی جی جو سب سے بڑا پرابلم ہوا وہ اصغر خان ہلاکو خاں تھا اس کو میں نے ایس ایس پی لاہور لگا رکھا تھا اب ہلاکو خاں اپنی طبیعت کا آدمی ہے۔ سیاستدان وہ زیادہ ہے پولیس افسر کم ہے اس کی طبیعت میں سختی ہے جرائم پیشہ لوگوں پر اس کا رعب شعب ہے کہ ہلاکو خاں بڑا سخت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے لاہور کنٹرول کیا لیکن ہر چیز میں ایک توازن ہونا چاہیے۔ اس نے کنٹرول اس طرح سے کیا کہ جو نفری دن بھر سڑکوں پر ہوتی تھی ان سے یہ رات کو بھی ڈیوٹی کرواتا تھا وہ بیچارے بغیر کھائے' بغیر پیئے بغیر آرام کیے واپس آتے تو ان کو مارچنگ آرڈر ملتا کہ تم پھر جاؤ۔ کچھ عرصہ تو وہ برداشت کرتے رہے آخر ان کا پیمانہ صبر چھلک پڑا۔ دراصل ہلاکو خاں کے دل میں اپنے جوانوں کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی اگر کام بڑھ جائے اور جوانوں کو یہ احساس ہو کہ افسران کی تکلیفوں کو سمجھتے ہیں ہمدردی رکھتے ہیں تو پھر بھی وہ برداشت کر جاتے ہیں لیکن اگر وہ یہ سمجھیں کہ انہیں بالکل ڈھور ڈنگروں کی طرح ہانکا جا رہا ہے پھر ظاہر ہے کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کے چھلکتا ہے چنانچہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ اس کی سختی سے تنگ آ گئے۔ سختی کے علاوہ اس میں اپنی انا بھی بہت زیادہ تھی یہاں تک کہ ایک روٹ مارچ کراتا تھا وہ اس طرح کہ خود مال روڈ پر سفید گھوڑے پر آگے جا رہا ہے اور ایس پی اور ڈی ایس پی اور ساری پولیس فورس' تین چار سو آدمی اس کے پیچھے پیدل چل رہے ہیں حالانکہ روٹ مارچ کا اصول یہ ہوتا ہے کہ اگر جوان پیدل ہیں تو افسروں کو بھی پیدل ہونا چاہیے۔ جن کو یہ پیدل مارچ کراتا تھا ان میں ایسے ایس پی بھی تھے جو اس سے سینئر تھے لیکن اتفاق سے یہ ایس ایس پی تھا اور وہ وقتی طور پر اس کے ماتحت تھے ان سب چیزوں کا ال کے یہ اثر ہوا کہ ایک روز میں شام کے وقت گھر بیٹھا ہوا تھا ٹیلی فون آیا کہ پولیس لائنز میں سٹرائیک ہو گئی ہے اور سپاہی جلوس نکال کے باہر نکل آئے ہیں۔ یہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے کہ آپ کو فوری فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کیا کرنا ہے ساری صورتحال کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ فوری فیصلہ بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں اس موقع پر ایک تو یہ طریقہ تھا کہ میں ڈی آئی جی کو بلاتا اور کہتا کہ جاؤ دیکھو' کیا ہو رہا ہے لیکن بغیر کسی سوچ کے میں کار میں بیٹھا اور سیدھا پولیس لائنز پہنچا۔ پتہ چلا کہ سپاہیوں کا جلوس ہلاکو خاں کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا جب قلعہ گجر سنگھ کے بازار سے گزرا تو ایس پی ہیلٹ ان کو سمجھا بجھا کے واپس لے آیا۔ ہیلٹ اچھا افسر تھا' میں کار سے اترا اور بیرک میں جہاں ہیلٹ ان سے بات کر رہا تھا وہاں پہنچا ہیلٹ نے کہا آئی جی صاحب آ گئے، آئی جی صاحب آ گئے تو کسی نے لائٹ آف کر دی اب اس کی وجہ فوری طور پر جو میری سمجھ میں آئی وہ

یہ کہ میں پہچان نہ سکوں کہ وہاں کون کون ہیں دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اندھیرے میں آئی جی کو لگا دو۔ میں نے زور سے کہا۔ لائٹ آن کر دو۔ انہوں نے لائٹ آن کر دی۔ اس کے بعد آئی جی صاحب زندہ باد ہونے لگا یہی ان کے لیے کافی تھا کہ آئی جی خود پہنچ گیا۔ ہمارے لوگ سادہ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کا خیال رکھا جائے تو وہ بہت ہی اچھے لوگ ہوتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ یہ جو آپ نے سٹرائیک وغیرہ کی ہے یہ زیادتی کی ہے ٹھیک تھا اگر ایک شخص کی بدنامی ہوتی لیکن اس سے تو سارے محکمے کی بدنامی ہوئی آپ کو بھی لوگ اچھا نہیں کہیں گے اگر اس قسم کی بات تھی تو مجھ تک پہنچتے کہنے لگے'' آپ تک پہنچنے کوئی نہیں دیتا میں نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اگر افسر چاہیں تو آپ کو میرے سامنے پیش نہ ہونے دیں لیکن آپ مجھے ایک گمنام چٹھی لکھ سکتے تھے کم از کم مجھ کو پتہ چل جاتا کہ اس قسم کے حالات ہیں لیکن آپ نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے سارے محکمے کی بدنامی ہوئی ہے میں نے کہا میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ سوائے ان کے جن کا پیشہ ہی اس قسم کے حالات پیدا کرنا ہے جو آپ کی شکائتیں ہیں وہ خود میں آپ سے سنوں گا لیکن اس قسم کا مظاہرہ دوبارہ نہیں ہونا چاہیے انہوں نے وعدہ کیا وہ ایسا مظاہرہ نہیں کریں گے چنانچہ میں تین دن تک قلعہ گوجر سنگھ پولیس لائنز جا کے صبح سے شام تک بیٹھتا تھا۔ تو سینکڑوں آدمیوں نے مختلف قسم کی درخواستیں دیں۔

ایک تو یہ کہ ڈیوٹی کی تقسیم پر بڑی گڑبڑ تھی جو ان کے فیورٹ تھے ان کی ڈیوٹیاں نہیں لگاتے تھے جن کا کوئی والی وارث نہیں تھا وہ گدھوں کی طرح صبح سے شام تک شام سے صبح تک کام کرتے تھے۔ وہاں کا ڈسپلن یہ تھا کہ بہت سارے لوگ مہینوں سے پولیس لائنز سے غائب تھے لیکن ان کو تنخواہیں مل رہی تھیں میں نے وہاں جو حالات دیکھے تو حیران رہ گیا کہ اس قدر بدانتظامی اور ڈسپلن کا فقدان ہے پروموشن کے سلسلے میں بے شمار بدعنوانیاں تھیں بے شمار سفارشی آدمی پرموٹ ہوتے تھے۔

تبادلوں کا ایک سسٹم ہوتا ہے کہ آدمی یہاں پوسٹ ہو گا اس کے بعد وہاں پوسٹ ہو گا پھر کچھ ڈیوٹیز سخت ہوتی ہیں کچھ سخت نہیں ہوتیں کہیں پیسے ملتے ہیں کہیں پیسے نہیں ملتے اس لحاظ سے اس کی اہمیت ہوتی ہے اس لیے یہ ہوتا ہے کہ فلاں آدمی اتنے مہینے یہ ڈیوٹی دے گا اتنے مہینے وہ والی ڈیوٹی دے گا۔ اس میں بھی یہ بڑی دھاندلی کرتے تھے چنانچہ وہ سارا میں نے ٹھیک ٹھاک کیا میں نے محسوس کیا کہ اصغر خان (ہلاکو خاں) بہت زیادہ (ان پاپولر) غیر ہر دلعزیز ہے ساری ذمہ داری اسی پر آتی تھی کہ سٹرائیک کا مطلب ہے کہ لوگوں کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو وہاں سے ٹرانسفر بھی کرا دیا۔

تو جس بات پر قصہ ہوا وہ یہ کہ جب ہمارے لوگ ڈیوٹی پر جاتے تھے مثلاً پرائم منسٹر صاحب آ رہے ہیں صبح بیچارے چار بجے صبح گھر سے نکلیں گے پولیس لائن آئیں گے وہاں انہیں ڈیوٹی تقسیم ہو گی پتہ

نہیں ٹرانسپورٹ کب پہنچے گی اور وہ واپس کب پہنچیں گے پھر شام کو انہوں نے کسی اور پروگرام میں جانا ہے اس طرح سے سارا دن بیچارے سڑکوں پر رہتے ہیں میں نے یہ ہمیشہ خیال رکھا کہ ان کو وقت پر کھانا دیا جائے وقت پر چائے دی جائے اس کے لیے موبائل کنٹین کا انتظام کیا کہ کھانا ان کو جہاں وہ کھڑے ہوتے تھے وہاں ملنے لگا چائے بھی ان کو وہاں ملتی تھی۔ میں کبھی کبھی گزرتا تھا تو وہ موبائل کینٹین دیکھ کے مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

میرا یہ قاعدہ تھا کہ کہیں میں کھڑا ہو گیا اور سپاہی سے بلا کے پوچھا کہ تمہیں چائے ملی؟ اگر چائے کا وقت ہے اگر کھانے کا وقت ہے تو پوچھا کھانا ملا؟ اگر نہیں ملا تو اس کے افسر کو بلا کے ڈانٹ پلاتا تھا کہ سپاہی کھڑے ہیں ان کو کھانا کیوں نہیں ملا۔

اصغر خان (ہلاکو خاں) کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ اس نے محکمے کے علاوہ کچھ خاص اہم آدمیوں سے ہمیشہ مراسم رکھے چونکہ ہمارے لوگ طبعاً بڑے کمزور ہوتے ہیں مثلاً گورنر ہے اس کے اپنے کوئی اختیارات نہیں ہیں لیکن کوئی ایس پی جب کے جا کے ملے گا اور اس کے کام وام کر دے گا تو وہ بڑا خوش ہو گا کہ میرا بڑا وفادار ہے۔

ہلاکو خاں سے صادق حسین قریشی کی دوستی تھی چنانچہ جب میں نے اس کو ڈانٹ وانٹ پلائی تو اس نے جا کے صادق حسین قریشی کو بتایا کہ آئی جی نے مجھے ڈانٹا ہے بہر حال میں نے اس کا تبادلہ کر دیا۔ وکیل خان ڈی آئی جی تھا اس کا بھی تبادلہ کر دیا اور لاہور کا میں نے ایک سسٹم بنایا کہ ایک ڈی آئی جی ہو اور اس کے ماتحت کئی ایس پی ہوں۔

ہلاکو خان نے سوچا کہ آئی جی کے ساتھ اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب میں لاہور کے لیے نیا سسٹم دے رہا تھا اس نے مل ملا کے اپنا ٹرانسفر بلوچستان کرا لیا۔ اس کا بھی دلچسپ قصہ ہے۔ وہ یہ کہ بلوچستان کے آئی جی انیس الرحمٰن عارف اس کے بڑے دوست تھے انہوں نے لکھا چونکہ بلوچستان میں جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا مجھے یہاں ایک ڈی آئی جی کی ضرورت ہے اصغر خان کو آؤٹ آف ٹرن ڈی آئی جی بنا کے بھیجا جائے بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ اس کو گورنر بنا کے بھجوا دیں یہ تو اس آئی جی کا مسئلہ ہے میرا تو نہیں۔ اب ہلاکو خاں صاحب وہاں پہنچ گئے یہ سیاست دان زیادہ ہیں افسر کم ہیں بھٹو صاحب کے زمانے میں انہوں نے بڑے فائدے اٹھائے مثلاً ڈی آئی جی بن گئے۔ بیک ڈور سے بن گئے اور وہاں انیس الرحمٰن عارف سے کہتا رہا کہ میں آپ کو پنجاب میں آئی جی لگواؤں گا میری فلاں سے دوستی ہے۔ فلاں سے گہری چھنتی ہے وغیرہ وغیرہ چنانچہ بلوچستان میں اسی کے قیام کا حساب لگایا جائے تو مشکل سے ہفتہ دس دن بنتا ہو گا سارا وقت یہ لاہور میں ملتان میں

کوشش کرتا رہا کہ راؤ رشید کا تبادلہ کرا کے انیس الرحمٰن عارف کو آئی جی لگوا دے اب اتفاق یہ کہ ہمارے جتنے سینئر پولیس افسر ہیں خاص طور سے جو پنجاب کے رہنے والے ہیں پنجاب ان کی ہمیشہ کمزوری رہا ہے کہ وہ پنجاب کا آئی جی ضرور بنیں۔ چاہے اس سے دوستی میں فرق پڑے یا کسی گھٹیا پن کا مظاہرہ کرنا پڑے۔ یا کسی کی ٹانگ کھینچنی پڑے۔

چونکہ سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس وقت بھی یہی سوچ تھی اس لیے کہ جس صوبے کا آدمی ہو وہاں آئی جی لگے تو وہ ایک فخر کی بات ہوتی ہے اس کی فیملی کے لیے برادری کے لیے دوستوں کے لیے ورنہ ہمارے معاشرے کی سوچ یہ ہے کہ پنجاب کا آدمی سرحد میں لگ جائے تو کس نے دیکھا جنگل میں مور ناچنے والی بات تھی اصل میں وہ گھر میں ناچنا چاہتے تھے ان کو یہ لارے دیتا رہا کہ میں آپ کو آئی جی پنجاب لگواؤں گا اور کوشش بھی کرتا رہا اس میں تو کامیابی نہ ہوئی۔

جب بھٹو صاحب بلوچستان جاتے تھے تو وہ ان کی ایک طرف سے کمزوری کے لمحات ہوتے تھے اس لیے کہ بلوچستان میں سچوایشن ٹھیک نہیں تھی اور جو افسر وہاں ہوتے تھے وہ جو مشکلات بیان کرتے تھے بھٹو صاحب وہ دور کرنے کی کوشش کرتے تھے پھر ان لوگوں کو موقع مل جاتا تھا غلط سلط مطالبوں کا بھی اب تو یہ ان افسران پر منحصر تھا کہ وہ جائز مطالبات کرتے ہیں یا ناجائز تو بہر حال تین چار مہینے کے بعد ہلاکو خان نے کوشش کر کے یہ حکم کرا لیا کہ ہلاکو خاں کو اور ایس پی زمان جو پنجاب میں ڈی ایس پی تھا وہاں ایس پی ہو کے گیا تھا اور ایک انسپکٹر جو یہاں انسپکٹر تھا وہاں ڈی ایس پی ہو کے گیا تھا چونکہ وہاں ایک رینک پروموشن پر لگاتے تھے ہلاکو خاں نے کوشش کر کے یہ حکم کرا لیا کہ ان تینوں کو واپس پنجاب اسی رینک میں بھیجا جائے جو ان کو آؤٹ آف ٹرن بلوچستان میں ملا ہوا تھا یعنی ہلاکو خاں ڈی آئی جی زمان ایس پی وہ جو انسپکٹر تھا وہ ڈی ایس پی یہ بڑی ناجائز سی بات تھی کہ چار مہینے بلوچستان میں رہ کے اور اس طرح سے ناجائز پروموشن حاصل کر لیں جبکہ ہلاکو خاں سے کئی سینئر ایس پی یہاں بیٹھے ہوئے تھے زمان بھی جونیئر تھا انسپکٹر تو بہت ہی جونیئر تھا مجھے حکم آ گیا کہ وزیر اعظم نے اس کی منظوری دی ہے یہ ایک خاص طریقہ تھا کہ جب کوئی کام غلط کرنا ہو تو وہ اس طرح سے حکم ہوتا تھا کہ وزیر اعظم نے اس کی منظوری دی ہے حالانکہ پرائم منسٹر کو وہ بتاتے بھی نہیں تھے کہ اس میں کیا مشکلات ہیں۔ بہت سے لوگ اس طرح سے غلط کام کروا لیتے تھے تو جب میرے پاس حکم آیا میں نے کہا میں تو ان کو نہیں لیتا یہ ناانصافی کی بات ہے۔ انہوں نے بلوچستان جا کے کون سے پہاڑ توڑ لیے۔ چار مہینے وہاں رہے اس کا تو مطلب یہ ہے کہ جو بلوچستان کے آئی جی کو پسند ہو وہ ایسے ہر آدمی کو یہاں سے بلوچستان بلا کے پروموٹ کر کے چار مہینے وہاں رکھ کے پھر ہمارے سر پر سوار کر کے واپس بھیج دے۔ میں نے کہا اس سے تو بدعنوانی کا ایک اور راستہ کھلتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو

لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان کی بھی ڈیوٹی ہے وہ بھی سرکاری کام کر رہے ہیں اس طرح سے ان کو کیوں متاثر کرتے ہو۔ کہنے لگے وزیر اعظم کا حکم ہے میں نے کہا وزیر اعظم کا حکم ہے تو ٹھیک ہے آپ میری طرف سے ان کو یہ بتائیں کہ یہ میں رپورٹ لکھ کے ان کو بھیجتا ہوں کہ ہلاکو خاں وہاں صرف چار مہینے رہا ہے اور اس سے اتنے آدمی پنجاب میں سینئر ہیں۔ اس طرح سے اتنے آدمی انسپکٹر ہیں۔ اتنے آدمی ڈی ڈی ایس پی ہیں اور ان کی پروموشن سے پولیس فورس کا مورال تباہ ہوگا۔ ہلاکو خاں کو آپ کہیں گورنر لگا دیں۔ مجھے پرواہ نہیں لیکن جب یہ میرے پاس آئے گا تو اپنے رینک پر آئے گا چنانچہ جب تک میں پنجاب میں رہا ہلاکو خاں ڈی آئی جی کے طور سے نہیں آسکے۔

شہنشاہ ایران آ رہے تھے ہم لوگ پنڈی گئے ہوئے تھے پنڈی میں میں اپنے سیلون میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں مجھے اطلاع ملی کہ ساہی وال میں پولیس نے سٹرائیک کر دی ہے اور انہوں نے ساری پولیس لائنوں کو فون بھی کیے کہ ہم نے سٹرائیک کر دی ہے تم لوگ بھی سٹرائیک کرو۔ بہر حال کسی نے اس پر دھیان دیان نہیں دھرا۔

دوسرے شہروں میں بھی۔ مثلاً گجرات، سرگودھا اور جہاں بھی وہ فون کر سکتے تھے انہوں نے فون کیے۔ ادھر شہنشاہ ایران نے پنڈی آنا تھا پھر انہوں نے لاہور آنا تھا اس کے بعد کراچی جانا تھا اس کے انتظام کے لیے ہم نے سارے ضلعوں سے پولیس بلائی ہوئی تھی اچھی خاصی نفری جمع تھی اسی طرح سے لاہور میں جمع ہوئی تھی میرا خیال ہے کہ میری سروس میں سب سے مشکل وہ لمحہ آیا جب تک شہنشاہ ایران چلے نہ جائیں سد باب میں اس کا نہیں کر سکتا تھا کہ اگر خدانخواستہ سٹرائیک ہو جائے یا کسی کو پتہ لگ جائے کہ سٹرائیک ہو گئی ہے تو جو پولیس شہنشاہ کی حفاظت کر رہی ہے اس پر کون اعتماد کرے گا چنانچہ ایک ہوتا ہے نا۔ وڑ وٹنا (جان بوجھ کر خاموش رہنا) میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں کہ اس قسم کا واقعہ ہوا ہے سب لوگ چونکہ شہنشاہ کے دورے میں اتنے مصروف تھے اس لیے اہم لوگوں تک یہ بات پہنچی نہیں۔ مجھے بھی فکر تھی کہ کسی طرح سے شہنشاہ پنجاب سے چلا جائے تو پھر میں اس مسئلے سے نپٹوں۔ اس میں میں ایک طرح سے بے بس تھا سوائے اس کے کہ میں انتظار کرتا رہا اور میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا پھر تو گڑ بڑ مچ جاتی کچھ ہو جاتا تو یہی کہا جاتا کہ آئی جی کی وجہ سے ہوا ہے۔ چنانچہ وقت گزر گیا اور ضلعوں میں کسی نے سٹرائیک وغیرہ نہیں کی یہ خدا کی مہربانی ہوئی کہ ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ پہلے والی سٹرائیک انہی پیغامات پر ہو چکی تھی لیکن اب کم از کم اس ضلعے سے باہر کسی نے اس پر دھیان نہیں دھرا۔

جب شہنشاہ ایران پنجاب سے کراچی چلے گئے پھر میں نے کہا کہ اب میں ان سے نپٹتا

ہوں۔ چنانچہ میں نے ڈی آئی جی اور ایس پی کو بلایا کہ بات کیا ہے پتہ یہ چلا کہ پیپلز پارٹی ساہی وال کا صدر حسن عسکری جو ڈاکٹر مبشر حسن کا عزیز ہے۔ کسی کولے کے صدر تھانہ ساہی وال پہنچا۔ کوئی پرچہ درج کرانے، وہاں اس کی ایس ایچ او سے ٹو ٹو میں میں ہو گئی خیال تھا کہ وہ صدر تھا پیپلز پارٹی کا اس لیے ہو سکتا ہے اس نے کوئی زیادتی کی ہو ادھر ایس ایچ او تو آپے سے باہر ویسے ہی ہوتے ہیں وہ تو برداشت نہیں کر سکتے۔ خر دماغ ایس ایچ او تھا۔ عسکری ایس پی کے پاس چلا گیا۔ ایس پی نے بیوقوفی یہ کی کہ بغیر تسلی کیے عسکری کی شکایت پر ایس ایچ او کو وہاں سے ٹرانسفر کر دیا اس بات پر ایس ایچ او نے کہا کہ یہ ہماری بڑی بے عزتی ہے سپاہی سارے اس کے ساتھ مل گئے اس نے کہا میں تو نہیں جاتا۔ اس نے تھانہ بند کر دیا اوپر سیاہ جھنڈا لگا دیا اور کہا کہ ہم سٹرائیک پر ہیں۔ انہوں نے ساری جگہوں پر فون کیے انہوں نے کوشش کی کہ پولیس لائنز میں بھی سٹرائیک ہو لیکن وہ اس تھانے تک محدود رہی۔ اب ایس پی نے کمزوری یہ دکھائی کہ خود جا کر اسے ڈیل کرنے کی بجائے کبھی وہ پی ڈی ایس پی کو بھیج رہا ہے کبھی انسپکٹر کو بھیج رہا ہے وہ منت سماجت کر رہے ہیں کہ دروازے کھولو وہ دروازہ نہیں کھولتے اس وقت ملتان میں ہمارا ڈی آئی جی چودھری بشیر تھا۔ بڑا شریف آدمی تھا بڑا نیک اور ایماندار آدمی تھا لیکن طبیعت کے لحاظ سے کمزور کوئی پہل قدمی نہیں کرتا تھا۔ بڑا محتاط آدمی تھا۔ اس نے بھی کہا کہ ایس پی کا معاملہ ہے میں دخل نہیں دیتا۔ ایس پی پر چھوڑ دیا بہر حال جب شہنشاہ ایران چلے گئے میں نے دو کام کیے ایک تو پولیس رول میں ترمیم کرائی پولیس رول میں انکوائری کا طریق کار بڑا لمبا تھا پہلے چارج شیٹ دو اس کے بعد ڈیفنس ہو جبکہ ہڑتال ایک ایسی چیز ہے کہ جب پولیس نے ہڑتال کر دی تو اس میں پھر کوئی لا اینڈ آرڈر نہیں رہتا پولیس رول میں میں نے ترمیم یہ کرائی کہ اگر پولیس ہڑتال کر دے تو اس میں پھر کسی انکوائری وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ موقع پر ہی ڈسمس کیا جا سکتا ہے دوسرے میں نے یہ کیا کہ ریزرو پولیس کے پانچ سو آدمی اکٹھے کیے۔ ریزرو پولیس کو میں نے موثر بنایا ہوا تھا اس طرح سے کہ ریزرو پولیس کی وردی میں خود بھی پہنتا تھا۔ اس سے ان کا خیال تھا کہ آئی جی صاحب ہم پر زیادہ مہربانی کرتے ہیں یا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں نے ریزرو پولیس کے پانچ سو آدمی اکٹھے کیے نبلٹ کو ان کا انچارج بنایا اور کہا کہ جاؤ سب سے پہلے اسلحہ خانے پر قبضہ کرو اگر کوئی سٹرائیک پر ہو تو انہیں مارو اگر تمہیں مارنا بھی پڑیں تو پچاس ساٹھ آدمی بیشک مار ڈالو۔ مزاحمت کی بالکل پرواہ نہ کرو نبلٹ صبح ہی صبح وہاں پہنچا۔ جا کے انہوں نے اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔

پولیس لائن والوں نے کہا کہ ہم نے کوئی سٹرائیک وغیرہ نہیں کی اس کے بعد وہ تھانے گئے۔ انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے یہ حکم سنا دیا کہ سارے کے سارے ڈسمس۔ سارا تھانہ ڈسمس ہو گیا پھر انہوں نے کہا دروازہ کھولو ورنہ ہم تمہیں گولیوں سے اڑا دیں گے۔ انہوں نے تھانہ کھول دیا بات کیا نکلی کہ

جی ہم سے تو کسی نے آ کے پوچھا ہی نہیں کہ ہمیں کیا تکلیف ہے۔

اس کے بعد پنجاب پولیس نے پھر ہڑتال کی کوشش نہیں کی۔

پھر عسکری میرے پاس آیا اور مجھ سے معافیاں مانگنے لگا کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی میرا تو ایسا ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایس ایچ او بیوقوف تھا اس نے خواہ مخواہ اس بات کو اتنی ہوا دی۔

❖

مسعود محمود

پنجاب میں بموں کے دھماکے نیپ کی تحریک کی ایک کڑی تھے پہلا دھماکہ جو وپڈا ہاؤس میں ہوا سب سے زیادہ سنگین تھا۔ مجھے یاد ہے میں کسی دوست کے ہاں لنچ پر گیا ہوا تھا کہ وہاں مجھے اس کی اطلاع ملی۔ جب میں واپڈا ہاؤس پہنچا تو پولیس وہاں پہنچ چکی تھی دیکھا تو بڑا زوردار دھماکہ ہوا تھا بم غسل خانے میں پھٹا تھا جس سے غسل خانہ تو خیر اڑ ہی گیا دفتر جو استقبالیے کے نزدیک تھا وہاں بیچارہ اکاؤنٹنٹ تھا وہ جاں بر نہ ہو سکا اور کچھ آدمی زخمی ہوئے بنیادی نقصان تو نہیں ہوا دیواریں اور شیشے وغیرہ کافی ٹوٹے۔ ہمیں اس کا تجربہ نہیں تھا فرنٹیئر میں تو ہو رہے تھے لیکن پنجاب میں یہ پہلا دھماکہ تھا سمجھ میں نہ آئے کہ یہ کس طرح سے ہوا کس نے کیا بم کے ماہر پولیس میں تو نہیں تھے فوج میں تھے۔ انہوں نے بتایا لگتا ہے کہ یہ پلاسٹک بم ہے پلاسٹک بم صابن کی ٹکیہ سے بڑا ایک جیسا ہوتا ہے جب وہ چلتا ہے اس میں کوئی چیز نہیں رہتی وہ سارا اڑ جاتا ہے اس میں ایک ڈیوائس پن یعنی لوہے کی پن رہ جاتی ہے جس سے ایک گھنٹہ پونا گھنٹہ، آدھ گھنٹہ پندرہ منٹ کا ٹائم مقرر کر سکتے ہیں۔ ماہرین نے ہمیں بتایا وہ پن آپ تلاش کریں اس سے پتہ چلے گا کہ یہ کس ساخت اور طاقت کا ہے۔ سارا ملبہ تلاش کیا گیا اتفاق سے وہ پن مل گئی۔ اس پن پر روسی زبان میں کچھ لکھا تھا جس سے پتہ چلا کہ یہ دھماکہ نیپ کے لوگوں نے کروایا ہے۔

پھر چند ایک اور دھماکے ہوئے ریلوے سٹیشن پر ایک دھماکہ ہوا۔ اس طرح کہ رات کا وقت تھا بیچارہ ایک آدمی پیشاب کر رہا تھا دھماکہ ہوا تو وہ جھلس گیا۔ فضل محمود صاحب اس وقت A.I.G ریلوے تھے اس آدمی کو پکڑ لیا گیا کہ اس نے دھماکہ کیا ہے پولیس جس لائن پر چل نکلے اس کی پھر یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ثابت کریں حالانکہ وہ آدمی بے گناہ تھا اگر دھماکہ کرتا تو اس کا دماغ خراب تھا کہ وہاں کھڑا ہو کے پیشاب بھی کرنے لگتا۔

وہ بیچارہ جھلس گیا وہ بھاگا اس کو پکڑ لیا۔ ٹائم ڈیوائس ایسا ہوتا ہے کہ ایک گھنٹے تک کے لیے اس

کوسیٹ کیا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ جو آدمی دھماکے کے لیے بم پلانٹ کرے گا وہ خود تو وہاں کھڑا نہیں ہوگا کامن سینس کی بات ہے اس کو حوالات میں رکھا ہوا ہے پوچھ گچھ ہو رہی ہے کچھ نکل نہیں رہا پھر بھی اس کو رکھا ہوا ہے خیر میں نے اس کو چھڑایا۔

اسی طرح سے مری میں ٹیلی ویژن کا بوسٹر تھا وہاں بھی دھماکہ ہوا وہاں تین یا چار بم پلانٹ کیے گئے تھے خوش قسمتی سے ایک ہی پھٹا جس سے زیادہ نقصان نہیں ہوا اسلام آباد میں بجلی کے ایک سب سٹیشن پر بھی ایک بم رکھا گیا اتفاق سے وہ بھی نہیں پھٹا تھا وہ ہمیں جوں کا توں مل گیا جس سے ہمیں پتہ چلا کہ یہ کس قسم کے بم ہیں۔

سب کی ایک ہی قسم تھی کوئی ایک فٹ لمبا آدھ فٹ سے تھوڑا کم چوڑا جیسے کیک کی شکل ہوتی ہے اس میں وہ پن فٹ کر دیتے تھے اس پن سے چوٹ پڑتی تھی اس سے دھماکہ ہوتا تھا ورنہ اسے ہاتھ میں لیں کچھ نہیں مجھے یاد ہے میں نے پریس کانفرنس بھی کی اور دکھایا بھی کہ یہ اس طرح کے بم ہیں اگر کسی کو ملے تو وہ پولیس کو بتائے پھر کچھ چھوٹے موٹے دھماکے بھی ہوئے ہم لوگوں کو کافی پریشانی ہوئی۔

اسی دوران میں یہ ہوا کہ اصغر خان صاحب (ریٹائرڈ ائر مارشل) لاہور دورے پر آرہے تھے تو A.I.G ریلوے میرے پاس آئے کہ ہم نے آدمی پکڑا ہے۔ بم اس کے پاس تھا۔ وہ ریل گاڑی کے ڈبے میں اس کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا اس کو لوگوں نے دیکھ لیا شور مچایا۔ اس کو پکڑ لیا ہم نے پکڑا ہوا تھا کہ ایف ایس ایف والے ہمارے لوگوں کو دھمکا کے اسے لے گئے چنانچہ پتہ چلا کہ مسعود محمود نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگائی کہ اصغر خان جب ریلوے سٹیشن پر آئیں اور لوگ جمع ہوں تو یہ بم چلا دینا۔ اصغر خان پر چلانے کی تو ہمت پڑی نہیں۔ اس نے یہ کیا کہ ڈبے میں جا کے ایک غسل خانے میں رکھ کے اس کو چلانے کی کوشش کی۔ وہ چلا نہیں وہ آدمی بھاگا اس کو پکڑ لیا بم بھی پکڑا گیا۔

اس پر مجھے بڑا غصہ آیا میں نے کہا کہ یہاں ساری پولیس پریشان ہے رات کو ڈیوٹیاں لگائی ہوئی ہیں ادھر مسعود محمود اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ مجھے بدنام کیا جائے اس لیے کہ ذمہ داری تو پولیس کی ہوتی ہے۔ اگر بم چل جائے لوگ مر جائیں تو یہی کہا جائے گا کہ یہ آئی جی نکما ہے چنانچہ میں نے بھٹو صاحب سے وقت مانگا اور ان سے شکایت کی کہ اگر ایف ایس ایف بم چلائے گی تو پھر میں کیسے کنٹرول کر سکوں گا اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اگر اس مجمع میں بم چل جاتا اصغر خان اس سے مر سکتے تھے کچھ لوگ مر سکتے تھے آپ کے لیے اس کا کیا سیاسی فائدہ نکلتا۔ انہوں نے کہا کہ میں پوچھتا ہوں چنانچہ شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں استقبالیہ تھا بھٹو صاحب بھی آئے ہوئے تھے اتنے میں مسعود محمود اوپر بھٹو صاحب سے مل کے آیا ہاتھ میں اس کے شراب کا گلاس تھا آنکھیں اس کی غصے

میں سرخ تھیں کہنے لگا آپ نے میری شکایت کیوں کی میں نے کہا تم سے کس نے کہا کہ پنجاب میں اس طرح سے دہشت پھیلاؤ کہنے لگا میں تمہیں دیکھ لوں گا اور غصے میں آ کے شراب کا گلاس اس نے پورچ کے پلر پر دے مارا۔

ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب نے اس کو ڈانٹا ہوگا مجھے یہ نہیں پتہ کیا ان کی بات ہوئی لیکن بڑے غصے میں تھا اور میرے خلاف اس کی آنکھیں سرخ تھیں کہ تم نے میری شکایت کی۔ جب نیپ کے لوگ فرنٹیئر میں پکڑے گئے یہاں بھی بموں وغیرہ کا سلسلہ ختم ہوگیا تو میں نے سنا یہ کہ بلوچستان کے کچھ لڑکے لاہور کے وٹرنری کالج میں پڑھتے تھے ان میں شائد بسم اللہ کاکڑ یا اس قسم کا کوئی نام تھا اس نے وہ بم وہاں رکھا تھا۔

واپڈا ہاؤس کا بم اس نے رکھا تھا اس کے بعد بلوچستان میں بھی اس نے کچھ اس قسم کے واقعات کیے تھے پھر وہ افغانستان بھاگ گیا تھا بہر حال وہ مرحلہ بھی ختم ہوگیا۔

جس قسم کے پلاسٹک بم فرنٹیئر میں انہوں نے استعمال کیے بالکل وہی روسی نشان والا واپڈا ہاؤس میں استعمال ہوا اور جو چلا نہیں وہ بھی وہی تھا۔

نیپ کے خلاف یہ ہی کیس تھا کہ اجمل خٹک کابل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کو ٹرینڈ کرتا تھا۔ اور یہاں آ کے وہ بم چلاتے تھے۔ تو فرنٹیئر پولیس نے ان کا سارا نیٹ ورک ٹریس کر کے انکوئری پیش کی تھی۔ ملک کے خلاف سرگرمیوں کے قانون کے تحت نیپ پر جو پابندی لگائی تھی۔ اس کی یہی وجہ تھی۔ جب انہوں نے ان کا سارا نیٹ ورک پکڑ لیا۔ ان کے آدمی پکڑے گئے۔ یہاں بھی جو دھماکے تھے وہ بند ہوگئے۔

میرا خیال یہ تھا کہ اصغر خان کی آمد کے موقع پر بم مسعود محمود کی ایما پر رکھا گیا تھا وہ کسی کا دوست نہیں تھا۔ ہر ایک کی ٹانگ کھینچتا رہا۔ ہر ایک کی چغلیاں پرائم منسٹر سے کرتا رہا یہ بھی اس کی کوشش تھی اور بڑی خواہش تھی کہ پنجاب کا آئی جی بنے۔ ایف ایس ایف کی کیا جاب تھی۔ سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہوا بنایا ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ راؤ رشید کا نام بدنام کیا جائے۔ اور یہ ظاہر کیا جائے کہ اس کا کنٹرول کوئی نہیں ہے۔

مسعود محمود بڑا ڈرامے باز آدمی تھا۔ عجیب عجیب اس کی حرکتیں ہوتی تھیں۔ بچوں کا سا ناپختہ ذہن بہت گھٹیا ذہن کا انسان تھا۔ مثلاً جو بات کرتا تھا اس میں پانچ دفعہ پرائم منسٹر کا لفظ ضرور استعمال کرتا تھا۔ لگتا ایسا تھا کہ وہ پیشاب کرنے بھی جاتا ہے تو بھٹو صاحب کو فون پر پوچھ لیتا ہے۔ جی میں پیشاب کر آؤں۔ فضول سی باتیں کرتا تھا۔ مثلاً بھٹو صاحب لاہور آئے ہیں۔ یہ بھی لاہور پہنچ جائے گا۔ آتے ہی

ان کے اے ڈی سی کو فون کر دے گا کہ میں لاہور پہنچ گیا ہوں۔ پرائم منسٹر صاحب کو ضرورت ہو تو یہ میرا فون ہے۔اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا ہے۔ جو بھی ملنے آیا یا جس کو بھی وہ فون کر رہا ہے۔اس کو کہتا........

''آپ کو پتہ ہے کہ میں پرائم منسٹر صاحب کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔'' ایک صاحب نے مجھے بتایا پنجاب کلب میں دروازے کے سامنے کھانے کی میز کرسی پر اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ جو بھی وہاں آ رہا ہے۔اس کو وہ بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے 007 ہوتا کہ لوگ یہ سمجھیں یہ ڈیوٹی پر ہے۔ ہر کسی پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا کرے گا اس قسم کی وہ حرکتیں کرتا تھا۔اس طرح اس نے لوگوں کے دلوں میں اپنے متعلق ڈر خوف پیدا کیا ہوا تھا۔

گورنمنٹ سروس میں ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ وزیراعظم کے بڑا قریب رہے چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو وہ ضرور وہاں موجود ہوگا۔ بھٹو صاحب جہاں بھی جاتے تھے دو شخص وہاں ضرور ہوتے تھے ایک مسعود محمود دوسرے شیخ اکرم۔ میں سوچا کرتا تھا۔ یہ اپنا کام کس وقت کرتے ہیں۔لیکن ان کے نقطۂ نگاہ سے کام اتنا اہم نہیں تھا۔ جو چیز اہم تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں کو پتہ رہے کہ یہ بھٹو صاحب کے مصاحب ہیں اور یہ کہ ان کے بغیر بھٹو صاحب کا گزارا نہیں ہوتا۔ جلسے کے لیے بھٹو صاحب نے کہیں جانا ہوتا تو وہ ہیلی کاپٹر سے پہنچتے تھے۔ یہ دونوں ہوائی جہاز سے پہنچتے تھے جہاں بھٹو صاحب ٹھہرتے تھے۔ وہاں تک لوگوں کو کاروں میں بیٹھ کے جانا پڑتا تھا۔ ایک تو سیکورٹی کی کار ہوتی ہے مثلاً پہلے ایک موٹر سائیکل والا پھر ایک جیپ، پھر وی آئی پی کی کار اس کے بعد ان کی حفاظت کے لیے جو سٹاف ہے' وردی والا' بغیر وردی کے، پھر ان دونوں کی آپس میں دوڑ ہوتی تھی کس کی کار آگے ہو اس پر بھی بڑا جھگڑا ہوتا تھا ' دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ وزیراعظم کی کار کے فوراً پیچھے اس کی کار ہو۔ اگر ادھر ادھر ہوگئی تو اس کو محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے عہدے میں فرق پڑ گیا ہے یہ درباریت تھی۔ ہماری مشرقی ذہنیت کی باتیں ہیں چونکہ میں آئی جی تھا، پرائم منسٹر کی سیکورٹی میرا کام تھا۔ یہ میرا فرض تھا مسعود محمود صاحب کا تو اس میں کوئی کام نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا ہوا تھا کہ کسی طرح ان کی گاڑی پرائم منسٹر کے پیچھے ہو۔ ذرا دیر ہوگئی تو پھر ڈرائیور کو ماں بہن کی گالیاں سناتا تھا' ظاہر ہے آئی جی تو میں تھا سارا عملہ تو میرے ماتحت تھا تو وہ اس کی کار کو روک لیتے تھے حالانکہ میں نے ہدایت تو نہیں دی تھی۔

مسعود محمود کو اس بات پر بڑا غصہ آتا تھا۔ چنانچہ میں اس کشمکش کو دیکھ کے ہنستا تھا کہ کس طرح ان کی کاریں کہاں کہاں پوزیشن لیتی ہیں۔

بڑی مضحکہ خیز سچوایشن تھی۔ شیخ اکرم بجائے اس کے اپنے دفتر میں بیٹھ کے ٹھوس کام کرے

سارا دن سڑکوں پر گرد کھاتا رہتا تھا لیکن اس کے نقطہ نظر سے یہی چیز امپارٹنٹ تھی۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی ایسی جگہ کھڑے ہوں جہاں بھٹو صاحب کو نظر آ سکیں۔ مثلاً ائر پورٹ پر جس طرف سے بھٹو صاحب اتر رہے ہوتے وہیں ان کے سامنے شیخ اکرم پوزیشن لے لیتے تھے۔ اسی طرح اگر بھٹو صاحب اسمبلی میں ہیں شیخ اکرم کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ ایسی جگہ کھڑا ہو کہ بھٹو صاحب کی نظر اس پر پڑے کہ یہ وہاں کھڑا ہوا ہے۔ اس طرح سے مسعود محمود کی خاص جگہ ہوتی تھی کہ اس کا بھی فوراً بھٹو صاحب کو پتہ رہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس سے وفاداری ظاہر ہوتی ہے۔ کہ یہ ان کے آرام کے لیے ان کی حفاظت کے لیے کتنے پریشان ہیں اور اپنا آرام چھوڑ کے آ گئے ہیں۔ اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتے تھے۔ اس قسم کی گھٹیا ذہنیت کا اظہار ہمارے آفیسرز کرتے ہی رہتے ہیں۔

مجھے خیال آیا کہ شاید بھٹو صاحب کی ہدایات ہوں کہ یہ میرے ساتھ ساتھ رہا کریں۔ مجھے اس قسم کی گھٹیا دوڑ سے ہمیشہ کوفت رہی ہے۔ میں نے ایسی دوڑ میں طبعاً کبھی حصہ نہیں لیا مثلاً مجھے یاد ہے شروع میں جب میں اے ایس پی تھا۔ ہمارے آئی جی کیمبل پور دورے پر آئے ڈی سی نے ان کا کھانا کیا۔ مجھے بھی انہوں نے بلایا ہوا تھا۔ آئی جی ایس این عالم مرحوم ہمارے بہت ہی اچھے آئی جی تھے۔ جب ہم لوگ باہر نکلے ایس پی ان کے ساتھ تھے۔ آئی جی کی کار ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ پولیس کا پروٹوکول زیادہ ہی سخت ہوتا ہے کہ آئی جی کے نکلنے سے پہلے کار پوزیشن میں ہو۔ دروازہ کھلا ہوا ہو۔ بہرحال بیچارے ڈرائیور کو پتہ نہیں چلا کہ وہ نکلنے والے ہیں۔ ایس پی نے صورت حال دیکھی، تو وہ کار لانے کے لیے خود بھاگ کر گیا حالانکہ کافی عمر کا تھا۔ بھاری جسم کا تھا وہ جا کے کار لایا، باقی سب چلے گئے تو اس نے مجھ سے کہا۔ راؤ صاحب آپ نئے نئے آئے ہیں آپ کو تو طور طریقوں کا پتہ ہونا چاہیے۔ آپ کو ان کی کار لانے کے لیے بھاگ کر جانا چاہیے تھا۔ بہرحال میں نے ان سنی کر دی۔ ان کا مشورہ میں نے اس وقت بھی اور آئندہ کے لیے بھی کبھی پلے نہ باندھا۔ میں نے عزت نفس کے خلاف کبھی کام نہیں کیا۔

جب شیخ اکرم کی جگہ مجھے لگایا گیا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو تو میں نے بھٹو صاحب سے یہی پہلا سوال کیا، کہ آپ نے مجھے لگایا ہے ذرا یہ فرمائیں کہ جب آپ دورے پر جاتے ہیں آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے۔ اگر مجھے ضرورت ہوگی میں تمہیں بلا لوں گا۔ اگر تمہیں کوئی ضرورت ہو تو تم مجھ سے آ کے مل لینا لیکن میرے ساتھ ساتھ رہنا تو کوئی ضروری نہیں۔ نہ میں نے کسی کو کہا ہے۔ میں نے کہا مجھے یہ خیال اس لیے آیا ہے کہ پہلے جو تھے۔ شیخ اکرم وہ آپ کے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ایک منٹ کے لیے علیحدہ نہیں ہوتا تھا۔ مسکرائے اور کہا اس کا اپنا شوق ہوگا میں نے ان کو کبھی نہیں کہا چنانچہ یہ ہوا کہ میں ان کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ ان کے ساتھ نہیں جاتا تھا۔ نہ اسمبلی جاتا تھا۔

ایک دودن کے بعد مسعود محمود نے مجھے فون کیا کہ راؤ تمہیں دیکھا نہیں دو چار دن سے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا پرائم منسٹر صاحب وہاں بھی گئے تھے۔ پرائم منسٹر صاحب وہاں بھی گئے تھے میں نے کہا میں نے پوچھ لیا ہے وہ کہتے ہیں میرا ساتھ ساتھ رہنا کوئی ضروری نہیں ہے تو وہ اس بات سے شرمندہ سا ہوا اس لیے کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کو پتہ چل گیا ہے کہ جو سوانگ انہوں نے بنایا ہوا ہے وہ لوگوں کو خواہ مخواہ دھوکہ دینے کے لیے ہے۔

پنجاب سے میرا تبادلہ ہوا تو بھٹو صاحب نے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھے پنڈی لے جائیں گے کسی اور امپارٹنٹ پوسٹ پر لگائیں گے اس دوران میں مجھے پتہ لگا کہ وہ مجھے انٹیلی جینس بیورو کا ڈائریکٹر لگانا چاہتے ہیں اور انہوں نے ہمارے چیف سیکرٹری سے بھی پوچھا کہ کیسا رہے گا وقار سے بھی پوچھا تو ڈائریکٹر اس وقت شیخ اکرم تھے اور شیخ اکرم جو تھے ان کی اپنی ایک ریپوٹیشن تھی ہمارے ساتھیوں میں سے ہیں سب جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی محنت نہیں کی میں ان کے متعلق کچھ کہنا تو نہیں چاہتا لیکن ضروری بھی ہے جب وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے تو ان کے متعلق مشہور یہ تھا کہ وہ کسی فائل پر دستخط کرنا بھی اپنے لیے بڑا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے میں نے ٹرائی کیا میں وہاں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا وہ بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے ایک فائل میں نے بھیجی اس پہ نوٹ لکھ کے کہ اس کا تعلق آپ سے ہے آپ مہربانی کر کے ذرا اس کو دیکھ کے بتائیں کیا کرنا چاہیے دوسرے دن وہ فائل بغیر دیکھے ہوئے واپس آ گئی اس پر صرف چڑی ماری ہوئی تھی۔ میں نے دوبارہ ان کو لکھا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی نوٹ میں لکھا تھا کہ یہ آپ سے متعلق فائل ہے آپ نے بغیر کسی کارروائی کے واپس کر دی مہربانی کر کے پھر دیکھیں کہ اس میں کیا کرنا ہے اور آپ اس کو ڈیل کریں۔ لیکن انہوں نے چڑی ماری اور فائل مجھے واپس بھیج دی۔

ہم سب ان کو دلہا میاں کہا کرتے تھے شریف آدمی تھے وہ ڈائریکٹر بھی بڑے عجیب حالات میں بنے تھے ہوا یہ تھا کہ جب بھٹو صاحب نے 71ء میں حکومت سنبھالی جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ شکایت ملی کہ انٹیلی جینس بیورو کا ریکارڈ جلایا جا رہا ہے بھٹو صاحب نے فوری کارروائی کر کے سارے دفتر بند کرا دیئے اس کے بعد انہوں نے میاں انور علی صاحب کو آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی (او ایس ڈی) مقرر کر کے انٹیلی جینس بیورو کا انچارج لگا دیا۔

میاں صاحب کافی بوڑھے ہو چکے تھے' بھٹو صاحب دیکھتے رہے کہ کس کو ڈائریکٹر لگایا جائے اچانک پتہ چلا کہ شیخ اکرم ایڈیشنل ڈائریکٹر ہو کے آ گئے ہیں کچھ عرصے بعد یہ میاں صاحب سے چارج لے لیں گے۔ ہمارے لیے یہ خبر بڑی تعجب خیز تھی اس لیے کہ شیخ اکرم کبھی بھی پولیس کے کامیاب آفیسر

نہیں رہے بس مرنجاں مرنج آدمی تھے اور ہم یہ سوچتے رہے کہ یہ کس کی سفارش سے آئے ہیں۔ ضرور کسی نے ان کی سفارش کی ہوگی ورنہ بھٹو صاحب تو ان سے واقف نہیں تھے بھٹو صاحب کو قائل (کونس) کیا گیا کہ یہ آپ کا بڑا وفادار رہے گا۔ کس نے ان کی سفارش کی۔

کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ یہ حسنہ کی سفارش تھی جس کا بھٹو صاحب پر بہت اثر تھا۔ بہر حال جب شیخ اکرم صاحب آئے میں بھی انٹیلی جینس میں تھا اور مجھے پتہ تھا کہ انہوں نے ڈائریکٹر لگنا ہے اور یہ بھی کہ انہیں کام سے کوئی واقفیت نہیں۔ بہر حال میاں انور علی صاحب چونکہ عارضی عرصے کے لیے آئے تھے وہ بیمار بھی ہو گئے ان کا آپریشن وغیرہ بھی ہوا' ان کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا تو شیخ اکرم نے ان کی جگہ لی شیخ اکرم صاحب اپنی قسم کے آدمی ہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ بہت شریف آدمی ہیں' ان کا ذہن سازشی نہیں ہے پتہ نہیں ان کو میرے متعلق یہ خطرہ کیسے ہوا کہ میں ان کی جگہ لوں گا پانچ سال وہ ڈائریکٹر رہے میرا خیال ہے انہوں نے کوئی کام نہیں کیا سوائے اس کے کہ راؤ رشید کا راستہ روکا جائے تو پھر انہوں نے بھٹو صاحب تک میرے متعلق ہر جائز ناجائز شکایت کی میرے پیچھے انٹیلی جینس لگائے رکھی انہوں نے ہر کوشش کی کہ کسی طرح سے مجھے ڈس کریڈٹ اور ناکام و بدنام کریں۔ آپ اس کا اندازہ اس سے لگالیں کہ جب احمدیوں کو اقلیت قرار دیا گیا تو فہرستیں بنیں کہ کون کون افسر احمدی ہے تا کہ انہیں کلیدی اسامیوں سے ہٹایا جا سکے۔ اس لیے کہ مذہبی جماعتوں کا اصرار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا چنانچہ میرے متعلق بھی انکوائری شروع ہوئی کہ یہ بھی احمدی ہے۔

حبیب الرحمٰن یہاں انٹیلی جینس کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے وہ انکوائری ان کے سپرد ہوئی کہ ساہی وال سے انکوائری کی جائے شیخ اکرم صاحب بڑے خواہشمند تھے کہ کسی نہ کسی صورت مجھے احمدی بنا دیں تا کہ میں انٹیلی جینس بیورو میں نہ لگ سکوں چنانچہ انکوائری ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو احمدی نہیں۔ پھر شیخ اکرم صاحب کا اصرار تھا کہ اس کے سسرال احمدی ہوں گے' ان کی بیوی احمدی ہو گی اس لیے کہ میرے سسر مرحوم کا نام تھا نذیر احمد خاں۔ احمد ان کے نام کا حصہ تھا اس لیے انہوں نے کہا یہ ضروری احمدی ہیں۔ بہر حال وہاں انکوائری وغیرہ ہوئی ثابت ہوا کہ وہ بھی احمدی نہیں رپورٹ وہاں گئی کہ نہ یہ احمدی ہے نہ اس کا کوئی رشتے دار احمدی ہے بہر حال جب میں پرائم منسٹر ہاؤس پہنچا وہاں اور بھی چھان بین ہو رہی تھی کہ پرائم منسٹر ہاؤس میں کون کون احمدی ہیں میں نے شیخ اکرم صاحب کی وہ فائل منگوائی تو اس میں دیکھا کہ شیخ اکرم صاحب نے انکوائری کے برعکس اور بغیر کسی بنیاد کے اس فہرست میں میرا نام اپنے ہاتھ سے شامل کر دیا ہوا تھا مجھے بڑی ہنسی آئی۔ کہ وہ اس حد تک مجھ سے خوفزدہ تھے۔

❖

پروموشن

فروری 73ء میں میری پروموشن ہوگئی اور میں ایس پی ای کا آئی جی لگا۔ میری وقار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا بھٹو صاحب آپ سے ناراض تھے۔ میں نے آپ کا کیس پیش کیا کیونکہ آپ کا نمبر تھا تو بھٹو صاحب نے کہا "یہ آدمی کیسا ہے؟ انگلینڈ میں تو میرے خلاف رپورٹیں بھیجتا تھا اور سنا ہے کہ راؤ خورشید کا رشتے دار بھی ہے" وہ بھی اس وقت معتوب تھے حالانکہ بھٹو صاحب کی پارٹی کے تھے لیکن انہوں نے اپوزیشن کا سلسلہ شروع کر لیا تھا۔ وقار صاحب کہتے ہیں میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اس کا ریکارڈ تو بالکل اچھا ہے۔ اس کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایک سرکاری افسر کا سیاست سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے پروموٹ کر دیا۔

اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بھٹو صاحب کے دل میں کینہ نہیں تھا۔ اگر کینہ ہوتا تو وہ مجھے پروموٹ نہ کرتے لیکن یہ ضرور ہے کہ میرے متعلق ان کو غلط فہمی تھی یا جو کچھ بھی تھا یعنی کہ میں ان کا ہمدرد نہیں تھا یا یہ کہ میں ان کا سپورٹر نہیں تھا یا ہو سکتا ہے ان کو خیال آیا ہو کہ اس کا جو فرض تھا اس نے ادا کیا لیکن ہمارے ملک میں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارا تو اصول یہ ہے کہ جو آپ کے ساتھ نہیں وہ آپ کے خلاف ہے نیوٹرل ہونا یہاں کوئی چیز نہیں۔

میں وہاں ایک سال تک ایس پی ای میں رہا۔ جس طرح ہمارے ملک میں ہوتا ہے کہ جب کوئی پروموشن دی جائے تو اس کا شکریہ ادا کریں کہ جناب آپ نے بڑی مہربانی کی میں نے کوئی اس قسم کی کوشش نہیں کی کہ بھٹو صاحب سے ملوں البتہ اس دوران میں سہالہ میں پولیس ویک ہوا اس کے ڈنر پر بھٹو صاحب بطور صدر چیف گیسٹ تھے۔ آئی جی صاحبزادہ رؤف علی نے کچھ الفاظ کہے اور خواہش کی کہ آپ بھی کچھ فرمائیں تو بھٹو صاحب کھڑے ہو گئے اس وقت وہ بڑے فارم میں تھے خوشگوار موڈ میں تھے انہوں نے کہا اس وقت آپ لوگ بیٹھے ہیں مجھے کئی بڑی پرانی رفاقتیں یاد آ رہی ہیں۔ مثلاً یہاں میرا دوست بیٹھا

ہے راؤ رشید جب یہ انگلینڈ میں تھا تو بالکل سائے کی طرح میرے پیچھے ہوتا تھا۔ وہاں اس نے میری بڑی نگرانی کی۔"

اس طرح سے اور جو جاننے والے پولیس افسر تھے ان میں ایک حسن مصطفیٰ تھا اس کے متعلق بھٹو صاحب نے ہنس کے کہا جب میں انتخابی مہم چلا رہا تھا تو ایک دفعہ اس نے میرے ساتھ کراچی سے لاہور تک سفر کیا اور مجھے بتاتا رہا کہ آپ کو یہ کرنا چاہیے آپ کو یہ کرنا چاہیے۔ یہ مجھے سیاست کا سبق دیتا رہا۔ جب میں سب کچھ سن چکا تو میں نے کہا، مصطفیٰ تم ہر چیز کے ماہر ہو سوائے اپنے کام کے۔

اس طرح سے انہوں نے بڑی ہلکی پھلکی تقریر کی اور بڑا شگفتہ ماحول بن گیا۔

جب ملتان کا دورہ ختم ہوا تو بھٹو صاحب صادق حسین قریشی کے وائٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں انہوں نے کھانے پر چیف سیکرٹری کو، ملتان اور بہاولپور کے کمشنرز کو، ملتان کے ڈی آئی جی کو اور مجھے بلایا ہوا تھا۔ کھانے کی میز پر بھٹو صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کسی نے اس قسم کی بات کر دی میرا خیال ہے کمشنر بہاولپور رائے کے خالد نے بڑا احسان جتانے کی کوشش کی کہ جب آپ اقتدار میں نہیں تھے تو مجھے آپ کے خلاف یہ کچھ کرنے کو کہا گیا تھا لیکن میں نے نہیں کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کی چھوٹی ذہنیت ہوتی ہے۔ احسان جتانے کی بھٹو صاحب بڑے حساس تھے۔ انہوں نے کہا ہاں اب تو ہر آدمی مجھ پر احسان کرتا ہے لیکن مجھے پتہ ہے کہ لوگوں نے میرے ساتھ کیا کچھ کیا یہ آپ کے سامنے صادق قریشی بیٹھا ہوا ہے اس کے گھر میں کھانا کھا رہا ہوں یہ میری خاطر مدارت کر رہا ہے میں نے اس کو گورنر لگایا ہوا ہے لیکن موسیٰ خان کے پاس یہ بھی سینے پر ہاتھ مار کے کہہ آیا تھا" جی میں عاشق حسین دا پتر نہ ہوواں اگر بھٹو ایس دفعہ ملتان توں خیر خیریت نال واپس چلا جاوے"۔ اور پھر اس نے مجھ پر فائرنگ کرائی۔

ملتان کے راستے ایک سٹیشن ہے۔ وہاں ریل کا ہیر پھیر ہے۔ صادق قریشی نے گیٹ بند کرا کے بھٹو صاحب کی کار پر فائرنگ کرائی تھی۔ رضی گردیزی ملتان کا بدنام سیاستدان ہے۔ صادق حسین قریشی کا بڑا چمچہ ہے۔ اس نے یہ ارینج کیا تھا بھٹو صاحب کو پتہ تھا بھٹو صاحب نے کہا میں اس کی میز پر بیٹھا ہوں اس کا کھانا کھا رہا ہوں۔ میں نے اس کو گورنر لگایا ہوا ہے لیکن مجھے پتہ ہے کہ اس نے مجھ پر فائرنگ کرائی تھی مجھے مروانے کی کوشش کی تھی۔ اب صادق حسین قریشی کا بڑا برا حال ہوا۔ ایک تو ویسے ہی بیچارے کو لکنت۔ اپنے ہاتھ واتھ چلانے لگا۔ اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی کہنے لگا "نہیں سر یہ آپ کو......" بھٹو صاحب نے کہا یار چھوڑو، کیا صفائیاں دیتے ہو۔ کہنے لگا نہیں جناب آپ کو حامد رضا گیلانی نے بتایا ہوگا۔ وہ جب آئے گا میں اس کو آپ کے سامنے کروں گا۔ اس کو قسم اٹھواؤں گا۔ یہ بات نہیں ہوئی بھٹو صاحب نے کہا چھوڑو صادق بات گئی ختم ہو گئی۔

اس سے ایک آدمی کے حوصلے کا پتہ چلتا ہے کہ اس کو معلوم تھا کہ صادق حسین قریشی نے اس پر قاتلانہ حملہ کرایا ہے اس کے باوجود صادق حسین قریشی نے پارٹی جائن کی تو اس کو نہ صرف معاف کیا بلکہ پہلے اس کو وزیر بنایا پھر اس کو گورنر بنایا پھر اس کو چیف منسٹر بنایا یہ بات اس کے منہ پر کی۔ ہمارے سامنے کی۔

دورہ پنجاب کے دوران پیپلز پارٹی کے ورکروں کے ساتھ ملاقات اس دورے کا خاص حصہ تھی۔ بھٹو صاحب جہاں بھی جاتے ایک تو جلسہ عام ہوتا ایک کھلی کچہری لگتی جس میں سب لوگ، ہر تحصیل کے، یا اس علاقے کے آ کے اپنے اپنے علاقے کے مسائل بتاتے تھے پھر چیف منسٹران کا جواب دیتا تھا اور جو مطالبات اس قابل ہوتے بھٹو صاحب ان کو مان بھی لیتے تھے۔ چیف منسٹر کو حکم بھی دے دیتے تھے تو جتنے بھی محکموں کے سربراہ تھے وہ سب اس قسم کی میٹنگوں میں آیا کرتے تھے۔ اگر کسی بات کا چیف منسٹر کو پتہ نہیں ہوتا تھا تو وہ اس کا جواب دیتے تھے اسی طرح سے سنٹر کے محکموں کے بھی کچھ لوگ وہاں آیا کرتے تھے خاص طور سے جو پبلک ویلفیئر کے محکمے تھے۔ ایک طرح سے پوری گورنمنٹ بھٹو صاحب کے ساتھ ساتھ پورے پنجاب میں جگہ جگہ چل رہی تھی تو پیپلز پارٹی کے ورکرز کے ساتھ جو وہ سیشن رکھتے تھے اس میں کوئی سرکاری افسر نہیں جاتا تھا اس میں بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کے منسٹر اور ورکرز ہوتے تھے سب سے زیادہ شور وغل ان کے اس سیشن میں ہوا کرتا تھا وہ اس لیے کہ پیپلز پارٹی کے ورکر ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے اس نے یہ کھالیا اس نے یہ کرلیا ایک دوسرے کے شکوے شکایت کرتے تھے۔ بھٹو صاحب سگار پیتے رہتے تھے اور سنتے رہتے تھے۔ عام طور سے وہ مداخلت نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ ایک دوسرے کے گلے نہ پڑ جائیں اور اس میں ورکرز وزیروں کو بھی لعن طعن کرتے تھے تو یہ بھٹو صاحب کا سٹائل تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ لوگوں کی کیا سوچ ہے۔

دورہ پنجاب کے شروع کا ذکر ہے کہ بھٹو صاحب صادق آباد میں ورکرز کی اسی قسم کی ایک میٹنگ میں تھے کہ وہاں انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا اور اس سے کہا بھئی تم اتنا عرصہ کہاں رہے وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ جناب میں مصروف رہا یہ ہے وہ ہے بات ختم ہوگئی اسی روز شام کو کھانے پہ بیٹھے تھے انہوں نے کہا یاد ہے کہ ایک آدمی جسے میں نے کہا تھا کہ کہاں اتنے عرصہ رہے پتہ ہے کون تھا ہم نے کہا جی ہمیں تو پتہ نہیں کہنے لگے کہ سکھر میں ایک خانہ بدوش قوم ہے کوئی نام بھی اس کا لیا اس کا یہ آدمی تھا اور اس سے یوں واقفیت ہے کہ کہ جب 64ء کے آخر میں ایوب خان کے الیکشن تھے تو اس قوم کے کافی بی ڈی ممبر بن گئے۔ تیس پینتیس اور یہ سارے لوگ فاطمہ جناح کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ ایوب خان نے ایک میٹنگ بلائی ہوئی تھی شاید کراچی آئے ہوئے تھے نواب کالا باغ بھی تھے وہاں الیکشن کے

متعلق باتیں ہو رہی تھیں کالا باغ نے شرارتاً کہا کہ جی فلاں جو لوگ ہیں سنا ہے آپ کے بڑے خلاف ہیں۔ بھٹو صاحب سے کہیں نا، کہ ان کو قابو کریں۔ بھٹو صاحب کہتے ہیں میں سمجھ گیا کہ کالا باغ نے میری ٹانگ کھینچی ہے۔ ایوب خان نے کہا ہاں زلفی کیا بات ہے کون لوگ ہیں وہ میں نے کہا کوئی بات نہیں، میں دیکھوں گا وہ آپ کو ووٹ دیں گے چنانچہ میں لاڑکانہ آیا میں نے ان سب کو وہاں بلایا تو یہ ان کا لیڈر تھا۔ چرب زبان بھی تھا اس کو میں نے کہا کیا بات ہے۔ تم لوگ ہم سے کیوں ناراض ہو تو اس نے جواب دیا سائیں ہم آپ سے کیسے ناراض ہو سکتے ہیں جیسے آپ حکم دیں گے پھر اس نے مجھے علیحدگی میں کہا یہ کمی لوگ ہیں پیسے کے لیے مرتے ہیں آپ ایسا کریں کہ ان کو اپنے پاس ہی یہاں رکھیں ان کو کھانے پینے کو دیں ووٹ میں دلوا دوں گا میں نے کہا ٹھیک ہے منشی سے میں نے کہہ دیا کہ ان کے رہنے کا انتظام کرو۔ یہ لوگ الیکشن تک یہیں رہیں گے وہ اس قسم کے لوگ تھے ان کو ٹھرے وٹے کی عادت تھی ان کے کھانے پینے کا، مرغ کا بکروں کا انتظام ہو گیا۔ جب الیکشن نزدیک آ گئے تو سنا کہ ان میں سے سات آٹھ آدمی غائب ہو گئے ہیں۔ بھاگ گئے ہیں میں نے اس کو بلایا میں نے کہا کیا قصہ ہے وہ لوگ کدھر چلے گئے کہنے لگا جناب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ نمک حرام لوگ ہیں آپ کا نمک کھایا بھاگ گئے ہیں کوئی بات نہیں ہم لوگ تو ہیں میں نے کہا ٹھیک ہے پھر چند روز بعد اطلاع آئی کہ اور بھی کچھ لوگ بھاگ گئے ہیں اس نے کہا کہ میں نے ان بدبختوں کو بڑا منع کیا لیکن چوری چھپے بھاگ گئے ہیں کوئی بات نہیں آدھے تو ہیں اس طرح سے آہستہ آہستہ یہ اکیلا رہ گیا جب ووٹنگ کا دن آیا تو یہ اکیلا تھا۔ میں نے کہا بیوقوف کے بچے اتنا پیسہ میرا خرچ کرایا اور تیرے قابو میں کوئی نہیں آیا کہنے لگا کیا کرتا سائیں بڑا روکا ان کو لیکن وہ نہیں رکے میں تو ہوں میں نے کہا تمہارا میں کیا کروں تم بھی اگر چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ لہٰذا یہ بھی وہاں سے بھاگ گیا۔'' کہنے لگے اس دن کے بعد یعنی 64ء کے بعد آج (74ء) میں نے پہلی بار اس کو دیکھا ہے۔

اس سے آپ اس بات کا اندازہ کریں کہ بھٹو صاحب نے اس کو ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں دیکھتے ہی پہچان لیا اور ان کو اس کا سارا قصہ بھی یاد تھا۔ اب کچھ شخصیات کا ذکر ہو جائے۔

جب بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تو چودھری ظہور الٰہی نے ان کے قریب آنے کی بڑی کوشش کی۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ جولائی 1972ء شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے روانگی کے وقت لاہور ائرپورٹ پر چودھری ظہور الٰہی مسٹر بھٹو (تب صدر پاکستان) کو الوداع کہنے آئے۔

ان کو دعوت دی کہ میری لڑکی کی شادی پر تشریف لائیں اور کہا کہ میری لڑکیاں تو آپ کی بہت مداح ہیں۔ ان کے کمروں میں آپ کی تصویر لگی ہوئی ہے اور صبح صبح وہ ان کو پھولوں کے ہار پہناتی ہیں۔

اس پہ بھٹو صاحب نے کہا میں ضرور آؤں گا لیکن جیسے پنجاب کا ماحول ہے کچھ لوگوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ ظہور الٰہی کے گھر اگر چلے گئے تو ظہور الٰہی اس قسم کا آدمی ہے تو جس طرح ایوب خان کے زمانے میں ہوا کہ اس کو انتہائی خوشامد سے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ خاص طور سے کھر کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس طرح سے اس قسم کا کوئی قصہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ آپ شادی اٹنڈ نہ کریں۔ ظہور الٰہی نے بھٹو صاحب کے استقبال کے لیے بہت انتظامات کیے ہوئے تھے۔ پانچ میل تک اس نے گھوڑ سوار راستے پر کھڑے کیے ہوئے تھے پگڑیاں لاچے۔ پنجاب کا لباس پہنے ہوئے اتنا انتظام کیا ہوا تھا آخر وقت میں اس کو اطلاع ملی کہ بھٹو صاحب نہیں آرہے ظاہر ہے کہ اس کو بڑا سخت صدمہ ہوا اور اس کے بعد یہ پھر بھٹو صاحب کے خلاف ہو گئے۔

ایوب خان کے زمانے میں میں نے سنا ہے کہ ظہور الٰہی کا ایک رشتے دار فوج میں تھا۔ اس سے یہ ٹریننگ بھی لیتے رہے کہ گورنر کس طرح سے چلتا ہے اس کے پیچھے اے ڈی سی کس طرح سے چلتا ہے کیونکہ ایوب خان نے انہیں تاثر دے دیا کہ تمہیں گورنر بنائیں گے پھر انہوں نے ٹریننگ لینا شروع کر دی۔

مجھے بہاء الحق ذکریا کے گدی نشین مخدوم سجاد حسین نے بتایا کہ جب ان کی شادی ہوئی۔ غالباً 46/47ء کا ذکر ہے وہ برات لے کے گئے تو ظہور الٰہی کی ڈیوٹی ان کی کوٹھی کے سامنے تھی۔ یہ ٹریفک پولیس میں تھے۔

یہ بات ان کی تعریف میں جاتی ہے کہ انہوں نے پولیس کے باہر بڑی ترقی کی لیکن اس ملک میں بغیر ہیرا پھیری کے آپ دولت اکٹھی نہیں کر سکتے سیدھے سادھے راستے سے دولت اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

شورش کے بھٹو صاحب کے ساتھ اچھے خاصے تعلقات تھے بلکہ بھٹو صاحب ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر بھی گئے بھٹو صاحب جب بھی لاہور آتے تھے شورش ہمیشہ بھٹو صاحب سے آ کے ملتے تھے مشورے بھی دیتے تھے شورش بھٹو صاحب کے مداح بھی تھے ان کے خلاف نہیں تھے حالانکہ ان کا سارا حلقہ بھٹو صاحب کے خلاف تھا لیکن شورش ذاتی طور سے بھٹو صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے کہ بھٹو صاحب پرائم منسٹر ہو کے میرے گھر آئے پرانے لوگ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ انہوں نے کبھی کسی Anti Bhutto تحریک میں حصہ نہیں لیا۔

جب میں آئی جی ہو کے آیا۔ شورش صاحب سے میری واقفیت نہیں تھی ایک روز یہ اچانک میرے گھر پر مجھے ملنے کے لیے آ گئے میں بڑا حیران ہوا۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ

بڑے اکھڑ آدمی ہیں سرکاری افسروں سے نہیں ملتے میں نے آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا میں پہلی دفعہ کسی آئی جی کے گھر آیا ہوں آپ کے ایک آرڈر نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں آپ سے آ کے ملوں۔ دیکھوں آپ ہیں کیا۔ وہ یہ کہ آپ نے حکم دیا ہے کہ پولیس کلب میں شراب نہیں چلے گی۔ میں نے کہا میں نے یہ حکم اس لیے دیا ہے کہ کوئی سرکاری افسر اپنی تنخواہ میں سے شراب نہیں پی سکتا اور جو پیتے ہیں ظاہر ہے ان کو کوئی تھانیدار بوتل لا کے دیتا ہے، کوئی سارجنٹ ان کو بوتل لا کے دیتا ہے لہٰذا یہ کرپشن کا ایک ذریعہ ہے جس میں شک وشبے کی گوئی گنجائش نہیں اس لیے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی لائی ہوئی، شراب رشوت کے طور سے پیتے ہیں اس لیے میں نے اسے بند کر دیا ہے کہنے لگے وجہ جو کچھ بھی ہو۔ لیکن اس سے پہلے آج تک کسی آئی جی نے اس قسم کا حکم جاری نہیں کیا اور جب میں نے سنا تو میں بڑا حیران ہوا میں نے کہا میں ضرور آپ سے جا کے ملوں گا۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آتے رہے۔

❖

الیکشن 1977ء

میں نے محسوس کیا کہ معمولی سے معمولی تفصیل بھی بھٹو صاحب کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی پھرانہوں نے الیکشن کی ہر طرح سے تیاری کی۔ اتنی تیاری کی کہ جس طرح ہر چیز کی زیادتی بُری ہوتی ہے اصل میں وہ تیاری ان کے خلاف گئی وہ اس طرح کہ جب انسان ایک چیز کی بہت مین میخ نکالتا ہے تو ذہن کنفیوژ ہو جاتا ہے ایک بڑی سطح پر رہ کے پورے جنگل کو دیکھنا چاہیے۔ درختوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے اسی وجہ سے گڑ بڑ ہوئی کہ وہ بے حد تفصیل میں چلے گئے اتنی زیادہ تفصیل میں چلے گئے کہ اس کا سیاسی پہلوان کی نظروں سے ایک طرح سے اوجھل ہو گیا۔

1976ء میں حالات ایسے تھے کہ سیاسی پارٹیاں تتر بتر تھیں کوئی دوسرا سیاسی لیڈر افق پہ نہیں ابھرا تھا اس وقت بھٹو صاحب کے لیے میدان بالکل صاف نظر آتا تھا وہ صرف بھٹو صاحب کو نظر نہیں آتا تھا صرف افسران کو نظر نہیں آتا تھا بلکہ عوام کو نظر آتا تھا اس لیے کہ آپ نے اس زمانے میں دیکھا ہوگا کہ جو بڑا آدمی تھا جو ملک یا چودھری تھا وہ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہا تھا تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عوام بھٹو کے خلاف ہو گئے اور وہ تو الیکشن جیت ہی نہیں سکتا تھا یہ ان لوگوں کا غلط الزام ہے اس طرح سے کہ آخر جو لوگ الیکشن لڑنا چاہتے تھے جن کے ہاتھ پبلک کی نبض پہ تھے جو ملک اور جو چودھری یا جو اپنے اپنے علاقوں کے لیڈر تھے ان کو پتہ تھا کہ ہوا کا کیا رخ ہے اگر انہیں پتہ ہوتا کہ جتنے بھی ملک چودھری اور وڈیرے تھے پانچ سال تک بھٹو کے ساتھ نہیں آئے چھٹے سال وہ آ کے بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے تو یہ ثبوت تھا کہ ہوا کا رخ واقعی بھٹو صاحب کی موافقت میں تھا اور ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ ان کی پارٹی الیکشن جیت جائے گی دوسری وجہ جو ان کی موافقت میں تھی وہ یہ کہ پیپلز پارٹی نے جو غریبوں کے لیے کیا اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہر غریب آدمی سمجھتا تھا کہ یہ اس کی پارٹی ہے خاص طور سے دیہات میں جو غریب تھے جو کاشت کار تھے جو زمین کے مزدور تھے وہ پیپلز پارٹی کو اپنی پارٹی سمجھتے تھے اور وہ بھٹو

صاحب کے ساتھ آخر وقت تک تھے اور رہے تو الیکشن ہارنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب الیکشن سر پہ آیا تو بھٹو صاحب نے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ہر حلقہ انتخاب سے مختلف ایجنسیوں سے نام منگوائے تھے ان آدمیوں میں جو بہتر اور مضبوط امیدوار تصور کیے جاسکتے تھے بیشمار آدمیوں کو جن کی ریپوٹیشن خراب ہو چکی تھی ان کو ٹکٹ نہیں ملا پنجاب سے۔ سندھ کی سیاست کو تو میں اس میں شامل نہیں کروں گا لیکن پنجاب میں بے شمار ایسے لوگ جن کی ریپوٹیشن خراب ہو چکی تھی ان کو پیپلز پارٹی کے دوبارہ ٹکٹ نہیں ملے تھے۔

مثلاً حامد یٰسین، چودھری عبدالواحد نارووال والے وغیرہ وغیرہ جن ایم پی اے اور ایم این اے کو دوبارہ ٹکٹ نہیں دیئے گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پولیس سے انٹیلی جنس سے رپورٹیں منگوائی تھیں کہ ان لوگوں کا کیا کردار رہا وہ سب رپورٹیں میرے پاس تھیں مجھ سے وہ پوچھتے تھے کہ بتاؤ اس کی کیا ریپوٹیشن ہے انٹیلی جنس ایجنسیاں کیا کہتی ہیں ان کو بتا دیا جاتا تھا کہ یہ اس کی ریپوٹیشن ہے یہ شرابی کبابی ہے اس نے پیسے بنائے ہیں اس نے کرپشن کی ہے تو کہتے ٹھیک ہے اس کو ٹکٹ نہیں ملے گا اور یوں ہر حلقہ انتخاب کے متعلق انہوں نے اپنی تسلی کی اور چھان بین کر کے لوگوں کو ٹکٹ دیئے تھے۔ کوئی سیاستدان الیکشن کے متعلق کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا بھٹو صاحب کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ الیکشن جیت جائیں گے اور وہ صحیح اعتماد تھا۔ یہ غلط بات ہے کہ بھٹو صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ پی این اے بننے والی ہے کوشش ان کی یہ تھی کہ اس کو جتنا بھی کمزور رکھا جاسکتا ہے رکھا جائے۔ بھٹو صاحب کی کوشش تھی کہ اصغر خاں کو صدارت نہ ملے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ جو اعتدال پسند عنصر ہے وہ اوپر آئے۔ کوئی انتہا پسند آدمی نہ آئے۔

میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم نے یہ کیسے بندوبست کیا یہ تو ایک ٹریڈ سیکرٹ ہے میں اس گورنمنٹ کی طرح بیوقوف تو نہیں ضیاء گورنمنٹ کی طرح کہ ساری سیکرٹ فائلیں وائٹ پیپر کے طور سے لوگوں کے سامنے رکھ دیں یہ ملک اور قوم کا نقصان ہے تھوڑے سے ذاتی فائدے کے لیے۔ جو جو کچھ پی این اے کی میٹنگوں میں ہوتا تھا ہمیں پتہ تھا کہ کیا کیا سکیمیں تھیں کس کس طرح ہم اس کا توڑ کرتے تھے بہر حال وہ ہر گورنمنٹ کرتی ہے ہم نے کوئی زیادہ کمال نہیں کیا۔

پی این اے نے ایک انتخابی نشان مانگا تھا ان کو قانونی طور سے ایک نشان نہیں مل سکتا تھا ہر ایک پارٹی کا اپنا نشان تھا۔ لیکن اس کے لیے بھٹو صاحب نے الیکشن لانچ کر کے ایک سمبل ان کو دے دیا میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھٹو صاحب کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا یہ انہوں نے اپنی خود اعتمادی میں اور بغیر کسی مشورے کے کیا۔ مثلاً ہر چیز میں وہ مشورہ کرتے تھے لیکن یہ آرڈیننس پاس کیا تو مجھے اس کا

پتہ نہیں تھا میں نے اخبار میں پڑھا کہ اس طرح سے PNA کو ایک انتخابی نشان دے دیا گیا ہے تو وہ ان کی خود اعتمادی کا ثبوت تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ حالانکہ فرق پڑا یہ سیاسی غلطی تھی جس کا انہیں بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اس سے فرق یہ پڑا کہ نو سیاسی پارٹیاں تھیں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ نشان ہوتا لہٰذا لوگ اس سے کنفیوژ ہوتے کہ شمع کو ووٹ دیں یا پھول کو دیں یا ہل کو ووٹ دیں ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف نو سمبل تھے اب بھٹو صاحب نے خود ایک سمبل تلوار کے مقابلے میں ہل کا سمبل انہیں دیا اس سے یہ ہوا کہ ساری اپوزیشن ان کے خلاف ہل تلے جمع ہو گئی۔

سیاسی طور سے یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی دوسرا یہ ہوا کہ جو پیسہ جو فنڈز پی این اے کو ملا۔ خیال نہیں تھا کہ اتنی امداد ان کو ملے گی اور ہمارے ملک یا غریب ملکوں میں اگر پیسہ ہو تو آپ بغیر کسی سپورٹ کے بھی اپنی راہ ہموار کر سکتے ہیں تیسری دنیا کے ملکوں میں جو پاپولر لیڈر ہیں ان کے خلاف کس طرح سے بغاوت ہوتی ہے۔ امریکہ کے پاس پیسہ ہے اس سے وہ موثر افراد کو بھی خرید سکتے ہیں اخبار نویسوں کو بھی خرید سکتے ہیں ملاں کو بھی خرید سکتے ہیں سٹوڈنٹس کو بھی خرید سکتے ہیں اور لیبر لیڈروں کو بھی خرید سکتے ہیں سوائے پیسے کے اور تو ان کے پاس کچھ نہیں چنانچہ جو پیسے کی ریل پیل پی این اے کے پاس ہوئی اس کا بھی بھٹو صاحب کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کو اتنے پیسے مل جائیں گے ظاہر ہے کہ جب سی آئی اے نے فیصلہ کیا کہ اس الیکشن میں بھٹو صاحب کو ہرایا جائے۔ پھر تو پیسے کی کمی کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

چونکہ اس وقت میں انٹیلی جینس میں نہیں تھا تو یہ ایکسرسائز میں نے نہیں کی کہ پیسہ آ رہا ہے یا نہیں آ رہا لیکن عام تاثر یہ تھا کہ پاکستان میں ڈالر کی قیمت بہت گر گئی ہے اس کی میں آپ کو اپنے تجربے سے مثال دوں گا کہ ایک دفعہ میں اسلام آباد سے لاہور جا رہا تھا تو وی آئی پی لاؤنج میں مجھے ایک صاحب مل گئے جو ریلوے میں بڑے سینئر افسر ہوتے تھے نام مجھے ان کا یاد نہیں آ رہا اچھا خاصا مشہور آدمی ہوتا تھا وہ میرا خیال ہے کہ یحییٰ خان کے زمانے میں سکرین آؤٹ ہوئے تھے پھر سعودی عریبیہ چلے گئے وہاں انہوں نے ملازمت اختیار کی۔ اتفاق سے وہ آئے ہوئے تھے اور مجھے وی آئی پی لاؤنج میں مل گئے انہوں نے مجھے کہا کہ میں نے بھٹو صاحب سے ملنے کی کوشش کی لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوئی ان تک آپ میری یہ بات پہنچا دیں کہ میں دہران (سعودی عرب) سے چلا۔ وہاں سے میں نے جو پیسے ایکسچینج کرنے تھے ان سے کہا کہ مجھے ڈالرز کے بدلے میں پاکستانی روپے چاہئیں۔ اس سعودی نے مجھے جواب دیا کہ آپ پاکستان میں ایکسچینج کر لیں اس لیے کہ وہاں ڈالر کی قیمت بڑی کم ہے آپ کو زیادہ پیسے مل جائیں گے وہ کہتا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ وہاں یہ کس طرح سے یہ ہوا وہ عربی کہتا ہے۔ الیکشن۔ الیکشن۔

پھر اس کے بعد PNA کے ایک دوسرے کے خلاف الزامات آتے رہے کہ اصغر خان نے اتنے روپے لیے تھے اس کا حساب کتاب نہیں دیا وغیرہ وغیرہ الزام تراشی رہی پھر یہ کہ نورانی اور غفور نے بے شمار نئی سوزوکیاں خریدیں۔ پھر تحریک کے دوران میں یہ لوگوں کے گھروں میں آٹا اور گھی اور سبزیاں پہنچاتے تھے اور اذان کے لیے لوگوں کو پیسے دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک و شبے کی بات نہیں ہے کہ جو اذانیں دیتے تھے باقاعدہ دس بارہ لوگ آجاتے تھے اور ان کو اس کے پیسے ملتے تھے۔

پیسے کا عنصر ایسا تھا جسے بھٹو صاحب اپنی پلاننگ کے دوران سوچ نہیں سکے کہ ان کے خلاف اتنی مالی امداد دینے والی طاقتوں کا اکٹھ ہو جائے گا لیکن اس کے باوجود وہ الیکشن ہر صورت میں جیت رہے تھے بھٹو کے دشمن بھی حتیٰ کہ خود ضیاء الحق نے مارشل لا لگانے کے بعد کہا تھا کہ الیکشن تو پیپلز پارٹی نے ہر صورت میں جیت رہی تھی اصل میں پی این اے کو بھی یہ خیال تھا کہ وہ الیکشن نہیں جیت سکتے۔ ان کی سٹریٹیجی یہ تھی اور سٹریٹیجی ان کی نہیں ان کے آقاؤں کی تھی کہ شروع سے ہی یہ کہا جائے کہ الیکشن میں دھاندلی ہوگی۔

اصغر خان اس حوالے سے سب سے زیادہ پیش پیش تھے میرا خیال ہے کہ وہی اس مہم کے انچارج بھی تھے تو انہوں نے دو طرف سے اٹیک کیا ایک تو یہ کہ بھٹو صاحب کی ذات پر حملے کیے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی شخصیت کے متعلق یا گورنمنٹ کا جو دبدبہ ہوتا ہے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ وہ لاڑکانے کا چوہا ہے۔ میں اس کو بل میں واپس بھیج دوں گا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ مجمع زیادہ بڑھ رہا ہے اور کوئی پابندی نہیں تو ان کے حوصلے اور بڑھے اور یہ کہہ دیا کہ میں اس کو کوہالہ کے پل پر پھانسی لگاؤں گا۔ مطلب یہ کہ پھانسی کا لفظ پہلی مرتبہ اصغر خان نے استعمال کیا اور یہ نہیں کہ انہوں نے اپنی کوئی بیوقوفی میں یا کسی ترنگ میں کہہ دیا یہ انہوں نے جان بوجھ کے ایک سازش کے تحت استعمال کیا اور یہ سازش تھی کہ بھٹو کو پھانسی دی جائے گی اور اس کی تاریخی مثال یہ ہے کہ اس قسم کی سٹریٹیجی ترکی کے عدنان مندریس کے خلاف استعمال کی گئی اگر ہم عدنان مندریس اور بھٹو صاحب کا ذرا موازنہ کریں تو بہت ساری چیزیں کامن نظر آئیں گی عدنان مندریس ترکی کے عوام میں مقبول تھا خاص طور سے دیہات میں اس کی مقبولیت تھی بالکل اسی طرح سے جس طرح کہ بھٹو صاحب کی مقبولیت تھی چونکہ وہ عوام کا ایک مقبول لیڈر تھا۔ اس لیے امریکہ کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ان کے قابو سے باہر نکل جائے گا اور اس کی کوشش بھی یہی تھی چنانچہ امریکہ اس بات کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا پاکستان تو پھر بھی ایک بیک یارڈ تھا ترکی تو نیٹو کا بڑا اہم ملک تھا اور روس کے خلاف امریکہ کا جو محاذ ہے اس کا بڑا اہم رکن چنانچہ عدنان مندریس کے خلاف بھی بالکل اسی قسم کی سازش ہوئی۔ الیکشن ہوا الیکشن

میں وہ دوبارہ کامیاب ہوا مگر اس کے خلاف دھاندلی کا الزام لگایا گیا اور فوج نے اس کا تختہ الٹا۔ صرف اس الزام پر کہ اس نے الیکشن میں دھاندلی کی ہے اس لیے قانونی طور سے یہ وزیراعظم نہیں رہا۔ وہی بات جو سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھٹو صاحب کے متعلق کہی کہ وہ قانونی اور اخلاقی طور سے وزیراعظم نہیں رہا۔

ترکی میں موومنٹ نہیں چلی تھی موومنٹ کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ وہاں کوئی پی این اے یا ان کے حواری نہیں تھے انہوں نے صرف فوج کو استعمال کیا۔

اور وہ فوری طور پر استعمال ہوگئی پھر اس پر دھاندلی کا مقدمہ چلایا گیا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی یہ جو پاکستان میں تحریک چلی تھی بعینہ انہی خطوط پر چلی تھی فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ان کو سیاسی لوگ مل گئے جو اس تحریک کو آگے ہوا دینے کے لیے تیار تھے چنانچہ اس زمانے کے اصغر خان کے بیانات اور باقی لیڈروں کے بیانات پڑھنے سے حقائق واضح ہو جاتے ہیں۔

اب اس کا کیا مطلب ہے کہ جمہوری نظام میں ہر کسی کو یہ کہنے کا اختیار ہے کہ اگر کوئی اور نتیجہ برآمد ہوا تو اس کو وہ نہیں مانیں گے یہ تو کوئی جمہوری طریقہ نہیں چنانچہ بھٹو صاحب کی ذات پر حملے کیے گئے۔ حکومت کا کچھ رعب کچھ دبدبہ ہوتا ہے اس کو نفسیاتی اعتبار سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ دھاندلی ہوگی اور اگر اس الیکشن کا کوئی اور نتیجہ ہوا تو ہم نہیں مانیں گے ہم پہلے ہی جیت گئے ہیں چنانچہ دھاندلی کے الزام کے لیے ایک سٹیج الیکشن سے پہلے ہی تیار کر لی گئی۔ اس میں بھٹو صاحب کی بھی کچھ غلطیاں تھیں جس کی وجہ سے اس الزام کو پوری تقویت ملی اور ان غلطیوں کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے ایک تو یہ ہے کہ اس ملک میں یہ تاریخ رہی ہے کہ کسی گورنمنٹ نے یہاں حکومت میں ہوتے ہوئے فیئر الیکشن نہیں کرائے مثلاً شروع سے پاکستان بننے کے بعد (51ء میں) جو الیکشن ہوئے اس میں دھاندلی کا الزام لگا۔

جھرلو کی اصطلاح استعمال ہوئی اور ایس ایس جعفری جو لاہور کا ڈی سی تھا اس نے خود بکس بھروائے۔ مجھے یاد ہے میں کیمبل پور میں اے ایس پی تھا۔ پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت بن چکی تھی وہاں میونسپل کمیٹی کے الیکشن ہو رہے تھے پولیس لائن کا چارج میرے پاس تھا تو صبح جب میں پولیس لائن گیا تو دیکھا کہ لائن افسر کچھ لوگوں کو مارچ کراتا ہوا لے کے آرہا ہے میں نے اس سے پوچھا کہاں گئے تھے کہنے لگا ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا کہ میونسپل کمیٹی کے فلاں آدمی کو ووٹ دے کے آؤ اس کو جتوانا ہے۔ وہ دولتانہ صاحب کی پارٹی کا آدمی تھا آئی جی پنجاب خان قربان علی خان اور اس کے بعد میاں انور علی صاحب بھی دولتانہ کے آدمی تھے۔ عبیداللہ خان مرحوم ہمارے ایس پی تھے وہ بھی ان کی

پارٹی سے منسلک تھے مطلب یہ کہ سرکاری افسروں کا الیکشن میں حصہ لینا کوئی نئی بات نہیں اس کا پس منظر موجود ہے۔

ہر حکومت نے ساری انتظامی مشینری الیکشن میں استعمال کی۔ایک کا تو میں خود شکار ہوا۔وہ مسعود صادق کا الیکشن تھا۔اس میں ان کا ارادہ تھا کہ پوری سرکاری مشینری کو سرکاری امیدوار کے جتوانے میں استعمال کیا جائے باقی جگہوں پر وہ کی گئی لیکن راولپنڈی ایسی جگہ تھی جہاں میری اور ڈی سی رفیق عنایت کی وجہ سے یہ نہ ہوسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا بھی اور رفیق عنایت کا بھی وہاں سے تبادلہ ہوگیا تبادلے سے ہماری جان چھوٹی۔

اس کے بعد جب نیا الیکشن 74ء میں ہوا تو اس میں تو مشینری اس حد تک استعمال ہوئی کہ نواب کالاباغ تو جا کے کالاباغ بیٹھ گئے اور بہاولپور کے مخدوم زادہ حسن محمود کو ویسٹ پاکستان کے الیکشن کا انچارج بنا دیا۔انہیں جی او آر میں ایک کوٹھی دی گئی وہاں ویسٹ پاکستان گورنمنٹ کے سارے سیکرٹری تھے ان کو یہ حکم تھا کہ وہ الیکشن کے دوران میں مخدوم زادہ حسن محمود کے تابع ہیں چنانچہ ایوب خان کا ساری الیکشن کمپین مخدوم زادہ حسن محمود نے چلائی اور پوری طرح سے گورنمنٹ کی مشینری استعمال کی حالانکہ سرکاری طور سے ان کی کوئی پوزیشن نہیں تھی۔

یہاں تک ہوا کہ ہر کمشنر کو پیسے دیئے گئے اور کمشنروں نے پولنگ سٹیشنوں پر ایوب خان کے کیمپ قائم کیے۔لوگوں کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا۔لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ہر کمشنر کو پیسہ دیا گیا۔کمشنروں نے ڈپٹی کمشنروں کو اور ڈپٹی کمشنروں نے اسسٹنٹ کمشنروں کو دیا اور یہ اسسٹنٹ کمشنروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ لوگوں کو بلا بلا کے ایوب کے حق میں ووٹ دلوائیں۔میں اس وقت پنڈی میں موجود تھا۔مجھے یاد ہے کہ میں اتفاق سے ایس ایس پی کے پاس گیا۔بڑی بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی، پتہ چلا کہ گوجر خاں کی دو چار ایسی پاکٹس ہیں ان کی دھوم پڑی ہے کہ انہوں نے آ کے ووٹ نہیں دیا۔چنانچہ پوری مشینری اس کام پہ لگی ہوئی تھی کہ لوگوں کو لایا جائے اور ان کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے کھانے کا انتظام کیا جائے ووٹ ڈلوائے جائیں۔

الیکشن جیتنے کے بعد ایس پی شہزادہ حبیب نے شام کو ایک کھانا دیا جس میں ساری پنڈی ڈویژن کے ڈی سی اور ایس پی آئے ہوئے تھے وہاں بڑے فخر سے موازنہ کر رہے تھے کہ اپنے ضلع میں تم نے کتنے فیصد ووٹ ایوب خان کو لے کے دیئے اور یہ ان کے لیے فخر کی بات تھی کہ میں نے اپنے ضلع سے اتنے فیصد ووٹ ایوب خان کو دلوائے میں نے سب سے زیادہ کارکردگی دکھائی۔

اس سے بڑی دھاندلی اور کیا ہوسکتی ہے۔ساری ایڈمنسٹریشن پوری طرح سے الیکشن میں

استعمال ہوئی چونکہ بی ڈی ممبر صرف اسی ہزار تھے، محدود لوگ تھے، محدود الیکشن میں اثر ڈالنا بہت آسان ہوتا ہے عام الیکشن میں دھاندلی نہیں ہو سکتی۔

عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس ملک میں دھاندلی کا ایک سیاسی پس منظر شروع دن سے موجود رہا ہے۔

اس کے بعد یحییٰ خان کے الیکشن کے متعلق عام مشہور ہے کہ فیئر الیکشن تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فوج یا یحییٰ خان اس میں پارٹی نہیں تھے اس لیے اس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ دھاندلی کرتا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اندرون خانہ الیکشن کے نتائج پر اثر انداز ہونے کی کوشش ضرور کی تا کہ ان کی معتبری کسی نہ کسی طرح قائم رہے یہ دھاندلی بھٹو صاحب نے شروع نہیں کی بلکہ میں کہوں گا بھٹو صاحب نے دھاندلی نہیں کی اس لیے میں نے سیاسی پس منظر بیان کیا۔ لوگ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھے کہ یہ حکومت ضرور دھاندلی کرے گی مثلاً اگر معاشرہ خراب ہو۔ بے ایمان ہو تو ہر آدمی کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی بے ایمان ہوگا لیکن اگر اس میں کچھ لوگ ایماندار ہوں تب بھی لوگ یقین نہیں کرتے کہ وہ ایماندار ہوگا۔ اس معاشرے میں آسان کام یہ ہے کہ کسی پر بے ایمانی کا الزام لگا دیا جائے ہر آدمی مان لے گا لیکن اگر کسی کی تعریف کی جائے کہ وہ ایماندار ہے کوئی آدمی یقین نہیں کرے گا، ایک دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب بڑے ذہین سیاستدان تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ سیاستدان عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اخلاقی طور سے اس کی قوت یہی ہے کہ وہ لوگوں کا صحیح نمائندہ ہو اور جمہوری طریقے سے آیا ہو اگر وہ جمہوری طریقے سے نہیں آ رہا تو پھر وہ چل نہیں سکتا۔ یہ ان کو علم تھا۔ اس لیے جہاں ہم لوگ الیکشن کی تیاری کر رہے تھے وہاں انہوں نے یہی کوشش کی کہ الیکشن نہ صرف صحیح ہوں بلکہ لوگوں کو لگے کہ وہ صحیح ہوئے ہیں یہ بھی ان کو اندازہ تھا کہ جب تک لوگ ذہنی طور سے قبول نہیں کریں گے کہ صحیح الیکشن ہوئے ہیں اس وقت تک وہ ان کی قیادت کو بھی قبول نہیں کریں گے اس لیے حکمت عملی یہ تھی کہ کس طرح سے لوگوں کو یقین ہو کہ یہ الیکشن صحیح طریقے سے منعقد ہو رہے ہیں دوسرے یہاں ایک روایت رائج رہی ہے جس طرح امریکہ یا انگلینڈ میں الیکشن وہاں کی روایات کے مطابق لڑا جائے گا۔ ہندوستان میں الیکشن وہاں کی روایات کے مطابق لڑا جائے گا اور پاکستان میں جو الیکشن لڑا جائے گا وہ یہاں کی روایات کے مطابق لڑا جائے گا۔ چونکہ یہاں انٹیلی جینس ایجنسیاں، سرکاری ایجنسیاں الیکشن میں استعمال ہوتی رہی ہیں آئی ایس آئی اور انٹیلی جینس بیورو ایوب خان کے لیے کام کرتی رہیں۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی ان ایجنسیوں سے رپورٹ مانگی گئی کہ کون کون آدمی اچھے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ اب کسی آدمی کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ بالکل پاک ہے تو یہ بڑا مشکل کام ہے۔

لیکن آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت بھٹو نے ڈالی جس کی بنیاد پر فوج نے بھٹو صاحب کے خلاف کیس بنایا بلکہ سب سے پہلے جس نے غلط روایت قائم کی وہ ایوب خان تھا اسی طرح یحییٰ خان نے بھی کیا۔ کیا اس وقت ساری ایجنسیاں اس کو رپورٹیں نہیں دیتی رہیں کہ کون کتنی سیٹیں جیتے گا۔ عوامی لیگ کی کیا پوزیشن ہے بھٹو کی کیا پوزیشن ہے اس کو کیا ضرورت تھی اس کا کام تو الیکشن کرانا تھا لیکن کیا ساری ایجنسیز اس کام میں مصروف نہیں تھیں۔ بھٹو صاحب نے کوئی نیا کام تو شروع نہیں کیا میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ روایتی طور سے جو تاریخی پراسیس ملک میں تھا اس میں بھٹو صاحب کے الیکشن چاہے کتنے ہی صاف ستھرے ہوتے ان پر دھاندلی کا الزام ضرور لگتا۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ ہر گورنمنٹ کے زمانے میں جو ضمنی انتخابات ہوئے ہیں ان میں ضرور دھاندلیاں ہوئی ہیں اس لیے کہ ایک دو الیکشن ہوتے ہیں ساری گورنمنٹ کو فرصت ہوتی ہے اس لیے ضرور دھاندلی ہوتی ہے بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی جو ضمنی الیکشن ہوئے اس میں دھاندلیاں اس لیے ہوئیں کہ جو چیف منسٹر تھا وہ اپنے آپ کو پاٹے خاں ثابت کرنا چاہتا تھا وہ بتانا چاہتا تھا کہ کالا باغ کچھ بھی نہیں مجھ سے بڑا کالا باغ کون ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ضمنی الیکشن میں اپنی کارکردگی ظاہر کر کے بھٹو صاحب کو متاثر کرتا تھا کہ وہ بڑا ایکٹو چیف منسٹر ہے جو ڈی سی یا ایس پی یا کمشنر لگے ہوتے ہیں وہ بھی وفاداری ظاہر کرنا چاہتے ہیں چنانچہ جو بھی ضمنی الیکشن ہوئے جس میں کہ کھر صاحب کا الیکشن بھی شامل ہے اس میں دھاندلی ہوئی اس سے پھر یہ تاثر زیادہ مضبوط ہو گیا کہ الیکشن میں گورنمنٹ ضرور دھاندلی کرے گی اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ بات نبھ جاتی لیکن دو چار بڑی سنگین سیاسی غلطیاں ہوئیں دیکھیں الیکشن میں دھاندلی کا جو الزام ہے صرف ایک ہی صوبے پنجاب میں لگا فرنٹیئر میں نہیں لگا۔ بلوچستان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو تھا ہی بائیکاٹ، سندھ میں بھی کوئی الزام نہیں آیا۔ اگر سندھ میں الزام آیا تو پی این اے کے خلاف آیا کہ انہوں نے کراچی میں دھاندلیاں کیں غنڈہ گردی کی بھٹو صاحب کے خلاف جو الزام ہے پنجاب میں ہی سامنے آیا اس کی میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی وجہ صادق قریشی ہے جو بالکل ایک غیر سیاسی ذہن کا انسان ہے اس نے بھٹو صاحب کی فتح کو اصل میں ایک شکست میں تبدیل کیا۔ اپنے ایک خاص طریق کار کی وجہ سے اگر بھٹو صاحب کا چیف منسٹر اس وقت کھر ہوتا یا حنیف رامے ہوتا یا کوئی بھی سیاسی ذہن کا آدمی ہوتا وہ دھاندلی بھی بیشک کرتا لیکن تاثر یہی ہوتا کہ انہوں نے سیاسی طور سے الیکشن جیتا ہے۔ صادق قریشی کی بیوقوفی سے ہوا یہ کہ ایک سیاسی فتح ہوئی اور انہوں نے تاثر یہ دیا کہ انتظامی فتح ہوئی ہے مطلب یہ کہ نہ وہ کسی سیاستدان سے ملتے تھے نہ ان کا کوئی سیاسی اثر و رسوخ تھا نہ وہ تقریر کر سکتے تھے نہ انہوں نے دورے کیے۔ گھر میں بیٹھے ہوئے ڈپٹی کمشنروں اور ایس پیز کو فون کر رہے

ہیں۔ سناؤ بھئی کتنی سیٹیں ملیں گی کتنی سیٹیں دلوار ہے ہو جیسے کہ یہ کام ڈپٹی کمشنروں اور ایس پیز کا تھا اس قسم کے الیکشن میں ڈپٹی کمشنر اور ایس پی سیٹیں نہیں دلوا سکتے اب وہ ڈی سی اور ایس پی ڈر کے مارے یہ تو نہیں کہے گا کہ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے ظاہر ہے وہ اپنی پروموشن کے لیے یا اپنی پوسٹنگ برقرار رکھنے کے لیے یہی کہے گا کہ جناب جیسے حکم کریں۔ ایک یہ ان کا طریق کار بالکل غلط تھا جس کی وجہ سے یہ الزام لگا کہ انتظامی طور سے یہ الیکشن لڑا جا رہا ہے۔ صادق قریشی ایک مسخرہ آدمی ہے وہ ایک ملاں دو پیازہ ٹائپ کا درباری آدمی ہے۔ شام کے وقت شراب کا دور چل رہا ہو۔ ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کی ٹانگ کھینچنا۔ سکینڈلائز کرنا ان باتوں میں وہ بڑا ماہر ہے۔ لیکن سوجھ بوجھ کے لحاظ سے انتظامی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اس میں کوئی اہلیت نہیں اس کا آپ اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک میٹنگ ہوئی سارے چیف منسٹر موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے انہیں پوچھا بتائیں کیا پوزیشن ہے پیپلز پارٹی کو کتنی سیٹیں ملیں گی۔ جتوئی نے کہا میرا خیال ہے کہ اتنی ملیں گی، صادق قریشی سے پوچھا چونکہ وہ نہ تو کبھی پڑھتا تھا نہ کبھی تیاری کرتا تھا نہ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کیا ایجنڈا ہے اس نے کہا کہ جیسا آپ حکم کریں اس پر بھٹو صاحب تڑپے۔ انہوں نے کہا صادق قریشی اگر یہی بات ہے تو پھر الیکشن کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم نے الیکشن کے نتائج پر اثر انداز ہونا ہے اور تم نے مجھے سیٹیں دلوانی ہی ہیں جتنی کہ میں حکم دوں تو پھر الیکشن کرانے کی کیا ضرورت ہے پھر ہم بیٹھے رہتے ہیں پھر ٹھیک ہے جو مضبوط آدمی آئے گا ہمیں بھی ہٹا دے گا میں آپ کو ذہن کی بات بتا رہا ہوں کہ پنجاب میں کیوں ایجی ٹیشن ہوئی لیکن ڈانٹ کے باوجود صادق قریشی صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی اس کا خیال یہ تھا کہ جو کچھ ہو گا بھٹو خود سنبھال لے گا۔

صادق قریشی تو ہنسی خوشی اور مذاق میں چیف منسٹر بنا تھا اور اسی ماحول میں رہنا چاہتا تھا۔

ایک اور بڑی غلطی یہ کہ بھٹو صاحب نے الیکشن کے متعلق جو مشورہ مانگا وہ ہمیشہ سرکاری افسروں سے مانگا۔ جن کی ایک خاص اپروچ ہوتی ہے جس میں میں بھی شامل تھا میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں کہتا سرکاری افسروں کو اندازہ نہیں تھا کہ بھٹو صاحب کی وجہ سے اس ملک میں کیا ذہنی انقلاب آیا جو روایتی ملک چودھری تھے ان کی چودھراہٹ ان کی پوزیشن دیہات میں ختم ہو گئی تھی لوگ پروگرام کو ووٹ دیتے ہیں بھٹو صاحب کو ووٹ دیتے ہیں ملکوں کو چودھریوں کو ووٹ نہیں دیتے سرکاری افسروں کو اس کا اندازہ نہیں تھا اور ان کا تجزیہ صرف اس بات پر پہنچتا تھا کہ اگر پیپلز پارٹی کا امیدوار کوئی پرانا چودھری ہے جو روایتی طور سے ایک حلقے میں چلا آ رہا ہے اس کے متعلق لکھیں گے کہ یہ جیت جائے گا لیکن ایسا آدمی جو بھٹو صاحب کی پارٹی میں نیا نیا آیا تھا غریب تھا یا پیپلز پارٹی کی وجہ سے مشہور ہوا تھا اس کی اور کوئی کوالیفکیشن نہیں تھی نہ اس کے پاس پیسہ تھا نہ اس کی روایتی پوزیشن تھی اس کے متعلق ان کی رپورٹ یہ تھی

کہ وہ نہیں جیت سکتا۔ تو جو سارا اندازہ بنا۔ وہ واقعاتی نہیں تھا وہ صرف اندازے سے بنایا گیا۔ یہاں ایک مثال دیتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں نیشنل اسمبلی کی سات سیٹیں تھیں اس کے متعلق سارے افسروں کی رپورٹ یہ تھی کہ ایک سیٹ پیپلز پارٹی جیتے گی اور وہ بھی معروف آدمی تھا اس کی فیملی سیٹ تھی۔ اس ایک کے متعلق ان کی رپورٹ تھی کہ وہ جیت جائے گا۔ باقی چھ کے متعلق انہوں نے کہا کہ نہیں جیتیں گے ان کا ہر ڈسٹرکٹ میں یہی اندازہ تھا۔

بالکل وہی اندازے تھے جو 70ء میں یحییٰ خان کے لیے لوگوں نے کیے اس کا نقصان یہ ہوا کہ سرکاری افسروں کی رپورٹ تھی کہ پنجاب میں ستر سیٹیں ملیں گی یا پچھتر ملیں گی سارے ڈی سی یہی بات کر رہے ہیں سارے ایس پی بھی یہی بات کر رہے ہیں سارے اخبار نویس بھی یہ بات کر رہے ہیں بھٹو صاحب تک یہ بات پہنچی کہ ستر سیٹیں ملیں گی وہ ایک غلط اندازہ تھا لیکن جب ایک سو بیس ملیں تو کسی شخص نے یقین نہیں کیا کہ یہ صحیح ملی ہیں' افسر خود کہتے تھے 70 ملیں گی یہ ایک سو دس ایک سو پندرہ ایک سو بیس کیسے مل گئیں۔ ضرور دھاندلی ہوئی ہے چنانچہ دھاندلی کا الزام اس طرح سے پکا ہو گیا جب ایک غلط اندازہ ایک دلیل کے طور پر استعمال ہونا شروع ہو گیا۔ جسے سرکاری افسروں نے بنایا تھا۔ تو لامحالہ اس کے منفی اثرات تو مرتب ہونا ہی تھے۔

4 مارچ 77ء کو لاہور میں میٹنگ تھی وہاں جیلانی ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بھی موجود تھے۔ شیخ اکرم بھی تھا مسعود محمود بھی تھا میں بھی تھا پنجاب کے چیف سیکرٹری وغیرہ بھی تھے وہاں یہ بحث تھی کہ کتنی سیٹیں ملیں گی سرکاری افسروں نے وہی اندازہ بتانا شروع کر دیا ساہیوال کی شاید آٹھ سیٹیں تھیں سرکاری افسروں نے کہا کہ جی چار سیٹیں آپ کو ملیں گی لاہور کی آٹھ تھیں اس میں کہا کہ تین تو یقینی طور سے ملیں گی۔ ایک شاید اور مل جائے وہاں ڈاکٹر مبشر حسن بیٹھے ہوئے تھے ڈاکٹر مبشر جو بات کرتے ہیں بڑے دھڑلے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں بھٹو صاحب یہ آپ کو بالکل غلط بتا رہے ہیں یہ آپ کو گمراہ کر رہے ہیں ہم لاہور میں آٹھ کی آٹھ سیٹیں جیتیں گے اور ساہیوال میں بھی شاید ایک سیٹ ہاریں۔

ڈاکٹر مبشر دھاندلی میں کبھی شریک نہیں تھے' اگر ہوتی تو بھی شریک نہیں ہوتے' ان کے شریک ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے صادق قریشی جہاں چیف منسٹر ہو وہاں ڈاکٹر مبشر تو معاملات کو نہیں چلا سکتے تھے' اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر بھٹو صاحب سرکاری مشینری کو اس قسم کے اندازے بنانے کے لیے استعمال نہ کرتے تو یہ ان کے لیے کہیں بہتر ہوتا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو سیاسی ذہن ہے وہ سرکاری ذہن سے بڑا مختلف ہے۔ ڈاکٹر مبشر کا ذہن سیاسی ذہن تھا ہم لوگوں کا سرکاری ذہن تھا میرا خیال

ہے کہ سب سے بڑی غلطی بھٹو صاحب سے یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے سیاستدانوں کے ذہن کی بجائے نوکرشاہی کے ذہن پر انحصار کیا جس سے کہ وہ دھوکہ کھا گئے۔

ہر آدمی کا یہ اندازہ تھا کہ گوجرانوالہ سے پی پی پی کو ایک سیٹ ملے گی اتفاق سے مجھے ایک شکایت ملی کہ گوجرانوالہ شہر میں جو پولنگ سٹیشن ہیں وہاں پی این اے کے غنڈوں نے بڑی افراتفری مچائی ہوئی ہے' عورتوں کی بے عزتی کر رہے ہیں اور پیپلز پارٹی کے ووٹروں کی مار پیٹ کر رہے ہیں میں نے ڈی سی کو فون کیا ڈی سی کہیں باہر گئے ہوئے تھے مجھے بتایا گیا وہ آئیں گے تو آپ سے بات کریں گے چنانچہ ڈی سی نے رات بارہ ایک بجے میرے ساتھ فون پر بات کی۔ اس نے کہا مجھے بھی شکایت ملی تھی میں گیا تھا واقعی انہوں نے غنڈہ گردی کی ہے میں انتظام کر آیا ہوں' اب جو ڈی سی تھے وہاں راجہ سعید اختر' وہ اچھے افسروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے کہ وہ محنتی ہیں۔ کھرے ہیں' غلط بیانی سے وہ کبھی کام نہیں لیتے چونکہ میرے ان سے عزیزداری بھی ہے۔ اس لیے مجھ سے انہیں کوئی غلط بیانی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ راؤ صاحب میں تو بڑا حیران ہوں مجھے تو یقین نہیں آیا میں نے کہا کیا ہوا کہنے لگے آپ کو پتہ ہے کہ میں اس خیال میں تھا' اور آپ کو بھی میں نے بتایا کہ پیپلز پارٹی والے ایک سیٹ جیتیں گے لیکن میں سارے پولنگ سٹیشنوں پہ گھوم کے آیا ہوں مجھے تو انقلاب لگتا ہے' وہ یہ کہ جو سفید پوش ہیں مختصر تعداد میں ہیں وہ تو کھڑے ہیں قومی اتحاد کے پولنگ بوتھوں پر جو غریب آدمی ہیں' ان کی پیپلز پارٹی کی پولنگ بوتھوں پر لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں پیپلز پارٹی گوجرانوالہ میں شائد ایک سیٹ پر بھی نہ ہارے یہ بات جو مجھے ڈی سی نے بتائی اس نے خود تسلیم کیا کہ اس کا اندازہ غلط تھا۔ صورتحال بالکل مختلف ہے۔

میاں چنوں کے ایک حلقے میں پیر ظہور میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ ان کے لڑکے شجاعت حسین کو پیپلز پارٹی کا ٹکٹ ملا۔ پراونشل اسمبلی کا نیشنل اسمبلی کے لیے چودھری برکت اللہ کو ملا وہ پرانا ممبر تھا۔ اتفاق سے وہ میرا شاگرد بھی رہا تھا جب میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں پڑھاتا تھا چونکہ وہ بھی کوئی خاندانی سیٹ نہیں تھی امیر آدمی بھی بیچارہ نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں ابھرا تھا تو جس ایجنسی نے بھی رپورٹ کی یہی کہ برکت اللہ نہیں جیت سکتا۔ چنانچہ سب رپورٹوں میں یہی آیا کہ برکت اللہ نہیں جیت سکتا۔ شجاعت نے مجھے بتایا کہ ہم اکٹھے جایا کرتے تھے کہتا تھا کہ مجھے بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ برکت اللہ مشکل سے ہوگا چونکہ دونوں کا آپس میں لنک تھا پیسے ویسے شجاعت کے پاس ہی تھے ٹرانسپورٹ بھی اس کے پاس تھی' شجاعت کہتا ہے اگر وہ ہار جاتا تو میں بھی ہار جاتا ہم نے علاقہ کا ایک دفعہ سارا دورہ کیا دوسری دفعہ کیا' تیسری دفعہ میں نے برکت اللہ سے کہا تو وہ کہنے لگا پیرا ہن اسی جت رہے آں توں فکر نہ کر' پھر

برکت اللہ جیت گیا جبکہ سرکاری افسروں میں سے کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ برکت اللہ جیت جائے گا مگر وہ جیت گیا۔

الیکشن کے دن کے اپج خورشید سے میری ملاقات ہوئی۔ پولنگ ہو رہی تھی اس وقت وہ خود ووٹ دے کے آئے تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ پولنگ ہو رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ووٹ زیادہ لگتے ہیں۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اصغر خاں جو دھاندلی کا الزام ثابت کرنے میں سرگرم تھے انہوں نے آخری وقت تک سارے پولنگ سٹیشنوں کا دورہ کیا' سوائے دو تین کے جہاں گنتی ابھی نہیں ہوئی تھی اس وقت تک انہوں نے بھی الزام نہیں لگایا کہ ان کے خلاف دھاندلی ہوئی ہے۔

بھٹو صاحب ایک بڑی تعداد سے جیت گئے لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کی اچھی خاصی فتح شکست میں بدل گئی اور قومی اتحاد کے ماسٹرز کی سٹریٹجی کامیاب ہوگئی۔ انہوں نے دھاندلی کا الزام جو سوچا سمجھا تھا لگایا اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

یہ بھٹو صاحب سے غلطی ہوئی کہ وہ لاڑکانہ سے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے اس میں بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب کو کچھ لوگ غلط مشورہ دیتے تھے۔ لاڑکانہ میں ایک صاحب تھے بعد میں کمشنر ہو گئے خالد احمد' وہ وہاں ڈی سی تھے' کھر صاحب نے انہیں سلیکٹ کر کے لاڑکانہ کے لیے بھجوایا تھا' ہوشیار آدمی تھے' اپنی پوزیشن بنانے کے لیے انہوں نے جائز ناجائز کام کرنے کی کوشش کی ایسے افسر ہمارے پاس بہت زیادہ ہیں، جو اپنے تھوڑے سے ذاتی فائدے کے لیے اپنے محسن کا بہت بڑا نقصان کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جان بوجھ کے دراصل ان میں اتنی سیاسی بصیرت نہیں ہوتی مجھے سو فیصد یقین ہے کہ بھٹو صاحب کا ان اپوز الیکشن خالد احمد صاحب نے صرف اپنی کارروائی دکھانے کے لیے کروایا حالانکہ بھٹو صاحب کو وہاں کے الیکشن میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور تعجب کی بات میرے لیے یہ ہے کہ بھٹو صاحب خود بھی محسوس کرتے تھے ایک تو باقاعدہ اس کی ایکسرسائز ہوئی کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ جو الیکشن ہوں گے وہ حقیقی معنوں میں صحیح ہوں گے لیکن بلا مقابلہ انتخاب کے اس ایک قدم نے اس چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

بھٹو صاحب بلا مقابلہ ہو گئے باقی چیف منسٹرز کیسے نہ ہوتے چنانچہ انہوں نے یہ کہا کہ جب پرائم منسٹر نے کیا ہے ہم کیوں نہ کریں جتوئی کا تو خیر امکان تھا نواب شاہ میں اب بھی یہی صورت ہے لیکن نصر اللہ خاں خٹک اور صادق حسین قریشی یہ بلا مقابلہ کیا' ویسے بھی نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ ایک سسٹم کی کمزوری تھی کہ جب بھٹو صاحب خود بلا مقابلہ ہو گئے تو ان میں اتنی بھی اخلاقی جرات نہ رہی کہ وہ ان کو

کہتے کہ تم نے یہ کیا کیا جب دامن خود پاک صاف ہو اس وقت آدمی دوسروں کو ٹوک سکتا ہے لیکن جب انہوں نے خود غلطی کر لی یا ان سے کروائی گئی یا ایک افسر نے خوشنودی حاصل کرنے کے لیے غلط قدم اٹھایا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں وزرائے اعلیٰ بھی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

میں نہیں کہتا کہ دھاندلی نہیں ہوئی دھاندلی ہوئی لیکن دھاندلی کی پلاننگ نہیں تھی کسی دھاندلی کو پلان نہیں کیا تھا بلکہ بھٹو صاحب نے مجھے بتایا کہ نہ صرف یہ کہ وہ چاہتے تھے کہ الیکشنز صاف ہوں بلکہ لوگوں کے ذہن نشین بھی ہو، کہ الیکشن ٹھیک ہوئے ہیں جب ایک آدمی کا یہ ذہن تھا تو وہ کیسے بیوقوفی کر سکتا ہے کہ اس طرح کی لوگ دھاندلی کریں۔

اصل بات یہ ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف پی این اے کی ایجی ٹیشن کی جو وبا پھیلی شہروں میں اور ان کے وزیروں کے خلاف ابھری جن کا کہ کردار پانچ سال یا چھ سال میں لوگوں کی توقع کے خلاف تھا اتفاق یہ تھا کہ وہی منسٹر کسی بھی قیمت پر الیکشن ہارنے کے لیے تیار نہیں تھے ایک کمزوری جو پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ میں رہی یہی تھی کہ بھٹو صاحب نے اپنے وزیروں یا بعض کارکنوں کی دھاندلیوں کو سختی سے نہیں روکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بدکرداری میں آگے بڑھتے رہے لوگ ان سے نفرت کرتے رہے سب سے زیادہ جو غیر ہر دلعزیز لوگ تھے وہ بھٹو صاحب کے منسٹرز تھے وہ کسی قیمت پر الیکشن ہارنے کے لیے تیار نہیں تھے حالانکہ وہ الیکشن جیت نہیں سکتے تھے وہ ضلعی حکام پر اثر ورسوخ بھی رکھتے تھے تو اصل میں جو دھاندلی کی انہوں نے کی اور ان کی وجہ سے پھر یہ تاثر ابھرا کہ عام دھاندلی ہوئی ہے۔

مثلاً جو حفیظ چیمہ تھا سرگودھا میں اس سے کون انکار کر سکتا ہے ناصر رضوی تھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے اختر ملک' کون انکار کر سکتا ہے کہ انہوں نے دھاندلی نہیں کی لیکن بعض منسٹر ایسے بھی تھے جو نسبتاً شریف اور ایماندار تھے مثلاً شیخ رشید ہیں یا معراج خالد ہیں لیکن ان سے سرکاری افسر نالاں تھے کیونکہ ان کی کوئی خاندانی پوزیشن نہیں تھی۔ سرکاری افسر کہتے تھے کہ جی یہ تو نہیں ہو سکتے لیکن وہ ہو گئے چنانچہ ان پر بھی الزام یہ لگا کہ دھاندلی ہوئی۔

❖

مقدمہ قتل

اب پچھلی ساری باتیں کی جاسکتی ہیں اس وقت تو ہمیں ساری بیک گراؤنڈ معلوم نہ تھی اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اگر ہو جاتا تو ٹھیک ہوتا فلاں چیز اگر ہو جاتی تو ٹھیک ہو جاتا لیکن جب انسان اس دور میں سے گزر رہا ہوتا ہے اور آئندہ کے لیے وہ فیصلے کرتا ہے اس کو تو نہیں علم ہوتا کہ کیا چیز کامیاب ہوگی کیا چیز ناکامیاب ہوگی وہ تو اس وقت ایک فیصلے کی بات ہوتی ہے اب تو ہم بیٹھ کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھٹو صاحب یہ کرتے تو یہ ہو جاتا' اگر بھٹو صاحب وہ کرتے تو وہ ہو جاتا مثلاً مقدمے کے متعلق بھی ہزار قسم کی لوگ باتیں کرتے ہیں کہ اگر یحییٰ بختیار دیر نہ کرتے تو یہ ہو جاتا ہمیں ان چیزوں کا علم ہے جو ہو چکا ہے اس علم کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز کامیاب ہوتی یہ چیز کامیاب نہ ہوتی لیکن اس وقت حالات ایسے تھے ان کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہو چکی تھی ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک بہت بڑی طاقت ان کی جان کے درپے ہے ان کو وارننگ بھی مل چکی تھی۔ جو کسنجر نے دی تھی۔ جب وہ لاہور بھٹو صاحب سے ملا تھا۔

اس نے کہا تھا We will make a horrible example of you

(ہم تجھے ایک عبرتناک مثال بنادیں گے)

بہرحال' جیسا میں نے کہا کہ دھاندلی کا الزام پی این اے نے اپنی ایک خاص سٹریٹجی کے تحت لگایا تھا۔ اور پھر سرکاری افسروں نے جو غلطیاں کیں اور پنجاب میں صادق قریشی کی وجہ سے غلطی ہوئی بھٹو صاحب کی وجہ سے کچھ غلطیاں ہوئیں ان کیوجہ سے دھاندلی کا جو الزام تھا ایک طرح سے لوگوں کے ذہن پر ثبت ہو گیا۔ بھٹو صاحب کے خلاف تھا۔ وہ سفید پوش عنصر ابھرا وہ لوگ ابھرے جو شہروں میں رہتے ہیں شہروں سے مخالفت ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ سارے ملک میں مخالفت ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو شہروں میں کتنے فیصد لوگ رہتے ہیں اور اس فیصد میں سے کتنے فیصد ایسے لوگ ہیں جو سڑکوں پر آئے چونکہ اخبار بھی وہی پڑھتے ہیں۔ ان میں وکیل بھی ہوتے ہیں' ان میں اخبار نویس بھی ہوتے ہیں

تیسری دنیا میں اگر شہری عنصر کسی کے خلاف ہو جائے تو لگتا یہ ہے کہ سارا ملک اس کے خلاف ہو گیا ہے حالانکہ ایک بہت بڑی اکثریت بھٹو صاحب کے ساتھ تھی اور اب بھی ہے۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ صادق حسین قریشی آپ کا موسیٰ خاں ثابت ہو گا ٹھیک کہتے ہیں اور بات بھی وہی ہوئی کہ ایجی ٹیشن کہاں سے شروع ہوئی پنجاب سے شروع ہوئی ایجی ٹیشن کامیاب کہاں ہوئی پنجاب میں کامیاب ہوئی تو اسی سے آپ اندازہ کر لیں کہ اگر بھٹو صاحب کسی سیاسی ذہن کے آدمی کو یہاں چیف منسٹر رکھتے جو سیاسی طور سے الیکشن لڑتا جتوئی بھی آخر تھا سندھ میں۔ دو آدمی جو اس وقت بالکل سیاست سے اور انسانیت سے بے بہرہ تھے ان میں ایک تو نصر اللہ خاں خٹک تھا فرنٹیئر میں دوسرا صادق حسین قریشی تھا پنجاب میں یہ ایک طرح سے مکمل طور سے ایجی ٹیشن کے ذمہ دار تھے۔ بہر حال بھٹو صاحب کی اپنی دوستیاں ہوتی ہیں کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ تعلقات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے ان کو رکھا لیکن اگر اچھی سیاسی پارٹی ہوتی جس کی مناسب تنظیم ہوتی اس قسم کے لوگ اس میں کبھی نہ ہوتے۔

جب الیکشن ہو گئے تو مجھے یاد ہے اسی رات کو شام کو میں کنٹرول روم میں گیا پنجاب گورنمنٹ نے ایک کنٹرول روم بنایا تھا وہاں الیکشن کی رپورٹیں آ رہی تھیں تو اب مجھے نہیں پتہ کہ یہ الزام کہاں تک صحیح ہے کہ بہت ساری سیٹوں کا رزلٹ انہوں نے پہلے ہی اناؤنس کر دیا۔

جب الیکشن کے رزلٹ آ گئے تو میں نے رات گیارہ بارہ بجے کے قریب بھٹو صاحب کو فون کیا اور مبارکباد دی پھر رات چار بجے ان کا فون آ گیا میں سویا ہوا تھا کہنے لگے راؤ یہ کیسے ہوا ہے کوئی دھاندلی تو نہیں ہوئی؟ مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ "کسی نے گڑبڑ تو نہیں کی؟ اتنی سیٹیں ہمیں کیسے مل گئیں"۔ اس لیے کہ بھٹو صاحب کے ذہن میں وہی اندازہ تھا جو سرکاری افسروں نے بتایا تھا لیکن جب ان کو زیادہ سیٹیں ملیں تو وہ خود اس بات پر بڑے حیران ہوئے کہ اتنی سیٹیں کیسے مل گئیں چونکہ وہ سیاستدان تھے۔ سمجھ گئے کہ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے اگر میرے ذہن میں شک و شبہ ہے تو لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے رات چار بجے مجھے فون کیا اور مجھ سے پوچھا یہ کیسے ہو گیا اس میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟ کوئی دھاندلی تو نہیں کی ہے؟ چونکہ مجھے ڈاکٹر مبشر حسن کی بات یاد تھی مجھے راجہ سعید اختر کی بات بھی یاد تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری افسر اس قسم کے الیکشن میں دھاندلی نہیں کرا سکتے' دھاندلی کس طرح سے ہو سکتی ہے دھاندلی اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ ایک ووٹر بار بار آ کے ووٹ دے تو حدود کے اندر دھاندلی ہر شخص کرتا ہے۔ پی این اے والوں نے بھی کی پیپلز پارٹی والوں نے بھی کی۔

ممکنہ دھاندلی دونوں کرتے ہیں لیکن جو اس قسم کی دھاندلی ہے کہ الیکشن کو بالکل الٹ دیں وہ

نہیں ہوئی۔

اگر دھاندلی ہوئی تو منسٹروں نے دھاندلی کی اگر کہیں یہ کوئی پلان تھا' یہ بالکل غلط بات ہے۔

مجھے یاد ہے ہماری میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ اگر کسی کو یہ خیال ہے کہ میں دو تہائی اکثریت چاہتا ہوں تو مجھے دو تہائی اکثریت کی ضرورت نہیں ہے میں نے کوئی بڑی آئینی تبدیلی نہیں کرنی۔ اس لیے مارچ کی چار تاریخ کو کمشنروں کی میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا میں نہیں چاہتا کہ کوئی دھاندلی ہو' کمشنروں نے فوج کے سامنے بیان دیا تھا کہ ہماری میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ دھاندلی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر دھاندلی کی پلاننگ کا خاکہ کہاں سے آیا۔ لاڑکانہ پلان کہاں سے آیا۔

بھٹو صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک کاغذ پر دستخط کیے جس میں ایک پلان کا ذکر تھا۔ لیکن وہ پلان ان کی نہیں تھی چونکہ میں ان کی لینگوئج (زبان) سے واقف ہوں۔ مجھے ان کی زبان کا پتہ ہے جو بھٹو صاحب کی زبان کو جانتا ہے' وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ پلان ان کی لکھی ہوئی نہیں تھی مجھے شبہ یہ ہے کہ وہ بھی خالد احمد کی لکھی ہوئی ہے۔

مجھے شبہ ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ اس قسم کی فضول سی بات ایک سرکاری ذہن ہی کر سکتا ہے ایک سیاستدان نہیں کر سکتا' اگر کوئی لاڑکانہ پلان ہوتی میں تو الیکشن سیل کا انچارج تھا' الیکشن کا سب سے زیادہ کام بھٹو صاحب نے میرے سپرد کیا ہوا تھا تو کم از کم مجھے اس پلان کا پتہ ہوتا سب سے پہلی دفعہ مجھے اس پلان کا پتہ چلا جب میں نظر بند تھا ایک بریگیڈیئر اور ایک ڈی آئی جی صاحب میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے وہ پلان دکھائی کہ یہ کبھی تمہاری نظر سے گزری ہے میں نے کہا میں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا چنانچہ فوج نے ان کے خلاف سارا کیس لاڑکانہ پلان پر بنایا کہ یہ ان کی پلان تھی لیکن اس پلان میں جو باتیں تھیں ان میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا' نہ کسی ڈسٹرکٹ میں کوئی ٹرانسپورٹ کمیٹی بنی' نہ کسی ڈسٹرکٹ میں ہر روز میٹنگیں ہوتی تھیں مطلب یہ ہے کہ صرف بھٹو صاحب کا اس پلان پر دستخط کر دینا کافی نہیں ہے۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ اگر پلان ہوتا تو اس کا سب سے پہلے مجھے پتہ ہوتا' میں ہدایات بھیجتا کہ اس کے مطابق کام کیا جائے گا میں پھر دیکھتا کہ اس پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں ہو رہا نہ معلوم وہ پلان کس نے بنایا بھٹو صاحب نے کن حالات میں دستخط کیے اور کیا اس کی وجوہ تھیں لیکن یہ کہ وہ پلان میں نے کبھی اس الیکشن کے دوران میں کسی ڈسکشن میں کسی میٹنگ میں ڈسکس ہوتے ہوتے نہیں دیکھا نہ اس کی کسی بات پر عمل ہوا۔

انہوں نے اپنی کتاب میں جو لکھا ہے' وہ اس قسم کی توجیہہ ہے جو عام ذہن کو اپیل نہیں کرتی کہ سندھ کا ایک سیاسی آدمی لکھ کے لایا اور اس نے کہا کہ میں نے اتنی محنت کی ہے اور آپ نے اس کو اس

طرح سے پھینک دیا ہے تو اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے کہاں تک غلط ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پہ دھاندلی کا جو الزام تھا وہ ایک طرح سے لوگوں کے ذہن میں پختہ ہو گیا خاص طور سے ان لوگوں کے ذہن میں جو اس ملک کی سیاست میں اہم مقام رکھتے ہیں مثلاً اخبار نولیس' وکیل' شرفا کا طبقہ' سرکاری افسر یہی لوگ ہیں۔ باہر کی دنیا جن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوتی ہے لیکن یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بھٹو صاحب کی جیت صحیح جیت تھی اگر وہ دوبارہ الیکشن بھی کراتے تو بھی جیت سکتے تھے۔

دوبارہ الیکشن کرانے کی تجویز زیر غور آئی مثلاً عبداللہ ملک نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کے لوگ تو ایک مرد کو' جنے کو پسند کرتے ہیں' اگر بھٹو صاحب اب یہ کہہ دیں کہ چلو چلو ٹھیک ہے چلو دوبارہ چلو۔ چلو پھر آ ؤ' پہلوان پھر آ ؤ تو پھر بھی وہ جیت جاتا تو میں نے بھٹو صاحب سے یہ کہا کہ عبداللہ ملک کا یہ کہنا ہے کہ اگر آپ الیکشن دوبارہ کرا دیں تب بھی آپ کو فکر کی کوئی بات نہیں لیکن اس میں ہمیشہ ایک چیز مانع رہی وہ یہ کہ بھٹو صاحب کے جو بڑے قریبی پولیٹیکل ایڈوائزر تھے جو منسٹرز تھے لیکن اگر صحیح الیکشن ہوتے تو ان میں سے اکثر منسٹر ہار جاتے اور وہی لوگ تھے جو بھٹو صاحب کو صحیح کام کرنے سے روکتے تھے کوئی نہ کوئی بہانہ کوئی نہ کوئی حیلہ' کوئی نہ کوئی دلیل دے کے انہوں نے بھٹو صاحب کو صحیح راستہ اختیار کرنے سے باز رکھتا تھا ہو سکتا ہے بھٹو صاحب کی بھی غلطیاں ہوں لیکن اس زمانے میں جو غلطیاں ہوئیں ان کے پیچھے زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہیں اپنی ذات کا خطرہ تھا۔ لیکن بھٹو صاحب کی ذات کو کوئی خطرہ نہ تھا۔

اس کے بعد ایجی ٹیشن شروع ہو گئی شروع تو بڑی مدھم رفتار سے ہوئی لیکن آہستہ آہستہ وہ تیز ہوتی گئی۔ کراچی سے شروع ہوئی وہاں مہاجر اور پٹھان عنصر کا اکٹھ ہو گیا پھر یہ پنجاب میں بھی تیز رفتاری سے شروع ہو گئی۔ الیکشن کے فوراً بعد ایک وکٹری پروسیس تجویز ہوا تھا۔ میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اس لیے کہ میرے ذہن میں گوہر ایوب والا جلوس تھا۔ میرے ذہن میں وہ تھا اور مجھے یہ خیال تھا کہ اگر یہ جلوس نکلا پولیس جلوس کے ساتھ ہو گی پھر لڑائی ہو گی' پھر پتہ نہیں کتنے لوگوں کا کشت و خون ہو گا چنانچہ بھٹو صاحب نے جلوس نکالنے کی تجویز کو رد کر دیا۔

میں یہ ضرور کہوں گا کہ بعض غلطیاں تھیں اور وہ یہ تھیں کہ ایک تو بھٹو صاحب نے بعض معروضی حالات کی وجہ سے پریس کو اتنی آزادی نہیں دی جتنی کہ ملنی چاہیے تھی حالانکہ پریس والے لکھ سب کچھ رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تاثر رہا کہ جی بڑی پابندیاں ہیں مطلب یہ کہ گناہ اور بے لذت کہ پریس پر سختی کا بھی الزام آیا اور اس کا فائدہ بھی کچھ نہ ہوا۔ ''زندگی'' بھی چھپتا رہا کسی نہ کسی صورت میں

"اردو ڈائجسٹ" بھی چھپتا رہا۔ کسی نہ کسی صورت میں یہ بھی تھا کہ ان کو پکڑا جا رہا ہے' ان پر سختی ہو رہی ہے۔ پریس کے خلاف حکومت ہر قسم کے اقدامات کر رہی ہے۔ لیکن حکومت کے خلاف لکھا بھی جا رہا ہے۔

دوسرا یہ کہ ایمرجنسی انہوں نے لفٹ نہیں کی' حالانکہ اگر جمہوریت ہے تو ایمرجنسی رکھنے کا کوئی جواز تو نہیں تھا' ہاں اگر وہ سوشلسٹ پروگرام نافذ کرنا چاہتے تو پھر وہ بیشک ایمرجنسی نافذ کرتے' تنقید سے بے نیاز ہو جاتے اور اس پروگرام پر سختی سے عمل کرتے تا کہ پانچ سال کے بعد عوام تک اس پروگرام کا کوئی فائدہ پہنچتا اور وہ پھر خود بخود ان کے ساتھ ہو جاتے لیکن جمہوریت کا عمل جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایمرجنسی لگائے رکھی اور اس کے ساتھ دفعہ 144 نتیجہ یہ ہوا کہ نہ کوئی جلسہ کر سکتا تھا نہ کوئی جلوس نکال سکتا تھا میں نے الیکشن کی تیاری کے سلسلے میں جو تجویزیں پیش کیں' ان میں یہ تجویز بھی تھی کہ اخباروں پر سے سنسر شپ اٹھایا جائے۔ ایمرجنسی اٹھائی جائے وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ کہ جو پابندیاں تھیں وہ اٹھائی جائیں دوسرا یہ کہ سیکشن 144 ختم کی جائے تا کہ جلسے جلوس ہوں لوگوں کو عادت پڑے یہ نہ ہو کہ ایک دم ابال نکل پڑے چنانچہ ہم نے صوبائی حکومتوں کو لکھا کہ ہم 144 اٹھانا چاہتے ہیں آپ اپنی رائے لکھیں سندھ والوں نے لکھا کہ یہاں 144 تو ہے ہی نہیں اس لیے اگر آپ اٹھانا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں سرحد کی طرف سے بھی یہی جواب ملا بلوچستان کی طرف سے تھوڑی سی پس و پیش ہوئی۔ انہوں نے یہ کہا کہ جہاں جہاں ضرورت ہے وہاں ہم رکھیں گے' اب پنجاب کی باری آئی پنجاب نے لکھا کہ یہ نہیں اٹھانی چاہیے اور اگر بہت ضروری ہے تو اسے تحصیل وائز اٹھایا جائے اس کی کوئی تک نہیں تھی کہ ضلع وار کی بجائے تحصیل وار اٹھائی جائے اسی لکھائی پڑھائی میں سیکشن 144 دیر تک نہ اٹھ سکی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب الیکشن آئے تو ایک نفسیاتی اثر یہ پڑا۔ لوگ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگے ہمارے ملک میں یہ ہوتا ہے کہ حکومت ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی بھی نہیں ہٹا سکتا لیکن الیکشن ہوگا تو اس کا مطلب یہ کہ حکومت خود اپنی موت کا پروانہ لکھے گی۔ لوگوں کو فی الفور یہ احساس ہوا کہ بھٹو ہمیشہ کے لیے تو نہیں' یہ تو تبدیل ہو سکتا ہے۔

پانچ سال میں پہلی دفعہ جب جلسے وغیرہ ہوئے تو لوگوں کو موقع ملا کہ انہوں نے بھٹو صاحب کے خلاف گالیاں سنیں' سیاسی تقریریں سُنیں چنانچہ لوگوں نے جوق در جوق جلسوں میں جانا شروع کر دیا۔ اس سے پیپلز پارٹی کے لوگ گھبرا گئے۔ ان کو چھ سال میں یا پانچ سال میں عادت نہیں رہی تھی' اپنی مخالفت میں ہجوم دیکھنے کی' وہ بھی لاکھوں کی تعداد میں' دس دس پندرہ پندرہ میل جلوس دیکھنے کی۔

مجھے یاد ہے کہ 20 یا 21 فروری (76ء) کا میرا ایک نوٹ ہے۔ بھٹو صاحب کو میں نے کہا کہ

اچانک پانچ سال کے بعد لوگوں کو آزادی ملی ہے۔ اپوزیشن کے جلسوں میں بہت جوش و خروش ہے بے شمار لوگ آ کے سن رہے ہیں لیکن یہ چیز زیادہ دیر نہیں رہے گی آخر کار اسی پارٹی کی جیت ہوگی جس پارٹی نے عوام کے لیے کچھ کیا ہے یا دوسرے جو پارٹی الیکشن میں محنت کرے گی ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے' جلسے جلوسوں سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ساری قوم پی این اے کے پیچھے لگی ہوئی ہے ان کا جوش و خروش فروری کے تیسرے ہفتے تک تو رہا۔ اس کے بعد پھر ان کا ڈاؤن فال شروع ہو گیا۔

اس ڈاؤن فال کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنرل نیازی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا جب وہ ان کے پلیٹ فارم پر آیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ لوگ ایک شکست خوردہ جرنیل کو صرف بھٹو کی مخالفت میں اپنے پلیٹ فارم پر لے آئے ہیں۔ ایک تو اس کا بڑا اثر ہوا دوسرا پھر ولی خاں کی رہائی کے لیے مطالبے کیے گئے اس کی وجہ سے بھی پنجاب میں خاص طور سے PNA کو پسند نہیں کیا گیا۔

چنانچہ آہستہ آہستہ ان کا زور ٹوٹ رہا تھا پھر جو بھٹو صاحب نے دورے کیے ایک تو وہ دورہ تھا جو میرے زمانے میں ہوا تھا جہاں کہ راے صاحب' ٹرکوں پر لوگوں کو منگوایا کرتے تھے لیکن انتخابی دورہ بھٹو صاحب کا ایسا تھا جہاں لوگ آ کے ان کی باتیں سننا چاہتے تھے مثلاً مجھے یاد ہے جب وہ سیالکوٹ گئے تو واپسی پر سیالکوٹ سے لاہور تک کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں مجمع نہ ہو اور بے شمار انسان ''بھٹو آوے ای آوے'' اور ''بھٹو زندہ باد'' کے نعرے نہ لگا رہے ہوں مطلب یہ کہ وہ ایسا ماحول تھا کہ پولیس اور ڈی سی لوگوں کو اکٹھا نہیں کرتے تھے۔ لوگ خود آتے تھے۔

بھٹو صاحب کی جیت صحیح جیت تھی لیکن سٹریٹجی کے اعتبار سے ٹیکٹ کے اعتبار سے وہ پی این اے سے مار کھا گئے، بیورو کریٹس پر انحصار کرنے کی وجہ سے کیونکہ ایک رخ اس طرف چل رہا تھا کہ پیپلز پارٹی مشکل سے واضح اکثریت لے گی لیکن ان کو بے شمار سیٹیں مل گئیں۔ اس وجہ سے یہ تاثر قائم ہو گیا کہ ضرور دھاندلی ہوئی ہے۔ لیکن الیکشن کے اعلان سے پہلے لوگوں نے دیکھا کہ اپوزیشن میں کوئی جان نہیں ہے جس کو بھٹو صاحب ٹکٹ دے دیں گے وہ منتخب ہو جائے گا۔ الیکشن نہیں سلیکشن ہو گا اصل مطلب یہ تھا کہ میدان بھٹو صاحب کے لیے اتنا ہموار ہے کہ جس کو بھی وہ ٹکٹ دے دیں گے وہ ممبر الیکٹ ہو جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ میرا خود بھی یہ خیال تھا۔ میں نے خود اپنے نوٹ میں لکھا۔ جس کو آپ کا ٹکٹ ملے گا وہ جیت جائے گا اسی لیے کہ لوگ جوق در جوق آپ کی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔

جہاں تک امریکہ کی مداخلت کا سی آئی اے کی مداخلت کا تعلق ہے۔ جب تک میرے پاس کسی چیز کے متعلق شہادت موجود نہ ہو اور خود میری تسلی نہ ہو تصدیق نہ ہو تو کسی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ امریکہ کا ایجنٹ ہے یا ان کا آدمی ہے یہ بڑی مشکل سی بات ہے میرے پاس براہ راست شہادت نہیں ہے

نہ ہوسکتی ہے ظاہر ہے کہ اگر سی آئی اے کے ایجنٹوں کے متعلق لوگوں کے پاس ایسی شہادتیں ہوں تو پھر ان کا کاروبار ہی ٹھپ ہو جائے اور وہ کاروبار ہی نہ کرسکیں لیکن اس میں چند ایک حقیقتیں ہیں جو اس سلسلے میں میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ایک رواج ہے کہ ہر شخص کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سی آئی اے کا آدمی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس ملک میں اور سیاستدانوں میں یہ تاثر ہے کہ ہر شخص سی آئی اے کا تنخواہ دار ہے۔ تجربہ بھی یہ ہے کہ تیسری دنیا کا چھوٹا ملک جو خود کفیل نہ ہو اور جو اپنی بقا کے لیے اپنی ضروریات کے لیے کسی نہ کسی بڑی طاقت کا سہارا لیتا ہو تو وہ مکمل طور سے ایک تو آزاد ہی نہیں ہوسکتا نہ اس ملک کا سربراہ' نہ اس ملک کے سیاستدان۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بھٹو صاحب کی کتاب ''متھ آف انڈی پنڈنس'' کا سارا تھیم ہی یہی ہے کہ یہ جو تیسری دنیا کے ملک آزاد تصور ہوتے ہیں حقیقت میں آزاد نہیں ہوتے ان کا بڑی طاقتوں پر اتنا زیادہ انحصار ہوتا ہے اور بڑی طاقتیں ان کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر اس قدر اثر انداز ہوسکتی ہیں کہ ان ملکوں کو صحیح طور سے آزاد نہیں کہا جاسکتا اور ان کے لیے یہ بڑا مشکل کھیل ہے کہ کس طرح سے بچ بچا کے اپنی خودمختاری کی حفاظت کرسکیں اپنی آزادی برقرار رکھ سکیں۔ بہت کم اس قسم کے سیاستدان ہوتے ہیں جو اس قسم کا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ عام سیاستدان ایسے ہی ہیں جو کسی بڑی طاقت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں اور عام طور سے تیسری دنیا میں چونکہ زیادہ تر یا تو فوجی ہیں یا سرمایہ دار یا سرمایہ داروں کے آلۂ کار۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق امریکہ سے ہی فٹ بیٹھتا ہے اس ملک میں یہ تاثر ہے کہ جب تک امریکہ بہادر کی اشیر باد حاصل نہ ہو اس وقت تک کوئی سیاستدان یہاں برسر اقتدار نہیں آسکتا۔ اس لیے جو سیاستدان بھی اس ملک میں اوپر آنا چاہے گا یا اقتدار میں آنا چاہے گا اسے کسی نہ کسی سطح پہ اپنے تعلقات امریکہ سے یا بڑی طاقتوں سے پیدا کرنے پڑتے ہیں یا تو لیڈر عوام کے سہارے چلے لیکن بدقسمتی سے وہ ریت ہمارے ملک میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئی تو پھر جب وہ سہارا ڈھونڈتے ہیں تو ظاہر ہے امریکہ کا سہارا ہی زیادہ موثر ہوتا ہے اس کی پھر وہ قیمت دینے کے لیے تیار بھی ہوتے ہیں۔ اپنے اقتدار کے لیے۔ اگر اصغر خان صاحب کے عزائم اس ملک میں برسر اقتدار آنے کے ہیں تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ضرور امریکہ سے کوئی نہ کوئی رشتہ قائم رکھا ہوگا اور امریکہ نے بھی ان سے کوئی نہ کوئی رشتہ قائم رکھا ہوگا اور یہ وہ ہر اس شخص کے ساتھ کرتے ہیں جس کے متعلق امکان ہو کہ اس کے کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی صورت میں برسر اقتدار آنے کے امکان ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک کرتے ہیں کہ الیکشن جب ہوتے ہیں وہ دونوں مخالف پارٹیوں کو پیسے دیتے ہیں تاکہ جو بھی پارٹی آئے ان کی مرہون منت ہو تو یہ ایک عام پالیسی کی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب میں پشاور میں تھا وہاں کے امریکن قونصلر کا نام Velletri

(ویلمٹری) تھا۔ وہ سی آئی اے کا اپریٹر تھا اور بہت ہی تیز آدمی تھا چلتا پُرزہ تھا۔ اس علاقے کے سب سیاسی لیڈروں سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس نے اچھے خاصے مراسم پیدا کر لیے تھے مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں کسی امریکن قونصلر کے ساتھ اپنے مراسم پیدا کروں لیکن ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا امریکنوں کی یہ ایک خاص صفت ہے کہ وہ بڑی جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ فری ہو جاتے ہیں بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کی طرح تکلف کے قائل نہیں کہ جب تک تعارف نہ کرایا جائے ہاتھ بھی نہ ملاؤ۔ امریکنوں میں ایسا رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا کھلے ڈلے آدمی ہوتے ہیں۔

بہرحال وہ آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ آیا تو اخلاقی طور سے مجھے بھی اس کے پاس جانا پڑا اس طرح سے راہ و رسم ہو گئی۔ اب جب انٹیلی جینس کے دو آدمی ملتے ہیں تو ہمارے ملک میں بڑی عجیب سی بات ہے احساس کمتری ہے حکومت کی انسٹرکشنز ہیں کہ سرکاری افسر جو ہیں یا انٹیلی جینس کے جو آدمی ہیں وہ دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندوں سے جن میں انٹیلی جینس کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی راہ و رسم نہ رکھیں یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے' کسی حد تک درست نہیں بھی۔ درست اس حد تک ہے کہ ہم میں سے ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو مغربی تہذیب' مغربی تمدن' مغربی طور طریقوں اور سفید چمڑی سے بڑے متاثر ہوتے ہیں چونکہ ان کی سوسائٹی میں عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں ہمارے تمدن میں عورتیں بڑی شرمیلی سی ہوتی ہیں، باپردہ ہوتی ہیں۔ مگر جب وہ ایسی سوسائٹی میں جاتے ہیں تو بڑی جلدی وہ ہوس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم میں سے بہت سے لوگ شراب کے عادی ہوتے ہیں اور سرکاری تنخواہ میں وہ شراب نہیں پی سکتے۔ اس کا اگر چسکا پڑ جائے تو وہ پھر اپنا ایمان بہت کم قیمت میں بیچنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے لوگوں کو ان اثرات سے یا اس ترغیب سے محفوظ رکھا جائے لیکن یہ سمجھ لینا کہ ہر آدمی اس ترغیب کا شکار ہو جائے گا' یہ غلط بات ہے بلکہ جب دو دماغ ملتے ہیں آپس میں باتیں کرتے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اتنے پھرتیلے ہیں کہ ہمیشہ وہ ہمیں ایکسپلائٹ کر سکتے ہیں اور وہی ہم سے انفارمیشن لے سکتے ہیں ہم بھی ان سے معلومات لے سکتے ہیں ہمیں بھی انکے ذہن کا پتہ چل سکتا ہے۔ ہمیں بھی ان کی نیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس لیے میں یہ بات مناسب نہیں سمجھتا کہ ایک عام پابندی لگا دی جائے کہ سرکاری افسر نہ ملیں' مجھے کوئی احساس کمتری نہیں تھا اور میں نے یہ دیکھا وہ میرا سب سے اچھا ذریعہ معلومات بنا۔

ایک تو ہمارے پاس سرکاری افسروں کے پاس اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ اتنی بڑی بڑی پارٹیز کر سکیں کہ شراب جہاں عام چلتی ہو نہ ہمارے پاس مراعات ہوتی ہیں نہ کسی لڑکے کو وظیفہ دے کے

امریکہ بھیج سکتے ہیں اس لیے ہم لوگ ان لوگوں پر اتنی آسانی سے کام نہیں کر سکتے جس آسانی سے سفید چمڑی کے امیر ملک کا نمائندہ ہمارے ملک میں رہتے ہوئے کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے میں نے دیکھا کہ ان کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ ہمارے لوگ بڑے کھلے دل کے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ باہر کے ملک کے لوگوں سے اپنی سیاست اس طرح سے ڈسکس کرتے ہیں گویا ہمارے ملک کے باشندے ہوں چونکہ ہمارے ملک میں سیاست پر اظہار رائے پر اتنی پابندی ہوتی ہے گھٹن ہوتی ہے میں اپنے لوگوں کو مطعون نہیں کرتا۔ اتنی گھٹن ہوتی ہے اور برسر اقتدار لوگوں کے ساتھ اتنی نفرت ہوتی ہے کہ وہ جان بوجھ کے سفارتی نمائندوں کے ساتھ اپنی گورنمنٹ کے خلاف باتیں کرتے ہیں تاکہ وہ ان کی باتیں اپنی گورنمنٹ تک پہنچائیں۔ وہ چونکہ امریکن تھا۔ اس کی سفید چمڑی تھی' اس کے پاس شراب کی فراوانی تھی خاطر تواضع کے لیے اس کے پاس کافی فنڈ تھے۔ اس نے اپنا حلقہ احباب کافی وسیع کر لیا تھا وہاں کا کوئی ایسا سرکردہ آدمی نہیں تھا یا ایسا سیاسی لیڈر نہیں تھا جس کو وہ ٹیلی فون کرے اور وہ پانچ منٹ میں یا دس منٹ میں اس کے پاس نہ پہنچ جائے۔

ولی خاں۔ قیوم خاں شیر پاؤ سب آتے تھے کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ وہ اس کے پاس نہیں گیا۔

ایک دفعہ شام کو وہ میرے پاس آیا کہنے لگا کہ اب جا کے میں نے اطمینان کا سانس لیا ہے' میں نے پوچھا کیا بات ہے کہنے لگا' اصغر خان کا بھائی تھا۔ افضل خاں' اس کو اس ملک سے نکال کے کابل پہنچانا تھا۔

جی ہاں۔ میں نے کہا کیوں؟ تو اس نے بتایا "وہ یہاں سے چھپ کے نکلنا چاہتا تھا تو میری ڈیوٹی لگی کہ میں اسے کسی طرح سے کابل پہنچاؤں۔ میں نے اس کا بندوبست کیا اور اب مجھے ٹیلی فون آیا کہ وہ کابل پہنچ گیا ہے" اس سے مجھے خیال آیا کہ اس قسم کا کوئی رشتہ تھا تو اس کو کابل پہنچایا اور پھر امریکہ پہنچایا اور وہاں اس کو سیٹل کیا' اس کے فرض منصبی میں شامل تھا۔ دوسرا یہ کہ جب میں پرائم منسٹر ہاؤس میں گیا تو وہاں جو انٹیلی جینس رپورٹیں آتی تھیں ان میں میں نے دیکھا کہ مشیر پیش امام کی تحریک استقلال کے سیکرٹری جنرل کی خاص طور سے امریکنوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں خصوصاً الیکشن سے پہلے اور پھر جب تحریک چلی۔ یہ مزید بات سامنے آئی کہ مشیر پیش امام کی کافی ملاقاتیں رہتی ہیں اور ویسے بھی مشیر پیش امام باہر چند ایک ملکوں میں انتخابات سے بالکل پہلے گئے بھی تھے۔ اس لیے یہ خیال تھا کہ امریکہ سے الیکشن کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ جو ایک بات مجھے مولانا احترام الحق تھانوی نے بتائی جس سے اس کی تصدیق ہوئی کہ اصغر خان ایک طرح سے امریکنوں کا مہرہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اگر کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت بحال ہو تو اس کو آگے لایا جائے۔

جب میرا آئی جی پنجاب سے تبادلہ ہوا تو تجویز یہ تھی کہ مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو لگایا جائے گا پھر شیخ اکرم نے کوشش کی اور ان کے دو بڑے سفارشی تھے ایک افضل سعید صاحب' دوسرے رفیع رضا' ان لوگوں نے بھٹو صاحب سے کہا اس وقت الیکشن آ رہے ہیں اس کا جانا ٹھیک نہیں ہوگا الیکشن کے بعد بھیج دیں چنانچہ وہ تجویز ختم ہوگئی پھر بھٹو صاحب نے مجھے اپنے سیکرٹریٹ میں لگا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھٹو صاحب کے سیکرٹریٹ میں جانا نہیں چاہتا تھا کہ اس سے آدمی خواہ مخواہ سیاست میں ملوث ہو جاتا ہے جبکہ میرا پروفیشنل کیریئر تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ یا تو مجھے ایمبیسیڈر بنا کے بھیج دیں یا کسی اور وزارت میں بھیج دیں۔ ٹورزم میں بھیج دیں لیکن بھٹو صاحب کے سامنے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی خود میں اپنے لیے کہنا نہیں چاہتا تھا تو بڑی مجبوری سے میں نے کام شروع کر دیا۔

وہاں میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں یہ جو روایت رہی ہے کہ ایک شخص آج کرسی پر ہے کل جیل میں ہے یہ کوئی مناسب بات نہیں دوسری بات میں نے یہ محسوس کی کہ بھٹو صاحب کے ساتھی آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ان کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کی پوزیشن ایک طرح سے کمزور ہو رہی ہے میں نے انہیں مشورہ دیا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ تھے اور جنہوں نے پارٹی بنانے میں آپ کی امداد کی وہی آپ کو چھوڑ کے جا رہے ہیں مثلاً خورشید حسن میر چلے گئے جے اے رحیم چلے گئے۔ رامے صاحب چلے گئے یہ بات مناسب نہیں' کہنے لگے' پھر؟ میں نے کہا ان سے صلح صفائی کی بات بھی ہو سکتی ہے آپ ان سے بات کریں' یہ لوگ واپس آ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تم جا کے بات کرو پہلے میں نے راجہ منور سے بات کی اس کے بعد میں کوٹ لکھپت جیل میں رامے صاحب سے ملنے گیا یہ ایک عجیب سی بات تھی کہاں میں ان کے پاس چیف منسٹر ہاؤس جایا کرتا تھا کہاں اب میں ان سے جیل میں ملنے جا رہا تھا اس سے ذہنی تکلیف ہوئی جب میں کوٹ لکھپت جیل جا رہا تھا جیل کی دیواروں پر لکھا تھا ''رامے مردہ باد'' ''فلاں کو رہا کروں'' یہ نعرے اس وقت کے لکھے ہوئے تھے جب رامے صاحب چیف منسٹر تھے۔ رامے صاحب اقتدار ختم کر کے خود جیل میں تھے لیکن دیواروں پر ان کے خلاف نعرے ابھی لکھے ہوئے تھے۔ بہرحال میں ان سے ملا کافی دیر بات ہوئی رامے صاحب نے کہا مولویوں سے میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔

کہنے لگے ابھی تک گنجائش ہے کہ بھٹو صاحب سے مفاہمت ہو سکے اب بھی میرے دل میں

ان کے خلاف بغض نہیں ہے لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ انہیں مجھے چھوڑنا پڑے گا۔ طے یہ ہوا کہ میں بھٹو صاحب سے بات کروں گا وہ راے صاحب کو رہا کر دیں گے پھر مفاہمت ہو جائیگی کہنے لگے میں پیپلز پارٹی میں واپس آنے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے میری عزت بحال ہونی چاہیے جس طرح بیگم بھٹو احمد رضا قصوری کے پاس گئی تھیں آخر کار میں چیف منسٹر رہا ہوں میرے پاس بیگم صاحبہ ہی آ جائیں تو میرے لیے راستہ بن جائے گا مجھے بہانہ مل جائے گا اگلے روز راے صاحب کے مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا میں نے بھٹو صاحب کو آ کے بتایا انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں چیف سیکرٹری سے کہتا ہوں ان کو سزا نہیں ہونی چاہیے فیصلے کے اگلے روز جب میں نے اخبار میں پڑھا تو راے صاحب کو تین سال کی سزا ہو گئی تھی مجھے پریشانی ہوئی کہ بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ چھوٹ جائے گا اسے تو تین سال سزا ہو گئی ہے میں نے بھٹو صاحب سے کہا یہ تو بڑی زیادتی ہوئی ہے میں آپ کے کہنے پر ان کے پاس گیا تھا ان سے میری بات چیت ہو گئی آپ کا فیصلہ پہنچا دیا اب میری کیا پوزیشن رہ گئی ہے۔

اصل میں ہوا یہ کہ اگلے روز راے صاحب کی عدالت میں پیشی تھی وہاں راجہ منور نے راے صاحب سے بات کی وہاں سی آئی ڈی کے لوگ تھے انہیں پتہ چل گیا کہ اس قسم کی بات ہے صادق قریشی کو خطرہ ہوا کہ اگر راے باہر آ گیا میری تو چیف منسٹری گئی اس نے نہ معلوم کس طرح سے بھٹو صاحب کو اپروچ کیا اور کس طرح سے کیس پیش کیا بجائے چھوٹنے کے راے صاحب کو تین سال سزا ہو گئی پتہ چلا کہ صادق قریشی نے بھٹو صاحب سے کہا کہ اگر آپ اس کو سزا دے کے معاف کریں گے تو زیادہ مشکور ہو گا لیکن یہ بڑی چالاکی کی بات تھی۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب بہت ہوشیار تھے وہ اس لحاظ سے بڑے سادہ تھے کہ لوگوں پر اعتبار کر لیتے تھے خاص طور سے اپنے ساتھیوں پر اور اس قسم کے وہ لوگ جو گڑ بڑ کرتے تھے اس کو وہ فوری طور سے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ معلوم نہیں صادق حسین قریشی نے کس انداز میں بات کی کہ بنی بنائی بات بگڑ گئی۔ جب راے صاحب کو سزا ہوئی تو راے صاحب کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ بھٹو صاحب کے متعلق ویسے ہی یہ بات مشہور تھی کہ ان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے لیکن جب ایسی بات ہو جاتی تھی تو لوگوں کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو جاتی تھی کہ اس آدمی کی زبان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے چنانچہ مجھے خود بھی اس بات پر بڑا صدمہ ہوا اور میں بڑا حیران بھی ہوا کہ اتنی ذمہ دار پوزیشن کے آدمی کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ راے صاحب اور بھی بھٹو صاحب کے مخالف ہو گئے کہ یہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔

صادق قریشی نے صرف اپنی خود غرضی کے لیے بھٹو صاحب سے وہ کام کروایا سیاسی طور سے بھٹو صاحب کو کافی دھچکا لگا اس لیے کہ راے ذہین آدمی تھا اور مسلم لیگ میں پیر پگاڑا اور اس قسم کے لوگ

وہ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے میرا اپنا خیال ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف سیاسی طور سے جو بھی سازش ہوئی اس میں راجہ منور اور حنیف رامے وغیرہ نے ضرور اپنا کردار ادا کیا ہو گا فوج میں جو بھٹو صاحب کے خلاف کام ہوا الیکشن کے دوران میں شروع ہو چکا تھا میری رپورٹوں کے مطابق احمدی جو فوج میں تھے انہوں نے خاص طور سے اور جو ینگ ایلیمنٹ (نوجوان عنصر) تھا' اس میں لوگوں نے بھٹو صاحب کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا' اس دوران میں راجہ منور کی کار سے ایک پمفلٹ بھی پکڑا گیا تھا جو وہ فوج میں تقسیم کرنا چاہتے تھے اس میں صرف فوجیوں کو ایڈریس تھا بھٹو صاحب کے خلاف ان کو اکسایا تھا مطلب یہ ہے کہ اس طرح سے لوگ آہستہ آہستہ بھٹو صاحب سے علیحدہ ہوتے رہے اور ان کے خلاف ہر طرف سے سازش پکنا شروع ہو گئی۔ وہ بھی گرفتار ہوئے۔ میں بھی گرفتار ہوا۔

اس کے بعد بھٹو صاحب کے خلاف قتل کیس بنا۔ مجھے پتہ چلا کہ رامے صاحب بھی ان کے خلاف ایک گواہ ہیں تین دن رامے صاحب ہائی کورٹ جاتے رہے لیکن ان کی گواہی نہیں ہوئی' شبہ ہوا کہ رامے صاحب دوسری طرف چلے گئے ہیں مطلب یہ کہ بھٹو صاحب کی طرف مل گئے ہیں حالانکہ رامے صاحب گواہی کے لیے تیار تھے بعد میں یہ مجھے ان کے بڑے عزیز دوست نے بتایا کہ رامے صاحب بھٹو صاحب کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار تھے' کیونکہ ضیاء الحق سے ان کی سودے بازی ہو گئی تھی کہ رامے صاحب کے خلاف انکوائریاں اور کرپشن (بدعنوانی) کے جو چارجز (الزامات) ہیں وہ واپس لے لیے جائیں گے چنانچہ وہ واپس لے لیے گئے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ نان پارٹی الیکشن (غیر جماعتی انتخابات) کی تجویز اصل میں رامے صاحب کی تجویز تھی اور یہی ضیاء الحق کے کہنے پر اس تجویز کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

میں 78ء میں جیل سے باہر آیا ان کے دل کا مجھے پتہ نہیں لیکن میں کسی کے بارے میں دل میں بات نہیں رکھتا تھا وہ جوان سے جھگڑا تھا وہ سرکاری جھگڑا تھا اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے میں ان سے ملا۔ اس وقت وائٹ پیپرز وغیرہ چھپ چکے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ کچھ مشورہ دے گا کیونکہ اس وقت رامے صاحب ایک پارٹی بنانے کی فکر میں تھے اور انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ راؤ صاحب کیا خیال ہے آپ کا' ایک پارٹی نہ بنائی جائے میں نے ان سے پوچھا آپ کی پارٹی کا منشور کیا ہو گا کہنے لگے میری پارٹی کا منشور وہی ہو گا جو بھٹو کا تھا۔ میں نے کہا رامے صاحب میں تو بات سچی کرتا ہوں ایک تو یہ کہ آپ کے متعلق لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ کا کوئی اصول نہیں' آپ کا کوئی عقیدہ نہیں کبھی آپ سرخ ہوتے ہیں کبھی آپ سبز ہوتے ہیں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ وہم ہے کہ آپ بہت قابل انسان ہیں اور جو بھٹو میں برائیاں ہیں وہ آپ میں نہیں اس بنا پر آپ اپنے آپ کو زیادہ اہل

سمجھتے ہیں نہ صرف پنجاب کی چیف منسٹری کے لیے بلکہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے لیے بھی۔ان کے حواری ان کو یہ ہی رائے دیتے تھے چنانچہ رامے کو بڑی سنجیدگی سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ اگر کوئی پاکستان میں پرائم منسٹر ہو سکتا ہے بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی تو وہ رامے صاحب خود ہیں۔ میں نے انہیں کہا رامے صاحب آپ کو یہ خیال ہے کہ آپ کو وزیر اعظم ہونا چاہیے۔ راستہ آپ کو نظر نہیں آتا کبھی آپ ادھر سے تلاش کرتے ہیں کبھی ادھر سے۔ کہنے لگے یہ تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے واقعی غلطی کی کہ مسلم لیگ میں چلا گیا میں نے انہیں کہا جہاں تک پروگرام کا تعلق ہے پارٹی پروگرام سے کبھی نہیں بنتی' پارٹی انسانوں سے بنتی ہے لیڈر سے بنتی ہے میں نے کہا بھٹو سے پہلے بھی پکے کیمونسٹ اس ملک میں موجود تھے' کیمونسٹ پارٹی بھی یہاں تھی' میجر اسحاق سوشلسٹ تھا۔ افضل بنگش بھی سوشلسٹ ہیں اور بھی بے شمار ہیں ان کا پروگرام بھی بڑا اچھا ہے لیکن اس پروگرام کی وجہ سے کسی پارٹی نے طاقت حاصل نہیں کی بھٹو صاحب آئے انہوں نے ایک نعرہ دیا تین چار سال میں کامیاب ہو گئے میں نے کہا جو آپ پروگرام دینا چاہتے ہیں اس پروگرام کی پہلے سے پارٹیاں یہاں موجود ہیں۔ خورشید حسن میر بھی ہے معراج محمد خاں بھی ہے۔ آپ بھی ان میں شامل ہو جائیں' آپ کا کیا خیال ہے کہ پارٹی بناتے ہی آپ بہت بڑی کامیابی حاصل کر لیں گے تو میں آپ کو مشورہ یہ دوں گا کہ آپ پارٹی نہ بنائیں اور یہ کہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو کے اس میں جان ڈالیں۔ لوگ پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا پھر انہوں نے اپنے ہاتھ سے فضا میں خطاطی شروع کر دی۔

جب ہم ان سے مل کے باہر نکلے تو میرا دوست کہنے لگا۔ نکما آدمی ہے اس کو غلطی کرنے دینی چاہیے' آپ کو اسے مشورہ دینے کی کیا ضرورت تھی اس کو کہتے کہ ضرور بنا' اس کو پتہ چل جاتا کہ کیا بھاؤ بکتی ہے۔ میں نے کہا اس نے مشورہ مانگا' میں نے ایمانداری سے دے دیا' چنانچہ وہ اناؤنس کرنے والے تھے لیکن کچھ دنوں کے لیے انہوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا لیکن آخر کار انہوں نے پارٹی بنائی ''مساوات پارٹی''۔

پھر آپ کو پتہ ہی ہے کہ جو پارٹی انہوں نے بنائی کتنی مضبوط پارٹی بنی اس میں کوئی شک نہیں کہ رامے صاحب بہت محنتی آدمی ہیں بھٹو صاحب کے بعد اگر سیاستدانوں میں سے کوئی واقعی محنت کرتا ہے تو وہ رامے صاحب ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہر چیز کی تہہ تک پہنچیں محنت کر کے اپنا کام کرتے ہیں دوسرے یہ کہ ان میں کیریکٹر کی کوئی خرابی نہیں نہ تماش بین ہیں لیکن ہیں بہت مصنوعی آدمی اس لحاظ سے کہ انسان میں جو ایک خلوص ہوتا ہے جو گرم جوشی ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہے ایک ہوتا ہے نا انسان کا دماغ' ایک ہوتا ہے دل' دل ان کا اس لحاظ سے کمزور ہے کہ اس میں خلوص اور محبت جیسے جذبوں کی کمی ہے

ہر چیز کو ان کے دماغ نے دبایا ہوا ہے مثلاً یہ کہ انہوں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ لوگ ان کے بارے میں مخلص بہت کم ہیں مثلاً کھر بھی رہا ہے اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ اب بھی اس کے ساتھ ہیں لیکن رائے صاحب چیف منسٹر رہے لوگوں کو بہت نوازا لیکن اپنا گروپ اپنے دوست نہیں بنا سکتے' یہاں تک کہ کمانڈر سجاد کو بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے خود ان میں خلوص کی بڑی کمی ہے اگر آپ ان سے ملنے جائیں گے تو پہلے سے وہ سوچ کے آئیں گے کہ کس طرح سے کمرے میں داخل ہونا ہے کتنے قدم آگے بڑھنا ہے کتنا ہاتھ آگے بڑھانا ہے کتنا اس ہاتھ کو دبانا ہے مطلب' ہر چیز کا وہ حساب رکھتے ہیں اس لیے ان کے لیے لوگوں میں محبت یا وفاداری پیدا نہیں ہو سکی اور پھر یہ کہ طاقت کا یا اقتدار کا نشہ ان پر اتنا سوار ہے کہ ہر اصول کو قربان کر دیتے ہیں۔ موقع پرست بن جاتے ہیں اس لیے انہوں نے ابھی تک سیاست میں اس قابلیت کا ہونے کے باوجود اپنا مقام پیدا نہیں کیا اب بھٹو صاحب کے بعد کس طرح سے انہوں نے اپنے کیس ختم کرائے ضیاء الحق سے ساز باز کی کبھی وہ ان کا ترجمان بن رہے ہیں۔ اندرونی کچھ ہوتے ہیں' بیرونی وہ کچھ تاثر دیتے ہیں اس لحاظ سے میرا اپنا خیال ہے وہ کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

ایک چیز جس پر میں حیران ہوا وہ یہ کہ برادری کا چکر اس قسم کے دانشور اور پڑھے لکھے آدمی میں نہیں ہوتا لیکن انہوں نے پنجاب میں بڑا زبردست آرائیں ازم پھیلایا۔

یہ صرف ان کے خلاف لوگوں کے الزام ہی نہیں تھے بلکہ اس میں بہت حد تک سچائی تھی۔

جب وزیر اعلیٰ تھے یہ ان کی بڑی کمزوری تھی اس پر بڑا لطیفہ بھی ہوا اور وہ یہ کہ جب ان کے خلاف بات شروع ہو گئی بھٹو صاحب ملتان میں دورے پر تھے وہاں ان کا خیال تھا کہ لوگ اوپن کچہری میں ان پر یہ الزام لگائیں گے اس لیے کہ پنجاب کے سولہ میں سے گیارہ اضلاع میں انہوں نے ارائیں ڈی سی لگائے ہوئے تھے اور یہ رائے جیسے پڑھے لکھے آدمی نے کیا تھا۔

بھٹو صاحب نے صبح نو بجے اوپن کچہری میں آنا تھا اس سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایسا ویسا آدمی وہاں موجود نہ ہو سیکورٹی پولیس کا کام ہوتا ہے کہ لوگوں کو چیک کرے۔ میں نے دیکھا کہ جدھر سے بھٹو صاحب نے گزرنا تھا وائٹ ہاؤس کے دروازے سے نکل کے پنڈال کی طرف جانا تھا وہاں کچھ لوگ کھڑے ہیں میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جواب ملا انجمن راجپوتاں کا وفد بھٹو صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ پروگرام تو اس قسم کا کوئی نہیں تھا کہ انجمن راجپوتاں بھی کوئی ہے اور یہ کہ اس کے کسی وفد نے ملنا ہے میں نے کہا کہ یہ تو پروگرام میں نہیں ہے پتہ یہ لگا کہ جب رائے صاحب کو خیال یہ ہوا کہ لوگ ان کے خلاف الزام لگائیں گے کہ یہ ارائیں ازم کرتا ہے تو انہوں نے انجمن راجپوتاں کا ایک وفد تیار کر کے بھٹو صاحب سے وقت مقرر کر لیا تا کہ وہ کہہ سکیں کہ میں تو ارائیں ازم نہیں کرتا یہ تو اور برادریاں ہیں جو اس

میں مصروف ہیں ان کا ذہن اس قسم کی چیزوں میں سازشوں میں چلتا تھا حالانکہ پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن بڑا مضحکہ خیز انداز تھا اس قسم کی چیزیں چھوٹے لیول کے سیاستدان ہی کرتے ہیں جوڑ توڑ بڑے معمولی قسم کے۔ چنانچہ رائے صاحب نے بھٹو صاحب کو یہ بتانے کے لیے کہ میں برادری ازم نہیں کرتا فنافٹ انجمن راجپوتاں کا وفد تیار کیا کہ اور برادریاں اس میں پیش پیش ہیں اتفاق سے میں بھی راجپوت ہوں حالانکہ میں نے اپنی سروس میں کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا مجھے اس وفد میں ایسی کوئی شکل نظر نہیں آئی جو راجپوت ہو۔

بہر حال اب (20 جنوری 81ء) رائے صاحب امریکہ جا کے بیٹھے ہوئے ہیں وہاں انہوں نے سنا ہے پٹرول پمپ وغیرہ بھی خرید لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ جا کے وہ اس لیے بیٹھے ہیں کہ ان کو بلکہ ہمارے سیاستدانوں کو جائز یا ناجائز صحیح یا غلط خیال یہ ہے کہ جب تک امریکہ کی کسی کی پشت پہ نہ ہو وہ اقتدار میں نہیں آ سکتا چنانچہ ہمارے ہر سیاستدانوں کی امریکہ سے ساز باز ہوتی ہے اگر نہ بھی ہو یہ تاثر ضرور دیتے ہیں کہ ان کی ساز باز ہے چنانچہ کھر صاحب نے بھی ڈرامہ کیا تھا اپنے مکان سے چھلانگ لگا کے کسی اور کے مکان میں گئے وہاں سے امریکی سفیر کو ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی یہ بتانے کے لیے کہ امریکہ ان کی پشت پہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ رائے صاحب بھی یہ تاثر دینا چاہتے ہیں۔

میں نے تو اس کی انکوائری نہیں کی کہ انہوں نے پیسے بنائے یا نہیں بنائے لیکن بہر حال جن لوگوں نے انکوائریاں کی ہیں ان کی زبانی میں بتا سکتا ہوں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنی چیف منسٹری کے دوران پیسے بنائے ہیں اور اسی چیز سے جان چھڑانے کے لیے انہوں نے ضیاء الحق سے ساز باز کی پھر اس کے مشیر بنے اور چونکہ وہ ان کی برادری کے بھی ہیں اس لیے ان کے لیے آسان بھی ہو گیا تھا میں نہیں سمجھتا کہ رائے صاحب کے پاس اتنے پیسے تھے اگر واقعی انہوں نے پٹرول پمپ خریدا ہے امریکہ میں تو پھر یہ کہ وہ کہاں سے پیسہ مہیا کر سکتے تھے اس سلسلے میں پھر ایک اور بات ہے کہ یہاں ایک امریکی سفیر ہوتا تھا سی آئی اے کا آدمی تھا یحییٰ خان کے زمانے میں اس کا نام تھا فارلینڈ۔

فارلینڈ بھی 77ء میں جب الیکشنوں کی ہلچل تھی پاکستان آیا تھا اس وقت رائے جیل میں تھے۔ اتنا مجھے پتہ چلا کہ فارلینڈ نے رائے کے گھر فون کر کے بیگم رائے سے بات چیت کی مطلب یہ کہ رائے اس وقت جب کہ فارلینڈ یہاں تھا اس لیول کا لیڈر نہیں تھا کہ فارلینڈ سے اس کی کوئی راہ و رسم ہوتی تو یہ ضرور کوئی بعد کی ڈویلپمنٹ ہے۔

پھر جب میں روزنامہ مساوات میں آیا تو اس سے پہلے لاہور سے ایک اخبار نکلتا تھا صحافت جس کے نمائندے نے میری بیگم سے انٹرویو لیا تھا اور اس میں رائے صاحب کے متعلق بھی کچھ انہوں

نے سوال پوچھے تو ہماری بیگم حالانکہ انہی کی برادری سے ہیں لیکن انہوں نے راے کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے سوال یہ تھا کہ "راے صاحب کہتے ہیں کہ دو بیگم بھٹو اور بینظیر کس طرح سے پاکستان کی قیادت کو سنبھال سکتی ہیں۔" اس پر میری بیگم نے یہ کہہ دیا کہ راے صاحب کی پارٹی کو تو خود لوگ مسمات پارٹی کہتے ہیں اسی پر راے صاحب بڑے ناراض ہوئے۔

دوسرے یہ کہ جب میں 'مساوات' میں گیا تو راے صاحب نے یہ بیان دیا تھا کہ اس ملک میں تین پارٹیاں ہیں ایک پیپلز پارٹی ایک پیپلز پارٹی کے مخالف لوگ اور ایک فوج ہے' ان تینوں میں کوئی مصالحت ہونی چاہیے یہ بھٹو صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد کا قصہ ہے اس پر مساوات میں میں نے اداریہ لکھا تھا کہ راے صاحب کا یہ غلط خیال ہے کہ پاکستان میں تین پارٹیاں ہیں پاکستان میں دو ہی پارٹیاں ہیں ایک وہ جو پاکستان کی حامی ہیں اور ایک وہ جو پاکستان کی مخالف ہیں۔

جو پاکستان کی مخالف ہیں راے صاحب ان کے ساتھ کھڑے ہیں یہ کہنا کہ فوج ایک پارٹی ہے یہ کسی سیاستدان کو زیب نہیں دیتا پھر راے صاحب بڑے چیں بہ جبیں ہوئے اور انہوں نے حیات میں اپنے قلم سے صفحہ اول پر اداریہ لکھا۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت پر نوکر شاہی کے سابقہ لوگ مسلط ہو گئے ہیں۔ جن میں کوئی جرنیل ہے کوئی سرکاری افسر ہے ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

❖

پرائم منسٹر ہاؤس

بھٹو نے جب مجھے پرائم منسٹر ہاؤس لگایا میری ڈیوٹی کا تعین نہیں تھا کہ میرے ذمے کیا کام ہے جب آپ ایسی جگہ پر چلے جاتے ہیں خاص طور سے جب آپ کا انٹیلی جنیس سے تعلق ہو تو سیاست اور انٹیلی جنیس میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے اس لیے کہ اندرونی انٹیلی جنیس ساری کی ساری سیاست ہے اس میں آپ کو سیاسی لیڈروں پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔ ان کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے پڑتے ہیں ان کی سوچ معلوم کرنی پڑتی ہے جو پلاننگ وہ کرتے ہیں اس پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔

مطلب یہ کہ اندرونی انٹیلی جنیس ایک طرح سے سیاست ہے اس لیے جب تک انسان کو سیاست پر عبور نہ ہو سوجھ بوجھ نہ ہو وہ انٹیلی جنیس میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس کے تعلقات وسیع ہوں۔ روابط ہوں اس کو صحیح خبریں ملتی رہیں اس لحاظ سے اس کو سیاست دانوں سے بھی ملنا پڑتا ہے۔

سب سے اہم کام وہاں نیشنل انٹیلی جنیس بورڈ کا تھا جو بھٹو صاحب نے تشکیل دیا تھا مختلف انٹیلی جنیس ایجنسیوں، انٹیلی جنیس بیورو اور سپیشل برانچ کی ڈائریاں اور ان کی رپورٹیں ہمارے پاس پہنچتیں ہم تقریباً ہر مہینے میٹنگ کرتے تھے اندرونی اور بیرونی انٹیلی جنیس کو صحیح طور سے پیش کر کے رائے دیتے، کیا اندرونی خطرات ہیں کیا بیرونی خطرات ہیں کیا اندرونی حالات ہیں پھر یہ کہ ان انٹیلی جنیس ایجنسیوں پر نگاہ رکھی جائے کہ کس مسئلے کے متعلق کیا قدم اٹھایا جائے۔

بھٹو صاحب خود اس کے چیئرمین تھے اس میں چند ایک منسٹرز تھے مثلاً خان قیوم، حفیظ پیرزادہ، رفیع رضا، اس کے علاوہ تمام انٹیلی جنیس ایجنسیوں مثلاً آئی ایس آئی، انٹیلی جنیس بیورو کے ڈائریکٹر اس کے ممبر تھے میں اس کا سیکرٹری تھا سب انٹیلی جنیس رپورٹیں اور ڈائریاں میرے پاس آتی تھیں۔ میں ان کا نچوڑ بھٹو صاحب کو لکھ کر بھیجتا تھا۔

پرائم منسٹر ہاؤس کی سیکورٹی بھی میرے ذمہ تھی۔ اس کا سٹاف سلیکٹ کرنا، کمی بیشی نظر آئے تو

اس کو دیکھنا میری جاب کچھ ایسی تھی جو بھٹو صاحب نے صرف میرے لیے کریٹ (Creat) کی تھی۔ چونکہ مجھے وہ ڈائریکٹر انٹیلی جینس نہیں لگا سکے تھے اس لیے انہوں نے مجھے استعمال کرنے کے لیے میرے لیے جاب پیدا کی جس میں ڈیوٹی کا تعین نہیں تھا جو کام انہوں نے مناسب سمجھا میرے سپرد کر دیا لیکن جو ایشو بھٹو صاحب کے ذہن میں تھا اور جس کے بارے میں ہر وقت وہ سوچتے رہتے تھے۔ وہ تھا الیکشن۔ ظاہر ہے سیاسی لیڈر تھے جمہوری وزیراعظم تھے سب سے اہم بات یہ تھی کہ دوبارہ کس طرح جیتا جائے۔ انہوں نے مجھے کہا' تم خاص طور سے پنجاب کے متعلق مجھے نوٹ بنا کے دو کہ الیکشن کے متعلق کیا سوچ ہے میں نے ان کو وہ نوٹ بنا کے دیا وہ اس نوٹ سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ انہوں نے رفیع رضا کو اور باقی لوگوں کو بھی دکھایا پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ الیکشن کے متعلق سارا کام آہستہ آہستہ میرے کندھوں پر ڈالتے جا رہے ہیں انہوں نے مجھے کہا بھی' بات یہ ہے' الیکشن جیتنا ہے' ظاہر ہے میری حکومت کے لیے یہ سب سے اہم کام ہے الیکشن سیل کا میں آپ کو چارج دینا چاہتا ہوں۔

ساری حکومتی مشینری ایک طرح سے الیکشن پر لگی ہوئی تھی جمہوری گورنمنٹ کا یہی ہوتا ہے کہ ہر وزارت کو بتانا پڑتا ہے کہ انہوں نے پانچ سال میں کیا کیا اور آئندہ کیا کریں گے اس لحاظ سے جتنی بھی رپورٹیں آرہی تھیں وہ الیکشن کے متعلق تھیں اور میرا اپنا وقت بھی اسی میں صرف ہوتا تھا۔

لیکن میں وہاں ایک طرح سے نیا تھا آپ کسی محفل میں جائیں یا کسی نئی جگہ پر جائیں تو ہر آدمی آپ کو رزسٹ کرے گا اندر گھسنے سے روکے گا اس کی مثال اس طرح سے ہے۔ ریل کا ڈبہ ہے جیسا ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ بڑا رش ہوتا ہے جو باہر سے آتے ہیں۔ اندر والے ان کو روکتے ہیں پرائم منسٹر ہاؤس کا حال یہی تھا جو اندر پہنچے ہوئے تھے ان کی کوشش تھی کہ باہر سے کوئی نہ آئے میں نے دنیا دیکھی تھی تیس پینتیس سال کی نوکری تھی میں نے پورے پاکستان کی خاک چھانی تھی بلوچستان میں بھی رہا تھا آزاد کشمیر میں بھی رہا تھا ہر قسم کے حالات سے واقف رہا تھا۔ ان چیزوں سے میں گھبرانے والا نہیں تھا میں 22 ویں گریڈ کا سیکرٹری تھا۔ افضل سعید بھی 22 ویں گریڈ کے سیکرٹری تھے میرے جانے سے چونکہ ان کی معتبری میں فرق پڑتا تھا ان کی اجارہ داری میں فرق پڑتا تھا اس لیے وہ ناخوش تھے انہوں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ کسی طرح سے مجھے چھوٹا سا دفتر دے دیا جائے' جہاں کوئی پرانی میز کرسی پڑی ہوتا کہ پتہ چلے کہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

بالآخر انسان کا کام' اس کا کردار اس کی اہمیت بناتا ہے میرے جانے سے جو امپارٹنٹ (اہم) فائلیں تھیں جو انٹیلی جینس کی فائلیں تھیں جہاں اصلی خبریں ہوا کرتی تھیں وہ افضل سعید کے پاس سے ہو کے آنی شروع ہو گئیں میرا ہمیشہ یہ ذہن رہا ہے کہ آدمی کام اتنا کرے جتنی اس سے توقع ہو یا جو

اس پر فرض بنتا ہو اپنے فرض سے زیادہ پاٹے خانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا مثلاً بھٹو صاحب کی عادت تھی کہ سارا سارا دن کام کرتے تھے بغیر کھائے پیئے کام کرتے رہتے تھے ان کے ساتھ رہ کے انسان کا اپنا وقت نہیں رہتا تھا اس لیے میں کوشش کرتا تھا کہ اتنا دُور رہ کے اپنا کام کروں کہ اپنا روٹین بھی رہے مثلاً یہ کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں میں چلا گیا کھانا کھایا اور سو گیا جو میرا روٹین تھا میں نے ہر میٹنگ میں ٹانگ پھنسانے کی کوشش نہیں کی اگر انہوں نے نہیں بلایا تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خواہ مخواہ وہاں جا کے اپنا وقت ضائع کروں' میں شام کو سیر کرتا تھا گھوڑ سواری کرتا تھا اس کے برعکس افضل سعید صاحب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہر فائل وہ ضرور دیکھیں اور ہر میٹنگ میں چاہے ان کی ضرورت ہے یا نہیں ہے' وہ ضرور ہوتے تھے مثلاً یہ کہ نیشنل انٹیلی جینس بورڈ کے وہ ممبر نہیں تھے وقار بھی ممبر نہیں تھے اس کی پہلی میٹنگ ہوئی تو جو ممبر نہیں تھے' ان کو نہیں بلایا گیا اگلی میٹنگ سے پہلے افضل سعید صاحب نے مجھے فون کیا میں ممبر تو نہیں ہوں اگر میں اس میٹنگ میں آ جاؤں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں میں نے کہا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو آ جائیں چنانچہ وہ اس میٹنگ میں باقاعدہ طور سے شریک ہوئے' پھر اسی طرح سے انٹیلی جینس کی فائلیں ان کی معرفت جانے لگی تو انہوں نے مجھے کہا کہ بات یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی آدمی ایسا ہونا چاہیے جسے ساری فائلوں کا پتہ ہو۔ کدھر جاتے ہیں کدھر نہیں جاتے ہیں چلو یہ ٹھیک ہے کہ جب فائل آپ بھٹو صاحب کو بھیجتے ہیں تو میرے تھرو (ذریعے) نہ جائیں لیکن واپس آتے ہیں تو میرے تھرو آئیں اس پر میں یہ سمجھا کہ شائد وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو بھی انفارمیشن پرائم منسٹر کے پاس ہو اس میں سے کوئی انفارمیشن ایسی نہ ہو جو کہ ان کو معلوم نہ ہو کیا مقصد ہو سکتا تھا اور کس وجہ سے وہ یہ کرتے تھے اس کا میرے پاس کوئی صریح حوالہ تو نہیں لیکن جب بھٹو صاحب کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ ایک فائل جو صرف بھٹو صاحب نے میں نے اور افضل سعید نے دیکھی تھی اس کی خبر اخبارات میں آ گئی۔

وہ خبر اخبار میں آئی تو میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ یہ بات اخبارات میں آئی ہے یہ فائل میں نے دیکھا ہے آپ کو میں نے دکھایا' افضل سعید نے دیکھا پھر یہ خبر کیسے اخبار میں آئی۔ پتہ چلا کہ افضل سعید صاحب مولانا مودودی کے رشتے داروں میں سے ہیں اور شاید مولانا مودودی کی بیگم کی افضل سعید صاحب کی بیگم سے بڑی قریب کی رشتے داری ہے یہ بھی پتہ چلا کہ ان لوگوں کی اصغر خان کی بیوی سے بھی رشتے داری ہے۔ یہ سب بھٹو صاحب کے خلاف ایجی ٹیشن میں پیش پیش تھے۔ آپس میں ان لوگوں کا بڑا قریبی تعلق تھا لیکن بغیر کسی شہادت کے کسی کے خلاف کوئی بات کہنا زیادتی کی بات ہوتی ہے اور اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ افضل سعید نے بھٹو صاحب سے کوئی غداری کی ہو یا ان کی خبریں باہر دیتے

تھے تیسری بات یہ کہ شعیب جو سی آئی اے کا مسلمہ ایجنٹ تھا افضل سعید اس کے جائنٹ سیکرٹری رہے تھے۔ شعیب جو ایوب خان کے فنانس منسٹر تھے اور بھٹو صاحب کے بہت مخالف تھے۔

اس سے دو چیزیں ثابت تھیں ایک تو بھٹو صاحب کی فراخدلی کہ اس کے باوجود انہوں نے افضل سعید کو نہ صرف وہاں رکھا بلکہ اس پر بڑا اعتماد کیا اور دوسری طرف افضل سعید صاحب کی یہ کوشش کہ ہر بات کا اسے پتہ ہو، ہر فائل اس سے مارک ہو کے جائے ہر میٹنگ وہ اٹنڈ کرے اور اس کے بعد انکوائری میں پھر ان کا جو کردار رہا انہوں نے بھٹو صاحب پر جو الزام لگایا کہ ابوظہبی سے شیخ النہیان الیکشن کے لیے بھٹو صاحب کو حسن عابدی کے ذریعے پیسے بھیجتے تھے۔ یہ انہوں نے فوج کے سامنے بیان دیا جب ہم سب کی انکوائریاں ہو رہی تھیں ہم سب کو فوج نے نظر بندی میں رکھا ہوا تھا تعجب کی بات یہ ہے کہ بھٹو صاحب کے سب سے قریب جو انسان تھے وہ افضل سعید تھے سب سے زیادہ انفارمیشن بھی انہی کے پاس ہونی چاہیے تھی لیکن فوجی حکومت نے جب پکڑا تو بھٹو صاحب کے علاوہ ہم چار آدمیوں کو پکڑا' وقار احمد' مسعود محمود' اکرم شیخ اور میں افضل سعید کو نہیں پکڑا گیا۔

ہمیں مارشل لا لگنے سے پہلے پکڑ لیا مجھے مارشل لا کا پتہ اس طرح سے لگا کہ میں اپنے گھر سو رہا تھا۔ رات کے بارہ بجے فوجی پہنچ گئے سب سے پہلے مجھے پکڑ کے لے گئے افضل سعید کو انہوں نے نہیں پکڑا بلکہ وہ دفتر بھی جاتے رہے اور جنرل ضیاء الحق سے وہ ملتے بھی رہے۔

❖

افضل سعید

ضیاء الحق نے ان سے وعدہ بھی کیا کہ میں تمہیں کہیں لگا دوں گا پھر ضیاء سے پوچھ کے وہ کراچی گئے جب کراچی سے واپس آئے تو انہیں پکڑا گیا کہیں اگست کے مہینے میں مارشل لا لگنے کے قریب قریب ایک ماہ بعد ضیاء الحق ان کو پکڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ اپنا خاص تعلق ظاہر بھی نہیں کر سکتے تھے اس وقت تو ایک گروپ جنرلوں کا تھا، اب تو ضیاء الحق بادشاہ ہو گئے ہیں باقی جو تھے انہیں ایک ایک کر کے ادھر ادھر کر دیا اس وقت ایک گروپ تھا اور اس گروپ میں چشتی قسم کے لوگ زیادہ اہم تھے جنرل ضیاء الحق پر جو اصل پریشر پڑا کہ افضل سعید کو گرفتار کیا جائے وہ فوج کی طرف سے پڑا۔ تب ان کو پکڑا گیا ورنہ میرا خیال ہے جو ضیاء الحق اور مولانا مودودی کا تعلق بنتا تھا اس لحاظ سے افضل سعید کو نہ پکڑا جاتا پھر ضیاء الحق اس کی جو امداد کر سکتے تھے وہ اس نے کی مجھے تو ڈسمس کیا اور افضل سعید کو صرف ریٹائر کیا حالانکہ میں بھٹو صاحب کے ساتھ صرف ایک ہی سال رہا۔ افضل سعید تو کرتا دھرتا تھے۔ بہر حال ان کو ریٹائر کیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ ان کو باہر جانے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔

میں پرائم منسٹر ہاؤس میں پہنچا تو بڑی مشکلات پیش آئیں۔ مشکلات ہمیشہ ایسے حالات میں پیش آتی ہیں آہستہ آہستہ میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب نے مجھ پہ کافی اعتماد کرنا شروع کر دیا جو بھی بات ہوتی تھی اس میں وہ میری رائے ضرور لیتے تھے خاص طور سے انٹیلی جینس اور سیاست کے معاملات میں اس لیے کہ میں ڈرتا نہیں تھا جو صاف بات ہوتی تھی جو بھی بات ہوتی تھی وہ میں کر دیتا تھا ایسا بھی ہوا کہ کبھی کبھی میں میٹنگ میں نہیں ہوتا تھا کوئی مسئلہ پیش آ گیا اور لوگوں نے ان کو مشورے دیئے لیکن مجھے وہ خاص طور سے پوچھتے تھے۔ "راؤ تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے" وہ کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ مجھے ہمیشہ اچھی خبر سناتے ہیں مطلب یہ کہ تصویر کا اچھا رخ پیش کرتے ہیں، تم جو مایوس کن رخ ہوتا ہے وہ پیش کرتے ہو میں تم سے اس لیے پوچھتا ہوں کہ تم بتاؤ یہ جو اور لوگوں نے رخ دکھایا ہے تمہارا کیا خیال ہے۔ عام خیال یہ

ہے کہ بھٹو صاحب بات نہیں مانتے تھے۔ میرا تجربہ اس سے کہیں مختلف ہے یہ زبانی کلامی باتیں نہیں ہیں۔ وہائٹ پیپر جو اس گورنمنٹ نے چھاپا ہے آپ وہ کہانی پڑھیں تو اس میں میرے نوٹس دیکھیں گے جو بات جو تنقید بھٹو صاحب کے متعلق، ان کی گورنمنٹ کے متعلق، ان کی پارٹی کے متعلق میں نے کی ان کے بڑے بڑے کارکن جرأت نہیں کرتے تھے۔ بڑے بڑے وزیر جس صاف گوئی سے میں نے ان کے متعلق لکھا میرا تو خیال ہے کہ بھٹو صاحب کیا کوئی اور حلیم الطبع بھی اگر ہوتا تو اس کے لیے وہ تنقید اور صاف گوئی برداشت کرنا مشکل ہوتا۔ پیپلز پارٹی کے خلاف کرپشن کی شکایت ان کی بدکرداری کی شکایت، جن لوگوں نے پیسے بنائے جو غنڈہ گردی کرتے تھے میں نے اس پر تنقید کرنے اور صاف گوئی سے کام لینے میں کبھی تامل محسوس نہیں کیا اور انہوں نے بھی کبھی نہیں کہا کہ تم اس قسم کی باتیں کیوں لکھتے ہو۔ وہ یہ کر سکتے تھے کہ یا تو مجھے وہاں سے تبدیل کر دیتے، یا کسی بات پہ بلا کے مجھے ایسا ڈانٹتے کہ پھر کبھی ایسی بات کرنے کی مجھے ہمت نہ پڑتی، لیکن میں نے یہ کبھی بھی محسوس نہیں کیا کہ وہ ایک صحیح بات کو سننا ناپسند کرتے ہوں بلکہ مجھے یاد ہے اس سے پہلے بھی جب میں آئی جی سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ تھا کیبنٹ کی ایک میٹنگ تھی کہ ''کرپشن کو کیسے روکا جائے'' اس پر میں نے ایک نوٹ لکھا کہ کرپشن اوپر سے نیچے آتی ہے اگر بادشاہ ایک سیب توڑے گا تو رعایا باغ اجاڑ دے گی میں نے کہا پریذیڈنٹ، پرائم منسٹر، منسٹرز اپنا کردار ٹھیک کریں جب خود ان کے متعلق شکایات ہوں کہ بے ایمان ہیں اور وہ خود کرپشن روکنے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر کس طرح سے کرپشن رک سکتی ہے جب میں نے نوٹ لکھا تو میرے ایک ڈی آئی جی نے کہا آپ کو نوکری نہیں چاہیے یہ نوٹ پڑھنے کے بعد وہ آپ کو اس پوسٹ پر کیسے رکھیں گے؟

میں نے کہا بات صاف کرنی چاہیے میں تو یہ باتیں لکھوں گا قیوم خاں صاحب متعلقہ وزیر ہیں یہ ان کا کام ہے کہ دیکھیں اس نوٹ کو آگے بھیجنا ہے کہ نہیں بھیجنا لیکن خان صاحب نے ایک لفظ تبدیل کیے بغیر وہ نوٹ منسٹری کی طرف سے بنا کے گورنمنٹ کو بھیج دیا۔ اس نوٹ کے دو حصے تھے ایک سرکاری افسروں کے متعلق تھا ایک سیاستدانوں کے متعلق تھا سیکرٹری داخلہ بریگیڈئر مظفر تھے جو حصہ سرکاری افسروں کے متعلق تھا وہ تو انہوں نے پڑھا لیکن سیاست دانوں پر آ کے وہ رک گئے۔ بریگیڈئر مظفر خود ہی بتاتے تھے۔ پیرزادہ نے مجھے کہا کہ اس نوٹ میں ہمارے متعلق بھی باتیں لکھی ہوئی ہیں لیکن یہ باتیں جائز ہیں اس لیے اس ضمن میں جو تجویزیں ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔

وہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ صاف گوئی بھٹو صاحب کے دور میں حرام نہیں اور میرا اپنا خیال ہے کہ اس سچائی کی وجہ سے ہی بھٹو صاحب میری رائے پوچھتے تھے۔

سرکاری افسر جو کچھ اپنے دفتر میں کرتے ہیں کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اچھا افسر ہے یا بُرا افسر

ہے کام کیسا کیا ہے کیسا نہیں کیا ہے سوائے اس کے کہ جو عام لوگ تذکرہ کرتے ہیں لیکن ضیاء گورنمنٹ نے ایک مہربانی ضرور کی حالانکہ ملک کے ساتھ بڑی زیادتی کی لیکن افسروں کے ساتھ مہربانی یہ کی ہے کہ ان کا سارا کچا چٹھہ وہائٹ پیپرز میں نکال کے رکھ دیا ہے اس میں بیشمار میرے لکھے ہوئے نوٹس ہیں تو اس لیے مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ میں نے اچھا کیا یا بُرا کیا لوگ خود جج کر سکتے ہیں کہ جو کچھ میں نے لکھا اس میں کتنا فریب تھا یا کتنی منافقت تھی یا کتنی خوشامد تھی میں تو یہی کہوں گا کہ بھٹو پر جو الزام تھا کہ وہ تنقید برداشت نہیں کرتے تھے۔ غلط تھا بہت لوگوں نے مجھے کہا کہ نوٹس سے وہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اس لیے کہ جس قسم کی تنقید انہوں نے تمہاری برداشت کی ہے اسے تو عام آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

مجھ سے انہوں نے کبھی کوئی بدکلامی نہیں کی کوئی بدتمیزی میرے ساتھ نہیں کی بلکہ ان کی شخصیت اتنی جاذب نظر تھی اتنا اس میں سحر تھا کہ کوئی آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مثلاً کوئی بھی ان سے ملنے آتا تو ہمیشہ کھڑے ہو کر ملتے۔ ہمیشہ کوئی بھی چاہے کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو وہ اس سے اٹھ کے ملتے تھے اول تو مرحوم کی شخصیت میں جاذبیت بہت تھی ان کے طور طریقے ان کی بول چال کا انداز۔ ان کے ملنے کا طریقہ ایسا تھا کہ کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ساتھ ان کے خاص مراسم ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ ہر آدمی کو یاد رہتا تھا کہ بھٹو صاحب نے اس سے یہ کہا یا کوئی ایسی بات کی تھی جس سے اس کی ذات کا تعلق تھا وہ ہر شخص کو ایسی اہمیت دیتے تھے کہ وہ شخص سمجھتا تھا کہ وزیراعظم ہو کے انہوں نے اسے اتنی اہمیت دی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے ان کا مداح ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جس سے بھی بات کریں گے۔ لاکھوں لوگ ہوں گے جن کو کوئی نہ کوئی اپنا ذاتی تعلق یا ذاتی قصہ یا ذاتی واقعہ ایسا یاد ہو گا جی بھٹو صاحب وہاں آئے تو انہوں نے میرے ساتھ یہ رویہ اپنایا۔ مثلاً مجھے یاد ہے ایک دفعہ لاہور آئے ہوئے تھے عبداللہ ملک ایئرپورٹ پر تھے ان کے پرانے دوست تھے عبداللہ ملک ہمیشہ ہیٹ پہنتے تھے بھٹو صاحب نے ان کا ہیٹ ان کے سر سے اتارا اور اپنے سر پر رکھ لیا اس سے انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ پرائم منسٹر ہو کے پرانے تعلقات کو پرانی واقفیت کو بھولے نہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں پرائم منسٹر ہاؤس پہنچا میرا ان سے پہلا انٹرویو تھا تو اس میں میں نے ان سے کہا مجھے معلوم ہے کہ آپ کو مجبوراً میرا تبادلہ کرنا پڑا کہ صادق قریشی ذاتی طور سے میرا مخالف ہو گیا تھا اس کی کوشش یہ تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح سے ذلیل ہو کے پنجاب سے نکلوں لیکن آپ نے مہربانی کی ہے کہ وہاں سے مجھے ٹرانسفر تو ضرور کیا ہے لیکن مجھے پروموٹ کر کے دنیا کو بتانے کے لیے کہ میں نے وہاں جو کام کیا ہے اس کو آپ نے تسلیم کیا ہے پھر آپ نے یہ کیا کہ مجھے اپنے سٹاف میں رکھا ہے۔ اپنے

ساتھ رکھا ہے صادق حسین قریشی کو بتانے کے لیے کہ ابھی تک آپ کا مجھ پر اعتماد ہے یہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے یہ کس وجہ سے کیا ہے میں اتنا بے حس نہیں ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ چیز ڈیز رو کرتا تھا میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ لوگوں کی ایسی طبیعت ہے کہ جب تک آپ پرائم منسٹر ہیں' آپ کی خوشامد کریں گے آپ سے اپنی وفاداری ظاہر کریں گے لیکن میری وفاداری کا آپ کو پتہ لگے گا جب آپ پرائم منسٹر نہیں ہو گے۔

اس وقت یہ کہنا بھی کہ جب آپ پرائم منسٹر ہوں گے' بڑی بات تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی دوستی کا صحیح ٹیسٹ اور اس کی وفاداری کا پتہ اس وقت لگتا ہے جب انسان پاور میں نہ ہو تو وہ بھی جذباتی ہو گئے اور انہوں نے کہا راؤ میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں پھر انہوں نے سوچا کہ شائد عمر میں یہ مجھ سے ایک دو سال بڑا ہی ہو گا پھر کہا کہ میں تمہیں بھائی کی طرح سے سمجھتا ہوں ان سے جو میرا پہلا انٹرویو تھا وہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ اور میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں سرخرو ہوا۔ گو ان کی جان تو نہ بچ سکی۔

P.M ہاؤس جا کے قریب سے میں نے یہ محسوس کیا کہ بھٹو بے حد محنتی انسان ہیں صبح نو دس بجے اپنا کام شروع کرتے تھے لوگوں سے ملنا میٹنگیں ہوتی تھیں جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ دن بھر چلتا رہتا تھا شام تک وہ لنچ نہیں کھاتے تھے۔ صرف کافی اور بسکٹ پر گزارا کرتے تھے۔ میٹنگ جب ہوتی تھی تو وہ صبح سے لے کے رات آٹھ نو بجے تک چلتی رہتی تھی سارے لوگ فاقہ کیے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں لوگ تنگ آ جاتے تھے سوائے بھٹو صاحب کے۔

ایک دفعہ میں حیران ہو گیا کہ ان میں کتنی ہمت تھی بہاولپور گئے تو وہاں لوگوں سے کھلی کچہری میں لوگ ضلع وار مل رہے تھے صبح بیٹھے تھے رات نو بجے ختم کرتے تھے سارا وقت بیٹھے ہوئے لوگوں کی باتیں سنتے تھے متواتر تین دن ان کا یہ حال رہا جو بات ڈی سی اور ایس پی رینک کا آدمی دو گھنٹے برداشت نہیں کر سکتا وہ وہاں تین دن سنتے رہے ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی ایک دوسرے کے خلاف گھٹیا باتیں پھر لوگوں کے مطالبے جس کا جو بس چلتا تھا اور وہ تین دن تک متواتر سنتے رہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ ہم سب لوگ تنگ آ گئے، کہ نہ جانے یہ مصیبت کب ختم ہو گی لیکن بھٹو صاحب ڈٹے ہوئے ہیں۔ مرحوم کا اپنا ایک سٹائل تھا۔ کہ ساری چیزیں عام نہج سے ہٹ کے ہو رہی ہیں۔ رات کو ایک ایک بجے، دو دو بجے بلا کے ہدایات دے رہے ہیں۔ خود ان کی آنکھیں نیند سے ابل رہی ہیں۔ ظاہر ہے اتنی بڑی ذمہ داری انہوں نے سنبھالی تھی' ویسے ان کا سٹائل بھی یہ تھا کہ ہر چیز کو بڑے ڈرامائی انداز میں کرتے تھے۔ چونکہ لوگ عام طور سے ان پڑھ ہیں۔ ان میں سیاسی شعور زیادہ نہیں ہوتا تو یہاں جو سیاستدان بھی لوگوں

کے ذہن پر اپنا کوئی اثر قائم کرنا چاہتا ہو خواہ کتنا ہی معمولی کام ہو وہ اس کو ڈرامائی انداز میں کرنا ہے۔

اتنا سٹیمنا تھا جو فائل آتی تھی میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ میں جو فائل ان کے پاس بھیجتا تھا وہ دوسرے دن واپس آ جاتا تھا سارے کا سارا پڑھا ہوا اتنا لمبا نوٹ بالکل واضح ہدایات کہ یہ کرنا ہے یہ نہیں کرنا ہے میری طرح بے شمار محکموں کے فائل ان کے پاس جاتے تھے جب وہ دورے پر ہوتے تو دورے کے دوران بھی فائل آتے رہتے تھے' جاتے رہتے تھے' کام ان کا چلتا رہتا تھا' اس معاملے میں وہ بہت ہی چست تھے کبھی بھی ایک دن سے زیادہ انہوں نے کوئی فائل اپنے پاس نہیں رکھا چاہے رات کے چار بج جائیں پانچ بج جائیں۔ اپنا سارا کام ختم کر کے سوتے تھے ان کا سارا اسٹاف ان کے اے ڈی سی ان کا ملٹری سیکرٹری وہ سب کا خیال رکھتے تھے۔

لوگوں کو ان کی بعض چیزوں کا پتہ نہیں ہے ان کی آنکھ میں بڑا لحاظ تھا ٹھیک ہے وہ انسانوں کے پیچھے بھی پڑ جاتے تھے لیکن ان کی طبیعت ایسی تھی کہ اگر انسان ان سے معافی مانگ لے تو پھر اس کے ساتھ بڑی فیاضی دکھاتے تھے ان کا کبھی یہ مقصد نہیں ہوتا تھا کہ کسی کو ہمیشہ کے لیے نقصان پہنچایا جائے۔

میں خود اس کی مثال ہوں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں انگلینڈ میں پانچ سال (66ء سے 71) تک رہا میرے وہاں جانے سے پہلے بھٹو صاحب لندن سے ہو کر گئے تھے جب وہ لندن گئے تو ایوب خان کی طرف سے ہائی کمشن کو ہدایت پہنچی اور انٹیلی جینس کو بھی کہ ان کی کڑی نگرانی کی جائے اور بتایا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے جب میں وہاں پہنچا تو میرے پیش رو نے ان کے متعلق جو رپورٹیں وغیرہ بھجوائی تھیں وہ میں نے دیکھیں کہ کن لوگوں سے ملے کیا وہ کہتے پھرتے تھے میرے پانچ سالہ قیام کے عرصے میں بھٹو صاحب دو دفعہ وہاں آئے۔ ایک تو اس دفعہ جب جے اے رحیم کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہیں اور ان کے ساتھ مل کے انہوں نے پیپلز پارٹی کی بنیادی دستاویز تیار کی۔ واپسی پر یہاں انہوں نے اپنی پارٹی کی بنیاد رکھی پھر ایک دفعہ وہاں وہ الیکشن سے پہلے آئے اور اپنی پارٹی کی وہاں شاخ قائم کی مظہر قاضی جو بعد میں ان کے پریس سیکرٹری بنے وہ وہاں بیرسٹری کر رہے تھے ان کو انہوں نے اپنی پارٹی کا کنوینر بنایا چونکہ وہاں میں تعینات تھا وہاں ہمارے دو کام تھے ایک تو وہاں جو پاکستانی تھے، ان کے متعلق ہم صحیح اطلاع رکھیں کہ ان کی سوچ کیا ہے کس کس گروپ سے وہ منسلک ہیں پاکستانی سیاست پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جو مختلف سیاستدان ہیں جیسے جماعت اسلامی ہے وہاں ان کی بھی اپنی ایک شاخ ہے بڑے فعال لوگ ہیں یہاں سے سیاستدان جا کے وہاں پاکستانیوں پر اثر انداز ہوتے تھے ان پر بھی ہم لوگ نگاہ رکھیں' لندن ایسی جگہ ہے جہاں آنے والے واقعات' خاص طور سے کامن ویلتھ کے جو پرانے ممالک تھے ان کی صورت حال وہاں کئی مہینے یا کئی سال پہلے نظر آ جاتی ہے

اس سلسلے میں ہم لوگوں کو ہدایت ہوتی تھی کہ جو بھی لیڈر پاکستان سے وہاں جائے اس کی بڑی نگرانی کی جائے اس لیے بھٹو صاحب جب وہاں گئے چونکہ وہ اپوزیشن کے ایک سیاستدان کی حیثیت سے آئے تھے اس لیے ان کی سیاسی حرکات وسکنات پر نظر رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا اس کے متعلق رپورٹیں اپنی گورنمنٹ کو بھیجتا تھا۔ میں بھٹو صاحب سے وہاں ملا نہیں ان کو مل کر پھر رپورٹیں بھیجنا میرا خیال ہے یہ غیر شریفانہ بات تھی میں خود ان سے نہیں ملا لیکن میں نے اپنا فرض ہمیشہ پوری طرح سے ادا کرنے کی کوشش کی ان کی رعایت میں نے کبھی نہیں کی۔ اپنا فرض میں نے پوری طرح نبھایا۔

شروع شروع میں بھٹو صاحب کا امیج پلے بوائے کا سا تھا جوان آدمی تھے خوش شکل تھے خوش لباس تھے سوسائٹی میں چلتے پھرتے تھے ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی مجھے یاد ہے میں نے ایک پاکستانی لڑکی کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے پاس جائے ان سے ملے اور پتہ کرے کہ ان کی اس وقت سوچ کیا ہے لیکن بھٹو صاحب کو پتہ تھا کہ انٹیلی جنس کیا کر سکتی ہے کیا نہیں کر سکتی۔ اس معاملے میں وہ بڑے محتاط سے تھے کہ ہر شخص ان کو انٹیلی جنس کا نظر آتا تھا۔ شروع شروع میں وہ لڑکی اس لحاظ سے بڑی پریشان ہوئی کہ بھٹو صاحب کو شبہ ہوا کہ ضرور کسی نے اس کو بھیجا ہے لیکن وہ تھی بڑی ذہین لڑکی بڑی ڈرامہ باز اس نے بڑے بڑے آنسو نکالے اپنی دکھ بھری داستان سنائی ان سے کوئی سفارش کی بات کی تو وہ سمجھے کہ نہیں یہ بیچاری تو خود پریشان ہے پھر تھوڑا بہت انہوں نے اس کو بتایا کہ میں سیاست میں کیا کروں گا حکومتی مشینری کس طرح سے میرے خلاف ہے۔ ایڈمنسٹریشن نے مجھے پاکستان میں کافی تنگ کیا ہوا ہے میرے خلاف ٹریکٹرز کی انکوائری یہ انکوائری' وہ انکوائری چل رہی ہے۔

ان باتوں سے ان کی ذہنی پریشانی کا احساس ہوا بہرحال جو رپورٹیں مجھے ملتی رہیں میں بھیجتا رہا اس کے علاوہ یہ بھی میرے فرائض میں شامل تھا کہ یہاں کی سیاسی پارٹیاں وہاں قدم جمانا چاہیں تو ان کے قدم نہ جمنے دیئے جائیں۔ اس کے بھی مختلف طریقے تھے جس کی وجہ سے بھٹو صاحب کی پارٹی وہاں قدم نہیں جما سکی اگرچہ وہ وہاں بہت پاپولر تھے۔

جب میں پاکستان واپس آ گیا اور بھٹو صاحب بھی اقتدار میں آ گئے تو انہوں نے پرانی فائلیں منگوا کے دیکھیں کہ یہ لوگ میرے خلاف کیا کرتے تھے۔ مظہر قاضی بھی آ کے ان کا پریس سیکرٹری لگ گیا تھا' بھٹو صاحب نے محسوس کیا کہ یہ جو راؤ رشید ہے یہ میرے خلاف رپورٹیں بھیجتا رہا ہے اور میری پارٹی کو بھی ناکام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے' ان کو یہ خیال آیا کہ یہ کوئی ٹھیک آدمی نہیں ہے لیکن میں نے پرواہ نہیں کی کیونکہ جو میرا فرض تھا وہ فرض تھا اگر میں کسی کو سوٹ نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں۔

جب میں پشاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھا بطور صدر پاکستان بھٹو صاحب پہلی مرتبہ

وہاں تشریف لائے ائرپورٹ پر ہم سب افسران کھڑے تھے۔ جب میرے پاس پہنچے ہاتھ ملایا تو ساتھ ہی پوچھا ''آپ انگلینڈ میں ہوا کرتے تھے'' میں نے کہا ''جی ہاں'' سر ہلایا اور چلے گئے اس وقت میرا خیال ہے بندیال وہاں کمشنر تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھٹو صاحب آپ سے کیا پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتایا یہ پوچھ رہے تھے کہنے لگے کچھ ناراض سے لگتے تھے، میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے I.G پرموٹ کیا۔ گریڈ 22 دیا۔ اپنا سپیشل سیکرٹری بنایا۔ D.I.B بنایا۔ میں ان کے کیا کیا احسانات یاد کروں۔ میں ہی نہیں پوری قوم ان کے کیا کیا احسانات یاد کرے۔ آئین دیا، ایٹم بم دیا، اقوامِ عالم میں پاکستان کو عزت وتوقیر دی لیکن ہم بہت ناشکرے لوگ ہیں کہ اس کا صلہ ہم نے ان کو پھانسی کی صورت میں دیا۔ ''لاحول والاقوۃ الا باللہ۔''

❖

اصغر خان

ہمیں یاد ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد اصغر خان کو ضیاء الحق نے خاص طور پر ایران بھجوایا تھا۔شاہ آف ایران سے ملاقات کرنے کے لیے وہ ایک طرح کی بَر دکھائی تھی کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔
یہ ہمارا نیا دلہا ہے اگر شاہ نے اسے پسند کیا تو پاکستان کے لیے ٹھیک ہے۔خورشید قصوری بھی ان کے ساتھ تھے۔

تو وہ ایک عجیب قسم کا سلسلہ تھا' ضیاء الحق ان کو بھجوار ہے ہیں ظاہر ہے ضیاء الحق کو کسی نے کہا ہو گا۔ضیاء الحق سے صلاح مشورہ کیا گیا ہوگا۔ضیاء الحق نے تجویز کیا تھا تو وہ گئے تھے۔یہ ایک چوہے بلی کا کھیل ضیاء الحق اور اصغر خان میں چلتا رہا ہے لگتا ایسا ہے کہ ضیاء الحق کو جو رول ملا تھا وہ صرف یہ تھا کہ بھٹو صاحب کو راستہ سے ہٹایا جائے اس کے بعد اصغر خان کے لیے راستہ صاف کیا جائے ضیاء الحق یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ یہ رول ادا کر رہے ہیں لیکن اس سلسلے کو انہوں نے اتنا لمبا کر دیا کہ اس دوران میں انہوں نے اصغر خان کی جو پھونک تھی وہ پوری طرح سے نکال دی اور امریکنوں کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی کوئی حیثیت' کوئی اہمیت نہیں ہے۔مجھ میں کیا خرابی ہے اور یہ کہ اگر میں نے ہی اس کو سنبھالنا ہے یا اس کو لانا ہے پھر مجھ میں کیا خرابی ہے یا تو ایک انسان میں خود اتنی قابلیت ہو لیکن اصغر خان نے جو رول پلے کیا ایسا لگتا تھا کہ وہ خود اس کے اہل نہیں تھے۔ثابت ہو چکا ہے کہ اصغر خان میں وقت کا شعور نہیں ہے انہوں نے PNA تحریک میں جو پارٹ بھی پلے کیا' ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی کے اشارے پر کیا جا رہا تھا اور کسی خاص مقصد کے لیے ایک رول ادا کیا جا رہا تھا۔اگر یہ بھٹو صاحب کے خلاف امریکہ کی سازش تھی تو اس میں سب سے بڑا اور اہم کردار اصغر خان کے سپرد ہوا تھا۔اصغر خان نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ وہ پی این اے کی لیڈر شپ پر قبضہ کریں۔ہر سیاست دان ایسا چاہتا ہے لیکن اس کے بعد انتخابات پر جو انہوں نے حملہ کیا اور بھٹو صاحب کی شخصیت پر اٹیک کیا اور یہ کہا کہ اس کو میں کوہالہ کے پُل پر پھانسی لگاؤں گا۔اس

سے پتہ چلتا ہے کہ اس سازش میں اصغر خان برابر کا شریک تھا۔

بڑی نازک سٹیج پر' بڑے نازک مرحلے پر اصغر خان نے سب سے زیادہ اور سب سے اہم رول ادا کیا۔ فوج کو یہ امید تھی امریکنوں کو یہ خیال تھا کہ PPP کا PNA سے معاہدہ نہیں ہوگا لیکن وہ معاہدہ ہو گیا اور اس لیے معاہدہ ہو گیا کہ اس میں نوابزادہ نصر اللہ خاں اور مفتی محمود جیسے صائب الرائے آدمی تھے جو چاہتے تھے کہ کوئی خون خرابہ نہ ہو۔ اس لیے جب انہوں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب نے ان کی باتیں مان لی ہیں تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے یہی ہم چاہتے تھے۔ غلطی اس میں یہ ہوئی کہ اس معاہدے پر وہاں دستخط نہ ہوئے' اس لیے کہ انہوں نے کہا شام کو کر لیں گے۔ وہ پریس کانفرنس میں اناؤنس کرنے والے تھے کہ معاہدہ ہو گیا ہے یہ بات اگر قوم کو معلوم ہو جاتی کہ معاہدہ ہو گیا ہے تو پھر مارشل لا نہیں لگتا۔ پھر اس کا کوئی جواز نہیں تھا تو اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان تین چار دنوں میں جنرل جیلانی بار بار فون کرتے رہے۔ انہوں نے مجھ سے دو تین دفعہ کہا پوچھا کیا ہو رہا ہے' راؤ صاحب معاہدہ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا' میں سوچتا تھا کہ یہ واقعی اتنے فکر مند ہیں اور بھٹو صاحب کے اتنے ہی خیر خواہ ہیں اور ملک کے اتنے خیر خواہ ہیں کہ ان کو واقعی بڑا خیال ہے کہ معاہدہ ہوتا ہے کہ نہیں لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تو ایک سازش کی کڑی تھی وہ صرف یہ پتہ کرنا چاہتے تھے کہ معاہدہ اگر ہو رہا ہے تو اس سے پہلے فوج مارشل لا نافذ کر دے۔

چنانچہ جب انہیں پتہ لگا کہ معاہدہ ہو گیا ہے تو وہ بڑے سخت گھبرائے چنانچہ اصغر خان مع محمود علی قصوری کے جنہوں نے اپنی بغل میں لا کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں PNA نے پریس کانفرنس رکھی ہوئی تھی اور انہوں نے جا کے بڑی صلواتیں سنائیں۔ اور کہا کہ تم تو اُلو کے پٹھے ہو بھٹو پھر تم کو بیوقوف بنا گیا ہے کیا تم نے حاصل کیا تم تو اور بھی زیادہ اختیارات دے آئے ہو۔ محمود علی قصوری بتاؤ ان کو اس نے بتایا کہ آئین میں وزیراعظم کے یہ اختیارات تھے اور آپ اس کو اور بھی زیادہ اختیارات دے آئے ہیں چنانچہ اصغر خان نے کہا کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ آپ بھی اس کو نہ مانیں۔ پھر اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے یہ گارنٹی دی کہ آپ معاہدہ نہ کریں۔ میں نوے دن کے اندر الیکشن کرواؤں گا۔ اصغر خان کو کہا گیا تھا کہ نوے دن کے اندر الیکشن ہوں گے اور بھٹو اتنا' غیر ہر دلعزیز ہے کہ ظاہر ہے تم ہی آئندہ وزیراعظم ہو گے تو اصغر خان کو گارنٹی دی گئی تھی نوے دن کے اندر الیکشن کرانے کی۔

یہ صحیح بات ہے کہ اسی کے ذمے یہ کام لگا تھا کہ تم یہ معاہدہ نہ ہونے دو چنانچہ اس نے پروفیسر غفور کو نوابزادہ نصر اللہ صاحب جو اس پریس کانفرنس کو سپانسر کرنے والے تھے ان کو کرسی سے جسمانی طور سے پرے ہٹا دیا اور خود بیٹھ گیا۔ اس پریس کانفرنس کا چارج لے لیا اور اعلان کر دیا کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے ہمارے دس پوائنٹ اور ہیں پہلے ان کا فیصلہ ہونا ہے۔

قصہ مختصر' آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ اصغر خان کہاں تک امریکنوں کا آدمی ہے۔ یا نہیں ہے۔

ضیاء الحق نے ایک اعلان تو آتے ہی کیا تھا کہ نوے دن کے اندر اندر الیکشن کرائے جائیں گے وہ نہ کرائے گئے پھر انہوں نے 23 مارچ 79ء کو اعلان کیا کہ نومبر 79ء میں الیکشن کرائے جائیں گے۔ ان دوسرے انتخابات کے بارے میں مجھے مولانا احترام الحق تھانوی نے بتایا کہ یہ الیکشن اناؤنس ہو چکے تھے کہ ایک امریکن میرے گھر پر آیا تھا اس نے آ کے کہا کہ مولانا صاحب میں نے آپ کی خاندانی ہسٹری دیکھی ہے اور میں حیران ہوں کہ آپ ایک مکمل طور سے لادینی جماعت کیساتھ کیسے شریک ہیں تو میں نے یہ کہا کہ یہ لادینی جماعت نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے جو ستون ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے اس نے کہا کہ نہیں نہیں اس کی ساری پالیسی اور ساری اپروچ لادینی ہے آپ کو تو میرا خیال ہے کہ اصغر خان کے ساتھ ہونا چاہیے۔

مولانا نے کہا کہ اصغر خان تو کوئی سیاستدان نہیں ہے اور اس کی کوئی سپورٹ نہیں ہے۔ اس امریکی نے کہا نہیں یہ تو آپ نہیں کہہ سکتے ہمارے خیال میں وہ تو پاپولر لیڈر ہے۔ وہ پاکستان کا اگلا وزیراعظم ہے۔ مولانا نے کہا یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں' اس کے ساتھ صرف چند آدمی ہیں' امریکن نے کہا' آپ دیکھیں گے کہ الیکشن ہوتے ہی وہ اگلا وزیر اعظم ہوگا۔ مولانا احترام الحق کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ الیکشن تو کبھی نہیں ہو سکتے۔ اس نے کہا کہ نہیں ضیاء الحق نے یہ گارنٹی دی ہے کہ یہ الیکشن ملتوی نہیں ہوں گے۔ اس امریکن کو مولانا احترام الحق تھانوی نے کہا '' آپ تو پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں آپ کو صحیح حالات کا علم نہیں '' امریکنوں کو گارنٹی دی ہوئی ہوگی کہ الیکشن ملتوی نہیں ہوں گے۔ لیکن ضیاء اس پر قائم نہیں رہے گا۔ تحریک کا ایک اور بڑا اہم لیڈر تھا اس نے بھی اس دوران میں یہ کہا کہ ضیا الحق کا باپ بھی یہ الیکشن ملتوی نہیں کر سکتا۔

اس بیچارے کا نام چھوڑیں مطلب یہ کہ اصغر خاں کے قریب کے جو سرکل تھے ان میں اس نے یہ بات کی تھی کہ ضیاء الحق کا باپ بھی یہ الیکشن ملتوی نہیں کر سکتا اور اصغر خان نے نجی محفلوں میں بھی یہی کہا۔ اس دوران میں الیکشن ملتوی ہو گئے تو مولانا احترام الحق تھانوی کہتے ہیں اس کے بعد اس امریکن کا فون آیا اس نے کہا مولانا آپ نے جو بات کی تھی اب ہماری تسلی ہوئی ہے کہ واقعی اصغر خان کی کوئی سپورٹ نہیں ہے جو بلدیاتی انتخابات ہوئے ہیں ان سے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ پورے پاکستان میں اصغر خان کو 48 سیٹیں ملی ہیں۔ اس لیے الیکشن ملتوی ہوئے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ امریکنوں کو یہ بتایا گیا ہوگا کہ آپ جس آدمی کو سپورٹ کر رہے ہیں اس کا

تو یہ حال ہے میرا اپنا خیال یہ بھی ہے کہ اس نتیجے کی بنا پر الیکشن ملتوی کیے گئے۔ امریکنوں کو بھی یہ خیال آیا ہوگا کہ اگر اصغر خان کی سپورٹ نہیں ہے تو اسے زبردستی تو نہیں لایا جا سکتا پھر انہوں نے ضیاء الحق سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اصغر خان اور امریکنوں کی انڈرسٹینڈنگ کی ڈائریکٹ شہادت تو کوئی نہیں ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا جو بھی دائیں بازو کا سیاستدان اس ملک میں برسر اقتدار آنے کا ارادہ رکھتا ہے یا اس کے عزائم ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی سطح پر امریکہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ کوئی نہ کوئی لائن ضرور ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔

اصل میں اصغر خان کی پارٹی کے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ فی الحال وہ الیکشن کے ذریعے اقتدار میں نہیں آ سکتے صرف سازش کے ذریعے اقتدار میں آ سکتے ہیں' اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بھی کوئی سازش ہوئی اس میں اصغر خان ضرور کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوتا ہے۔

اب اصغر خان کی جو پوزیشن ہے ایک تو 70ء کے الیکشن میں وہ اسمبلی میں نہیں آ سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب بھٹو صاحب ابھی نیو یارک سے پاکستان نہیں پہنچے تھے۔ انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی آپ کو یاد ہوگا کہ بھٹو صاحب کے آنے سے پہلے تحریک کے لوگوں نے پریذیڈنٹ ہاؤس کے سامنے ایک مظاہرہ کیا تھا اور اس میں زبردستی گھسنے کی کوشش کی تھی۔

ان کا خیال یہ تھا کہ اس صورت میں پھر بھٹو صاحب کے پہنچنے سے پہلے پہلے اگر ایسی حالت پیدا کر دی جائے کہ فوج میں ایک عنصر تھا جو اصغر خان کو لانے کے لیے تیار تھا وہ لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کی وجہ سے ایسٹ پاکستان علیحدہ ہوا یا جو شکست ہوئی ہے اس کا سارے کا سارا الزام وہ بھٹو صاحب پر تھوپنا چاہتے تھے۔ اس گروپ کا خیال تھا کہ فوج تو حکومت نہیں کر سکتی لہٰذا اصغر خان از دی بیسٹ پھر جو اٹک سازش پکڑی گئی وہ بھی اصغر خان کو لانے کے لیے کی گئی اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو اصغر خان کو لایا جاتا پھر یہ کہ جہاں اصغر خان بھٹو صاحب کے خلاف جدوجہد کرتے رہے وہاں ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ اس جدوجہد سے بھٹو نہیں جا سکتے۔ اس وقت بھی ان کی کوشش یہ تھی کہ فوج کے کسی گروپ سے راہ و رسم رکھ کے فوج کے ذریعے بھٹو کا تختہ الٹا جائے آخر کار الیکشن آ گئے اور تختہ الٹنے کے لیے انہوں نے راہ ہموار کی اور سب سے نازک مرحلہ جو آیا جب معاہدہ ہونے لگا اس میں اصغر خان نے ہی سب سے اہم رول ادا کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا فائدہ وہ نہیں اٹھا سکے۔ ہمیشہ فائدہ کوئی اور اٹھا جاتا ہے۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ بھٹو صاحب مرحوم کو ہائی کورٹ سے سزا ملی' سپریم کورٹ میں کیس تھا' میں جیل میں تھا' خبروں سے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے جب پیپلز پارٹی کے لوگوں نے خود سوزی

شروع کی' اس وقت میں نے بیگم بھٹو کو پیغام بھجوایا تھا' ٹھیک ہے کہ پیپلز پارٹی بڑی پارٹی ہے لوگوں میں بڑا اشتعال ہے لیکن پیپلز پارٹی جو تحریک چلائے گی وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آپ کو کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی مفاہمت کرنی پڑے گی کیونکہ جب تک آپ کا دوسری سیاسی پارٹیوں سے سمجھوتہ نہیں ہوگا آپ کامیاب نہیں ہوں گی' صاف بات ہے یہ میں 1978ء کی بات بتا رہا ہوں جب تک لڑائی پیپلز پارٹی اور حکومت میں تھی۔ پیپلز پارٹی کی پوزیشن حکومت کے خلاف کبھی بھی مضبوط نہیں تھی۔ یہ تو سارے سیاستدان مل کے ہی تحریک چلا سکتے تھے پھر حکمرانوں کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دیں۔ لیکن اس وقت انہوں نے اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا میں نے اس وقت دو آدمیوں کا نام لیا تھا۔ ولی خاں اور اصغر خان کہ اگر آپ ان کے ساتھ بات چیت کریں بیشک جو بھی مانگتے ہیں آپ ان کو دے دیں لیکن خدا کے لیے آپ ان کو ضرور ساتھ لیں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ ہو جائیں تو تحریک چل جائے گی مگر میری وہ بات نہیں مانی گئی اور بھٹو کو بچانے کی تحریک دم توڑ گئی۔

ایسے تو بہت کم لوگ ہیں جو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر کوئی بات کرتے ہیں لیکن اگر ان کی ذات کو کوئی فائدہ نظر آئے تو ضرور بات مان جاتے ہیں اور ان کی ذات کا فائدہ یہ تھا کہ اگر اصغر خان کو سمجھایا جاتا اور حقیقت بھی تھی کہ بھٹو صاحب کا بچانا پوری قوم کا مطالبہ ہے قوم کی خواہش ہے اور جو شخص اس میں کردار ادا کرے گا وہ قوم کا ہیرو بن جائے گا تو میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا اس لیے کہ ہمارے لوگ تو ایسے آدمی کو جو دشمن ہو لیکن نیچے گرا ہوا ہو اس کی امداد کریں تو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں میرا خیال تھا کہ اصغر خان اور ولی خاں کا قد بہت بلند ہوتا۔ بھٹو صاحب کے متعلق جب وہ جیل میں تھے ولی خاں نے ان کے متعلق جو باتیں کیں اس سے ان کا قد کم ہوا۔ بڑھا نہیں اس لیے کہ گرے ہوئے کو ٹھوکر مارنا کوئی بہادری نہیں اور یہ بڑے آدمی کا کام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ولی خان کو اب احساس ہوگا کہ انہوں نے وہ باتیں کر کے اپنا قد بہت گھٹایا ہے۔ اصغر خان نے ایسی بات تو نہیں کی لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اگر وہ کرتے تو میرا خیال ہے کہ سیاسی طور سے ان کا قد بہت اونچا ہو جاتا۔ اگر وہ کرتے تو وہ بھی سیاست تھی بلکہ وہ زیادہ کامیاب سیاست تھی۔ اس لیے کہ سیاست کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اقتدار میں آئے اپنے پروگرام کی بنیاد پر' اپنی سیاست کی بنیاد پر' اب سات سال سے وہ انتظار ہی کر رہے ہیں' بھٹو صاحب کو مروا کے ان کو کیا فائدہ ہوا۔ ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا اگر وہ بچاتے تو یہ عرصہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس کا فائدہ بھٹو صاحب کی بجائے اصغر خان کو پہنچتا۔

دسمبر 78ء میں جب میں رہا ہوا تو میں اصغر خان کے پاس گیا بھٹو صاحب کے لیے نہیں' ان کی

اپنی سیاست کے لیے کہ اگر تم بھٹو صاحب کے لیے تحریک چلاؤ گے تو تم اس وقت ملک کے ہیرو ہو گے' اس لیے کہ یہ سمجھنے کی بات ہے مثلاً 70ء میں بھٹو صاحب نے نعرہ دیا' روٹی' کپڑے' مکان وہ کیوں؟ اس لیے کہ بھٹو صاحب عوام کے جذبات سمجھتے تھے۔ انہوں نے قوم کو ایک راہ دکھائی تھی۔ 78ء کے آخر میں میں محسوس کرتا تھا کہ بھٹو صاحب کی رہائی کے سلسلے میں جو سیاسی لیڈر عوام کی اس خواہش کو پورا کرتا ہے یا تحریک چلا سکتا ہے وہ اس ملک کا ہیرو ہو سکتا ہے' وہ تحریک چلانے میں بیشک کامیاب نہ ہو لیکن واقعی اگر خلوص سے چلاتا' تو میرا خیال ہے کہ وہ اس ملک کا ہیرو ہوتا۔ اس پر اصغر خان صاحب نے کہا اگر میں بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے تحریک چلاؤں' تو ضیاء الحق کا باپ بھی اس کو پھانسی نہیں دے سکتا' یہ ان کا اعتماد تھا لیکن وہ موقع نکل گیا۔ اس لیے ان کو یہ خوف تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک بھٹو زندہ ہے تو اس ملک کی سیاست کا چھٹکارا بھٹو سے نہیں ہو سکتا پاکستان کی سیاست میں کسی اور انسان کا امکان نہیں ہے' اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو ختم ہو جائے' اس کے بعد پھر اصغر خان ہی اصغر خان ہے' یہ ان کی کوتاہ اندیشی تھی ہو سکتا ہے کہ...... ضیاء الحق نے' ان کے گروپ نے' ان کو یہ تاثر بھی دیا ہوتا کہ بھٹو کی پھانسی کے خلاف کوئی تحریک نہ شروع ہو سکے لیکن یہ تو سیاستدان کا کام ہوتا ہے کہ دیکھے' اندازے لگائے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے چنانچہ ان کے مشیروں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ خود اصغر خان میں میرا خیال ہے اتنی بصیرت نہیں تھی کہ وہ اس چیز کا فائدہ صحیح طور سے محسوس کر سکتے' چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی سے بھٹو صاحب کو پھانسی لگنے دیا پھر بڑے خوش تھے کہ میدان صاف ہو گیا ہے اور الیکشن کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہونے لگیں اور لوگوں نے شیروانیاں سلوانا شروع کر دیں۔ اصغر خان نے سوٹ پہن کے یہ تاثر بھی دیا کہ وہ اگلے وزیر اعظم ہیں کسی پریس کانفرنس میں محمود علی قصوری نے کہا کہ اگر ہم برسر اقتدار آئے تو یہ کریں گے' اس پر اصغر خان نے ان کو بڑا ڈانٹا کہ "اگر" کا کیا مطلب ہے بہر حال یہ ان کی خود فریبی تھی کیونکہ ساری دنیا کا اندازہ یہ تھا کہ ضیاء الحق کبھی اقتدار نہیں چھوڑے گا اور وہ اصغر خان کو تو اقتدار حوالے نہیں کرے گا۔ لیکن اصغر خان اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھے۔

جس شخص کی کوئی سپورٹ حاصل نہ ہو' عوام اس کے ساتھ نہ ہوں تو اس کو یہ کیسے احساس ہے کہ دوسرا آدمی جو اقتدار میں ہے وہ اس کو اٹھا کے اپنی جگہ پہ بٹھا لے گا' آخر اس کی کوئی وجہ جواز بھی تو ہونی چاہیے چنانچہ جب یہ بڑے خوش تھے اور تحریک کے لوگ پاکستان کا چارج لینے کی' اقتدار سنبھالنے کی تیاریاں کر رہے تھے تو اس وقت میں 'مساوات اخبار' میں تھا اس کے جو معاملات تھے' ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا' تو میں نے انگریزی میں ایک آرٹیکل لکھا' یہ میرا خیال ہے' 1979ء کے الیکشن ملتوی ہونے سے ہفتہ دس دن پہلے کی بات ہے یا اس ہفتے کی بات ہے اس میں میں نے یہ لکھا تھا کہ اصغر خان بہت خوش

ہیں تحریک بڑی خوش ہے کہ اقتدار ان کے حوالے ہونے والا ہے اس لیے کہ یہ جو الیکشن لاز میں تبدیلی کی گئی ہے وہ صرف ایک مخصوص پارٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے کی گئی ہے لیکن اس جوڑ توڑ کا تو مطلب یہ ہے کہ مصنوعی طور سے اصغر خان کو اقتدار میں لایا جائے گا میں نے کہا کہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر بندوق سے ہی اصغر خان کو اقتدار میں لایا جار ہا ہے اور بندوق سے ہی اس کو وہاں رکھا جائے گا تو پھر جس آدمی کے پاس بندوق ہے وہ خود کیوں نہ رہے مطلب یہ کہ میرے جیسا سیاست سے نابلند آدمی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔

بالکل کامن سینس کی باتیں تھی کسی خاص سیاسی بصیرت کی ضرورت نہیں تھی۔ اور نہ تجربے کی ضرورت میں حیران ہوں کہ ہمارے سیاستدان اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اقتدار کی چمک دور سے ان کو اگر دکھائی جائے تو ان کی آنکھیں اتنی خیرہ ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کے ہوش وحواس قائم نہیں رہتے افسوس اس بات کا ہے کہ اگر کوئی مسجد کا مُلاں یا اس قسم کا کوئی آدمی خواب دیکھے یا اس کو کہا جائے کہ تم منسٹر بنو گے' اس کے لیے تو وہ بڑی بات ہوگی لیکن اصغر خان جیسا آدمی جو ائر فورس کا کمانڈر انچیف رہا ہو اس کو اقتدار کی اتنی ہوس یا اتنا لالچ ہو کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے، یہ بڑی افسوسناک بات ہے اور اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ اس قسم کے لوگ بھی یہ سوچتے ہیں کہ جیسے اقتدار' ان کی وراثت ہے۔

بہر حال ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ ذاتی طور سے ان کا کردار صاف ستھرا ہے اور دوسرے یہ کہ جس چیز کے وہ پیچھے پڑتے ہیں بڑی مضبوطی سے پڑتے ہیں۔ بھٹو کے خلاف انہوں نے پانچ سال ایک طرح سے تن تنہا اپنی جدوجہد جاری رکھی جو ایک بڑی خوبی اور تعریف کی بات ہے اس وجہ سے وہ اب تک سیاست میں ہیں ورنہ جو ان کی سیاسی اہلیت ہے یا سیاسی بصیرت ہے اس لحاظ سے تو انہیں کافی عرصے کا سیاسی میدان سے بے دخل ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ جوان کا خاصہ ہے جدوجہد اور کشمکش تو اس وجہ سے وہ زندہ ہیں سیاست میں میرا خیال ہے کہ اب وہ سوچتے ہوں گے کہ اگر انہوں نے اتنی کوتاہ اندیشی سے کام نہ لیا ہوتا اور بھٹو صاحب کی پھانسی پر اتنے خوش نہ ہوتے' حکومت سے سازش نہ کی ہوتی تو وہ اس انجام کو نہ پہنچتے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا ڈر کے نہیں بیٹھے گا۔ جب بھی باہر نکلے گا وہ دورے کر کے عوام میں میٹنگوں میں' کوئی نہ کوئی ضیاء الحق کے خلاف بات کرتا رہے گا تو اس لیے ضیاء الحق کا جہاں تک بس چلے گا انہوں نے اصغر خان کو نہیں چھوڑنا۔ اصغر خان ایک ایسا آدمی ہے جس کو وہ رہا نہیں کرے گا۔ صرف اس صورت میں رہا کرے گا جب اصغر خان یا تو کمزور پڑ جائے یا کوئی پولیٹیکل ایجی ٹیشن ہو جس کے نتیجے میں وہ باہر نکلے یا اصغر خان یہ وعدہ کرے کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔ میں

گھر بیٹھوں گا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بہانے سے باہر چلے جائیں۔ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے اگر کبھی اصغر خان باہر گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا ضیاء الحق سے اس بات پہ معاہدہ ہو گیا ہے کہ جب تک ضیاء الحق برسر اقتدار ہے اصغر خان واپس نہیں آئیں گے۔ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے اس کے علاوہ دوسری صورت کوئی نہیں کہ ان کو رہا کیا جائے۔

ثبوت اس کا یہ ہے کہ ایک تو اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ اصغر خان اور فوج کے جرنیل ملے ہوئے تھے۔ یہ جو مارشل لا لگا ہے' یہ اصغر خان کے علم میں تھا اس کی مرضی سے اس کے ایما پر' ایما پر نہیں بلکہ اس کی امداد سے لگا ہے اور اس نے سیاسی طور سے اس کی راہ ہموار کی PNA کو اصغر خان نے گارنٹی دی نوے دن کی اپنے سینے پہ ہاتھ مار کے دی۔ آخر کس نے اس کو یہ تسلی دی تھی کس نے اس کو گارنٹی دی تھی اس کے پاس کون سے ٹینک اور توپیں تھیں کہ اس نے یہ گارنٹی دی کہ میں 90 دن کے اندر اندر انتخابات کراؤں گا اور پھر جب ضیاء الحق پہلی تقریر کرتے ہیں اس میں اسی نوے دن کا وعدہ ہوتا ہے۔ 91 دن کا نہیں ہوتا 92 دن کا بھی نہیں ہوتا یا 60 دن کا بھی نہیں ہوتا انہی باتوں سے آپ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ جب الیکشن ملتوی کیے گئے تو اس وقت آپ کو پتہ ہوگا کہ اصغر خان انتخابی دورے پر تھے اور اعلان سے ایک دن پہلے انہوں نے اپنا دورہ ختم کیا اور واپس پنڈی آ گئے سوال یہ ہے کہ انہیں 24 گھنٹے یا 48 گھنٹے پہلے کیسے پتہ لگ گیا کہ الیکشن نہیں ہو رہے ضیاء الحق نے تو وہ اعلان ٹیلی ویژن پر کیا تھا اصغر خان کو کیسے پتہ لگا کہ انہوں نے اپنا انتخابی پروگرام ختم کیا اور واپس پنڈی آ گئے تو ان سب باتوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوے دن کا پروگرام جو تھا پہلے سے طے شدہ تھا اور اسی طے شدہ امر پر پی این اے (قومی اتحاد) نے اپنی منظوری دی تھی کہ مارشل لا لگ جائے۔

سب تو نہیں' البتہ اس میں اصغر خان نسیم ولی خاں' پیر پگاڑا اور جماعت اسلامی شامل تھی۔

مزاری نسیم ولی خاں کے ساتھ ہی تھے۔

نسیم ولی خاں کو بھی شاید یہ تاثر دیا گیا کہ تم پرائم منسٹر ہو گی اس لیے ایجی ٹیشن کے آخری دنوں میں یہ افواہ بھی چلتی رہی کہ امریکن چاہتے ہیں کہ نسیم ولی خاں اگلی پرائم منسٹر ہوں پہلے اصغر خان کا ہوا نسیم ولی خاں کا ہوا' میرا خیال ہے کہ پیر پگاڑا سے بھی کوئی بات چیت ہوئی' اس لیے کہ پیر صاحب کو جوتشیوں پر بڑا اعتقاد ہے پیر پگاڑا صاحب پنڈی جاتے رہے ہیں۔ وہاں وہ جوتشیوں سے پوچھتے تھے کہ تین اور چار اور پانچ جون کے متعلق بتائیں کہ ان دنوں میں میرا ستارہ کیسا ہے یہ نہیں ہوا کہ مارشل لا اچانک لگا' اسے لگانے کی پلاننگ اپریل میں ہو چکی تھی فکر میں تھے کہ لگایا کس وقت جائے تو پیر پگاڑا پنڈی میں بیٹھے ہوئے تھے انتظار میں۔ بڑے پریشان تھے کہ بھئی میرے ستارے کیسے ہیں جوتشیوں نے کہا کہ چار پانچ جون کو

آپ کے ستارے خاص بلند نہیں ہیں چنانچہ انہیں اس بات پر بڑی مایوسی ہوئی تھی بھٹو صاحب سے پی این اے کے مذاکرات ہو رہے تھے کہ الیکشن دوبارہ ہوں گے تو مجھے اطلاع ملی کہ پیر پگاڑا لاڑکانے سے بھٹو صاحب سے مقابلہ کریں گے' یہ بات میں نے بھٹو صاحب کو بتائی۔ وہ بڑے حیران ہوئے کہ پیر پگاڑا کے لاڑکانہ سے لڑنے کی کیا تک ہے۔

یہ رپورٹ میں نے بھٹو صاحب کو دی کہ اگلے الیکشن میں پیر پگاڑا لاڑکانہ سے آپ کا مقابلہ کریں گے۔ یہ بات بھٹو صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ اگر بھٹو صاحب برسر اقتدار رہتے اور معاہدے کے تحت الیکشن ہوتے تو پیر پگاڑا صاحب کے لاڑکانہ سے لڑنے کا سوال پیدا نہیں ہونا تھا۔ یہ اس کی ایک اور شہادت ہے کہ سازش یہ تھی کہ بھٹو صاحب کو ہٹایا جائے گا فوج چاہتی تھی کہ انہیں سیاسی طور سے ختم کیا جائے اس کوشش کے نتیجے میں ان کا خیال یہ تھا کہ تحریک جب کامیاب ہوگی تو بھٹو صاحب اتنے غیر ہردلعزیز ہو جائیں گے کہ لاڑکانہ سے بھی باہر نہ آئیں گے اس لیے انہوں نے پیر پگاڑا سے بات چیت کی تھی اور اسی کے نتیجے میں پیر پگاڑا نے لاڑکانہ میں بھٹو صاحب کے خلاف الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تھا۔ تاکہ ان کو ہرائیں اور انہیں سیاسی طور سے ختم کریں۔

لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ بھٹو صاحب پھر اتنے پاپولر ہو کے ابھریں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بھٹو صاحب کو ان کے گھر میں ہرایا جائے تو اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے یہ اس سازش کی ایک کڑی تھی۔ اس وقت مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ پیر پگاڑا سے پوچھا گیا ہے کہ اگر ہم مارشل لا لگائیں تو آپ سندھ میں ہماری کتنی امداد کر سکیں گے' وہاں آپ کا کتنا کنٹرول ہے۔

لانگ مارچ اس سازش کی دوسری کڑی تھی' بی بی سی نے تو مارچ کا بہت شور مچایا۔ اصل میں کوئی لانگ مارچ نہیں تھا لانگ مارچ یہ تو نہیں ہوتا کہ لوگوں کو ٹرینوں میں بھر بھر کے پنڈی پہنچایا جائے۔ لانگ مارچ تو وہ ہوتا کہ لاہور سے لوگ پیدل چلتے' پشاور سے لوگ پیدل چلتے اس طرح سے دوسرے علاقوں سے چلتے۔ لیکن پیر صاحب نے لانگ مارچ کی کال دی' سوال یہ ہے کہ پیر صاحب میں اتنی عقل ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ لانگ مارچ ہوتا کیا ہے اس کو پھر بی بی سی نے' وائس آف امریکہ نے بہت اچھالا۔ جب ایوب خان نے اقتدار چھوڑا تو اس وقت بھی بی بی سی کے مطابق لاکھوں لوگ ڈھاکے کی طرف چل پڑے تھے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ بالکل ایک من گھڑت خبر تھی اور یحیٰی خان کے ایما سے چھاپی گئی تھی صرف ایوب خان کو ڈرانے کے لیے چھپوائی گئی تھی ایوب خان اس سے ایسا پریشان ہوا کہ اس نے اقتدار یحیٰی خان کے حوالے کر دیا۔

PNA کا جو لانگ مارچ تھا اس میں بھی وہی نسخہ آزمایا گیا اور اس کو بی بی سی نے یوں اچھالا

کہ اتنے لاکھ لوگ اسلام آباد پہنچ جائیں گے وہاں لاکھ تو کیا چند سو بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ فرنٹیئر پولیس نے پکٹس بنائی ہوئی تھیں' بہت کم وہاں پہنچ پائے۔ اگر پولیس چیکنگ نہ بھی کرتی تو میرا اپنا خیال ہے کہ ایک دو ہزار سے زیادہ آدمی وہاں نہ پہنچ پاتے۔ یہ وہی ڈرامہ تھا جس طرح آنیوالے کرتے ہیں اور انٹیلی جینس ایجنسیز کرتی ہیں۔ ساری چیزیں تیار ہیں ایک کے بعد دوسری اگر ایک ناکام ہو تو دوسری یا تیسری۔ چنانچہ پیر صاحب نے لانگ مارچ کی کال دیدی کہاں پیر صاحب اور کہاں لانگ مارچ۔ کہاں ماؤ اور کہاں پیر پگاڑا۔

لانگ مارچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں' بی بی سی پر اور انگریزی اخباروں میں اور وائس آف امریکہ میں آ رہا تھا کہ پانچ لاکھ پہنچ جائیں گے دس لاکھ پہنچ جائیں گے۔ اس وقت بھٹو صاحب نے ایک کمیٹی بنائی۔ یحیٰی بختیار اس کے انچارج تھے۔ روزمرہ کے جو فیصلے ہوتے تھے' وہ ہم لوگ کرتے تھے' فضل حق سیکرٹری داخلہ تھے۔ انہوں نے میٹنگ بلائی کہ اس میں کچھ لوگ بیٹھ کے اس لانگ مارچ سے ڈیل کرنے کی کوئی سکیم تیار کریں گے۔ اس میں میں تھا شیخ اکرم تھے مسعود محمود تھا اور اس کے علاوہ راولپنڈی کے جی او سی سے کہا کہ آپ بھی آ جائیں نام مجھے یاد نہیں آ رہا' کہ اس وقت کون جی او سی تھے۔ بہرحال جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کے علاوہ لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی بھی آئے ہوئے ہیں۔ میری چشتی صاحب سے یہ پہلی باقاعدہ ملاقات تھی اور وہ بن بلائے اس میٹنگ میں پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بلایا تو نہیں تھا چونکہ میں یہاں کا کور کمانڈر ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کی میٹنگ میں آ جاؤں آپ کو امداد کی جو بھی ضرورت ہوگی وہ آپ کو مل جائے گی۔ ہم اس بات سے بڑے متاثر ہوئے کہ ان لیفٹیننٹ جنرل صاحب نے کوئی تکلف نہیں کیا اور بغیر بلائے ہماری امداد کو پہنچ گئے ہیں۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھی سازش کی ایک کڑی تھی کہ لانگ مارچ کے بہانے فوج کو پنڈی میں اکٹھا کیا جائے۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ یہ ایک عام دماغ کا کام نہیں تھا اس میں موجودہ جرنیل اور سیاستدان ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان کی تاریں پتہ ہے کہاں سے ملی ہوئی تھیں۔

چنانچہ لانگ مارچ کے سلسلے میں ہم نے کہا کہ فوج کی ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی' لیکن اس کے باوجود انہوں نے پنڈی میں فوج جمع کر لی اور خاص طور سے پرائم منسٹر ہاؤس کے اردگرد جو پارک تھا وہاں فوج جمع کی کہ اگر لانگ مارچ ہوا تو اس کا حملہ پرائم منسٹر ہاؤس پر ہوگا۔ اس لیے یہاں ہمیں زیادہ انتظام کرنا چاہیے۔ یہ صرف حیلہ تھا۔

بی بی سی اور وائس آف امریکہ وغیرہ نے تو اس لانگ مارچ کو بہت اچھالا کہ اتنے لاکھ لوگ اسلام آباد پہنچ جائیں گے مشکل سے کوئی بیس یا پچیس یا پچاس آدمی پہنچے لیکن فوج کو پرائم منسٹر ہاؤس سے

ہٹایا نہیں گیا۔

چونکہ فوج کی موومنٹ کے متعلق معلوم کرنا صرف فوجی انٹیلی جینس کا کام تھا وہ تو جنرل جیلانی بہتر سمجھ سکتے تھے کہ کتنی فوج بلانی ہے اس کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں پھر اس کو وہاں کیوں رکھا گیا مارشل لا کی تیاری کا حصہ جو تھا۔ چشتی صاحب وہاں اس لیے پہنچے تھے کہ اس بہانے سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ مارشل لا کے لیے جتنی فوج کی ضرورت ہوگی اسے وہاں اکٹھا کر لیا جائے' انہوں نے اس وقت وہاں جو پوزیشنیں لیں 5 جولائی 1977ء کو ان کے کام آئیں۔

اس ملک کی ایک بڑی بدقسمتی ہے اب محمود ہارون صاحب نے استعفیٰ دیا ہے۔ چھ سال وہ ضیاء کے ساتھ ہر جائز ناجائز میں شریک رہے' اب جناب وہ استعفیٰ دے کے ایک طرح سے شہید ہونا چاہتے ہیں اسی طرح سے فیض علی چشتی اب بڑے جمہوریت پسند بنتے ہیں۔ ورنہ یہ تو خود خواب دیکھ رہے تھے ضیاء الحق کو ہٹا کے ڈکٹیٹر بننے کا اس میں کامیاب نہیں ہوئے اب وہ بڑے جمہوریت کے علمبردار بن گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کو بھٹو کو مارنے کی کیا ضرورت تھی کس طرح سے اس کا جواز پیش کرتے' ان کی تو سکیم یہ تھی کہ بھٹو کو پکڑ کے پہلے ان کو سیاسی طور سے ختم کریں اسی لیے پیر پگاڑا سے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ان کے خلاف الیکشن وہ لڑیں گے اگر لاڑکانہ میں بھٹو صاحب کو پیر پگاڑا ہرا دیتا تو ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب کی سیاست ختم ہو جاتی تو پی این اے کی تحریک سے ان کو غلط اندازہ ہوا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بھٹو صاحب ہمیشہ کے لیے سیاسی طور سے ختم ہو گئے ہیں اور آخری کیل یہ ہوگی کہ جب لاڑکانے سے ان کو الیکشن میں ہرا دیں گے تو اس کے بعد پھر ان کا جو حشر کرتے پھر انہیں کسی خطرے کی فکر نہ رہتی اصل میں ان کے سارے اندازے اپ سیٹ ہو گئے۔

چشتی بڑے نپولین بن کے اُبھرے جب میں نظر بند تھا کسی نے چشتی صاحب سے کہا بھئی اس نے کیا کیا ہے اس کو تم لوگوں نے پکڑ کے رکھا ہوا ہے چشتی چھوٹے ذہن کا آدمی ہے اس نے کہا یہ بڑا مغرور تھا۔ ہمارا کوئی فنکشن اٹنڈ نہیں کرتا تھا اب میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔" اس کا بیک گراؤنڈ یہ تھا کہ یہ حضرت میرا خیال ہے' لاہور میں جی او سی تھے تو کبھی کبھی جب کور کمانڈ موجود نہیں ہوتا تھا تو اس کی جگہ بھٹو صاحب کو یہ ریسیو کرنے آیا کرتے تھے اور یتیموں کی طرح آ کے چلے جاتے تھے کوئی بھی ان کی پرواہ نہیں کرتا تھا میں یہاں آئی جی لگا ہوا تھا میں نے کبھی ان کو گھاس نہیں ڈالی تھی یہی ان کو میرے خلاف سب سے بڑا شکوہ رہا حالانکہ میں مغرور نہیں ہوں میں تو ایک عاجز بندہ ہوں غریب آدمی ہوں لیکن میں خواہ مخواہ کسی کی خوشامد نہیں کرتا۔ ایک دفعہ یہ آئے میری ان سے واقفیت نہیں تھی میں بھی وہاں تھا یہ آ کے لائن میں کھڑے ہو گئے بھٹو صاحب سے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

میں کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا ان کا اے ڈی سی میرے پاس آیا کہ جنرل صاحب یاد کر رہے ہیں میں نے کہا' جنرل صاحب مجھے یاد کر رہے ہیں اگر انہیں میرے ساتھ کام ہے۔ جیسے میں چل کے وہاں جا سکتا ہوں وہ بھی چل کے یہاں آ سکتے ہیں۔

بس اتنا سا ان سے سلسلہ ہوا میں بھول ہی گیا کہ کون چشتی ہے مطلب یہ کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انسان یاد رکھتا کہ یہ چشتی ہیں چنانچہ جب مارشل لا لگا تو میں نظر بند تھا انہوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں آپ کی گردن توڑ دوں گا۔ میں نے جواب میں کہا'' آپ میری گردن توڑ سکتے ہیں اسے جھکا نہیں سکتے۔'' اور نہ جھکا سکے۔

سب خدا کے اختیار میں ہوتا ہے آج کہیں اور کل کہیں لیکن اگر اس کا یہ خیال تھا کہ اس کے پاس بندوقیں ہیں توپیں ہیں اور میں اس کے حضور ہاتھ باندھ کے چلا جاؤں گا تو یہ غلطی پر تھا۔'' اس کا اپنا جو حشر ہوا وہ بھی آپ ہم نے دیکھ لیا۔

مارشل لا کے ڈرامے میں سب سے زیادہ اہم رول چشتی نے پلے کیا۔

بھٹو صاحب کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ آدمی خطرناک ہے اگر کچھ گڑبڑ کی تو یہ شخص کرے گا چنانچہ انہوں نے مجھے کہا بھئی یہ چشتی بڑی بڑھ بڑھ کے باتیں کرتا ہے اسے دیکھو کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے لیکن وہ آخری دن تھے' ان لوگوں نے پلان وغیرہ کر لی تھی۔ انکوائری کے لیے وقت نہیں تھا۔

چشتی کو احساس تھا کہ مارشل لا تو انہوں نے لگایا' اس لیے ضیاء الحق کو شروع شروع میں وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے' ان کے عزائم یہ تھے کہ ضیاء الحق کو ہٹا کے خود اقتدار سنبھال لیں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی بہن کی کوئی لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی وہ عام کہتی پھرتی تھی کہ میرا ماما صدر بن رہا ہے' ان کی سازشوں کا یہ حال تھا کہ بچوں تک کی زبان پر تھا۔

78ء میں انہوں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح سے ضیاء الحق کو اقتدار سے ہٹایا جائے پر ان کو جو تکلیف تھی وہ یہ تھی کہ پنڈی ان کا کور ایریا تھا لیکن باقی جو کور کمانڈ ان سے سینئر تھے ان کا کیا علاج کریں اس کے لیے اس نے کوشش یہ کی اپنے جو اعتماد کے پولیس افسر ہیں ان کو آئی جی لگایا جائے فرنٹیئر میں بھی اور پنجاب میں بھی اور سندھ میں بھی اور جب یہ اقتدار پر پنڈی میں قبضہ کریں تو یہ آئی جی حضرات پولیس کی مدد سے کور کمانڈرز کو ان کے حکم پر گرفتار کر لیں۔ اس قسم کی ان کی کوئی سکیم تھی لیکن ضیاء الحق کو بروقت اس کا پتہ چل گیا اور پہلے تو انہوں نے اس کی نگرانی شروع کر دی پھر پنڈی کا جو ایریا تھا ان کی کور سے علیحدہ کر لیا تو اس طرح سے حضرت کو موقع نہیں مل سکا اتنی اس میں فورس آف پرسنیلٹی نہیں تھی کہ باقی جو فوجی تھے ان کو اپنے ساتھ شامل کر سکتا بالآخر وہی ہوا جو اس قسم کی پاور پالیٹکس میں ہوا کرتا ہے کہ وہ تو نہ

نکال سکا البتہ ضیاء الحق نے اسے نکال دیا۔ چشتی صاحب وردی میں نہ ہوں تو کوئی تیل بیچنے والے لگتے ہیں۔ ٹیڑھی ٹانگیں کوئی پرسنلٹی نہیں۔

بھٹو کی موت کے سلسلے میں یہی جو لوگوں کی زبانی سنا مثلاً یہ کہ دستخط کرانا چاہتے تھے کچھ کاغذات پر بھٹو صاحب کی چیخ وپکار بھی سیل سے لوگوں نے سنی۔ پھر ٹھڈا ان کو مارا۔ قریب المرگ تھے یا مر چکے تھے۔ انہوں نے پھر لٹکا دیا۔ اس قسم کی کہانیاں جو عام لوگوں نے سنی ہیں وہ میں نے بھی سنیں لیکن اس کی تصدیق کے لیے باقاعدہ انکوائری ہو جب وقت آئے گا تو پھر ہی ممکن ہوگا۔

یہ شوشہ ہے یہ غلط الزام ہے کہ بھٹو صاحب نے 77ء کا مارشل لا لگوایا۔ جب الیکشن ہوئے پیپلز پارٹی کے خلاف ایجی ٹیشن چلی' تین شہروں میں منی مارشل لا لگا لاہور ہائی کورٹ نے لاہور کے مارشل لا کو ناجائز قرار دے دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب مارشل لا کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ فوج' پولیس اور ایف ایس ایف حکومت کے کنٹرول سے باہر چلی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوج جائز طور سے بھٹو صاحب کو کہہ سکتی تھی کہ آپ ہمیں استعمال نہیں کر سکتے مارشل لا نہیں لگا سکتے تو بھٹو صاحب کو سارے کا سارا انحصار پولیس اور ایف ایس ایف پر کرنا پڑتا لیکن پولیس اور ایف ایس ایف اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ امن وامان بحال کر سکتی۔

میرا خیال ہے' مئی (77ء) کا آخری ہفتہ تھا۔ ایجی ٹیشن کچھ کم ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے مجھے بلایا وہاں بیگم صاحبہ بھی موجود تھیں دونوں نے کوئی ایک گھنٹہ اس مسئلے پر مجھ سے بات کی' وہ مختلف سوال کرتے رہے اور میں انہیں اپنا تجزیہ بتاتا رہا کہ اگر ایجی ٹیشن دوبارہ شروع ہوتی ہے پھر ایف ایس ایف اور پولیس کے بس کی بات نہیں ہے' فوج آپ کے ساتھ کوآپریٹ نہیں کرے گی' بھٹو صاحب نے کہا پھر کیا کیا جائے میں نے کہا اس کا یہی حل ہے کہ اپوزیشن پارٹیوں سے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کیا جائے اور اس کام میں آپ کی بڑی شہرت ہے کہ آپ ہر کام صحیح وقت پر کرتے ہیں اور یہ کہ آپ مذاکرات اور بات چیت کے ماہر ہیں' آئین بنایا' شملے میں جا کے آپ نے اپنے جوہر دکھائے' اگر اپوزیشن پارٹیاں ایک دفعہ مذاکرات کی میز پر آ جائیں تو جیسا کہ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ جو بھی مسئلہ ہو' اس کا حل آپ تلاش کر لیتے ہیں اس لیے اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ پی این اے سے کوئی معاہدہ ہو جائے' یہی اس کا حل ہے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں کوشش کر رہا ہوں۔

اسی ملاقات میں انہوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا جس سے مجھے احساس ہوا کہ جرنیل اس موضوع پر ان سے پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا اگر مارشل لا پورے ملک میں لگ جائے تو پھر کیا پوزیشن ہوگی میں نے کہا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کون ہوگا اس لیے کہ ایک دفعہ وہ چیف

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا ظاہر ہے کہ چیف آف سٹاف میں نے کہا پھر آپ کا کھیل ختم' اگر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر چیف آف سٹاف ہوگا تو پھر آپ کی کیا پوزیشن ہوگی؟ انہوں نے ایک اور بڑی اہم بات کہی کہ میں دوسرا ایوب خان نہیں بنوں گا۔ جو آئین میں نے دیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ میں کسی کو غیر آئینی طور سے اختیار سپرد نہیں کروں گا۔ اگر کوئی لینا چاہتا ہے تو اس کی مرضی ہے اس کا مطلب تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی چیز تھی یا ان کو کسی نے یہ مشورہ دیا تھا یا ان پر دباؤ تھا فوج کی طرف سے یا کسی اور طرف سے لیکن یہ ان کا پکا ارادہ تھا کہ خود آئین کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے ورنہ میرا خیال ہے کہ اگر انہیں اپنی جان عزیز ہوتی تو اس وقت بھی وہ فوج سے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر کے جا سکتے تھے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو خطرے کا احساس نہیں تھا وہ غلط کہتے ہیں بھٹو صاحب پر پریشر تھا۔

بھٹو صاحب پر مارشل لا لگوانے کا الزام درست نہیں اصل میں انسان جیسا خود ہوتا ہے دوسروں کو بھی ویسے ہی سمجھتا ہے لکا خاں خود بڑے سیدھے' ایماندار اور نیک آدمی ہیں اور انہوں نے اپنے زمانے میں اقتدار پر قبضہ کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا نیک نیتی سے انہوں نے اپنے جونیئرز کی باتوں پر یقین کر لیا۔

مولانا کوثر نیازی کی شخصیت سے تمام دنیا واقف ہے۔ پیپلز پارٹی میں آنے سے پہلے ہر گورنمنٹ کی انٹیلی جنس ایجنسیوں سے ان کا تعلق تھا لوگوں سے پیسے لیتے رہے ہیں' انگلینڈ گئے تھے تو مجھ سے ملے تھے۔ وہ یحییٰ خان کے ایک بھیجے ہوئے مشن پر انگلینڈ گئے تھے اس سلسلے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہاں سے جب واپس آئے تو کچھ عرصے کے بعد پیپلز پارٹی جائن کر لی میں بڑا حیران ہوا کہ کس طرح انہوں نے پیپلز پارٹی جائن کی ہے۔ مولانا کا کردار تو ایسا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے ہے' اس کو مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اس ملک میں گھوڑے اور گدھے کی تمیز نہیں ہے۔ جو چرب زبانی کرے اور جو منافقت کا ماہر ہو اس ملک کے لوگ سادہ ہیں ان کی آنکھوں میں ایسے لوگ دھول جھونکتے جاتے ہیں۔ فائدہ اٹھاتے جاتے ہیں۔

مولانا اس مشن پر گئے تھے کہ وہاں کے اخبارات یحییٰ خان کی حکومت پر تنقید کرتے تھے۔ انہوں نے یحییٰ خان سے کہا کہ آپ مجھے بھیجیں' میں ان کو ٹھیک کر کے آتا ہوں بس وہ مزے کر کے آگئے سب کچھ گورنمنٹ نے دیا آنے جانے کا کرایہ دیا اور وہاں کا خرچہ دیا۔ اس سے اندازہ کر لیں کہ ایک طرف وہ یحییٰ خان کی حکومت کے لیے مشکلات دور کر رہے تھے اور پھر آ کے پیپلز پارٹی بھی جائن کر لیتے ہیں۔ وقت آنے پر اس کو بھی دھوکا دیا۔ اور ضیاء الحق سے مل گئے۔ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔"

پھانسی

یہ کہنا کہ یحییٰ بختیار نے بہت دیر کر دی۔ وہ بھی غلط بات ہے کسی واقعے کے بعد ہوشیار ہو جانا یہ ہر آدمی کر سکتا ہے مجھے یاد ہے کہ جب یحییٰ بختیار کیس لڑ رہے تھے تو اس وقت ہر شخص کا یہ مشورہ تھا اور میرا خیال ہے کہ بھٹو صاحب کا بھی یہ مشورہ تھا کہ جتنی بھی دیر ہو سکے کی جائے تا کہ ایک تو دنیا کا 'باہر کا' پریشر پڑ سکے اور پھر یہ کہ اس گورنمنٹ پر لوگوں کا اندرون ملک پریشر بڑھے کہ گورنمنٹ کے لیے ان کو پھانسی دینا مشکل ہو جائے اس وقت تو ہر شخص کا یہی مشورہ تھا۔ اب جب ایک فیصلہ ہو گیا تو آدمی ہوشیار بنتا ہے کہ یحییٰ بختیار نے یہ کر دیا وہ کر دیا حالانکہ انہوں نے نیک نیتی سے اور بڑی محنت سے وہ کیس لڑا یحییٰ بختیار کے علاوہ اور بھی تین چار وکیل تھے بھٹو صاحب سے جا کے ملتے تھے' بیگم صاحبہ سے ان کی ملاقات ہوتی تھی ان کو بھی جب موقع ملتا تھا کیس اٹنڈ کرتی تھیں تو اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ یحییٰ بختیار کو ہدایت دے سکتے تھے کہ آپ کیس میں جلدی کریں یا وکیل بدل دیتے لیکن وہ بالکل مطمئن تھے اور جو پالیسیاں تھیں یحییٰ بختیار اس کے مطابق کیس لڑ رہے تھے اور انہوں نے اپنی پوری نیک نیتی سے' بڑی محنت سے وہ کیس لڑا لیکن فوجی تو تہیہ کر چکے تھے کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینی ہے اور یہاں تک تہیہ کر چکے تھے کہ اگر بھٹو کی پھانسی سپریم کورٹ کنفرم نہیں کرتی تو پھر وہ ملٹری کورٹ سے سزا دلوا کر انہیں گولی مروا دیں گے ایسا لگتا ہے جیسے ان کو پہلے سے یہ ٹارگٹ ملا ہوا تھا کہ بھٹو صاحب کو کسی صورت میں نہیں چھوڑنا۔

بھٹو صاحب کو بھی پورا یقین تھا کہ یہ انہیں پھانسی دیں گے۔ ایسے پیغامات مجھے ملتے رہے بھٹو صاحب کو بالکل یقین تھا کہ یہ ان کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں اگر کوئی فارن پریشر اس قسم کا پڑتا تو اور بات ہے لیکن آخر میں ان کو اس کی بھی توقع نہیں تھی۔ تھوڑی بہت ظاہر ہے ہر انسان کو امید ہوتی ہے لیکن جہاں تک ان کے ذہن کا تعلق تھا ان کے فیصلے کا تعلق تھا اس میں انہیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جو لوگ ملتے تھے بھٹو صاحب انہیں کہتے تھے کہ یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔

4 جولائی 1977ء کو مارشل لا لگا تو بھٹو صاحب کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی رات میرا خیال ہے سب سے پہلا میں آدمی تھا جس کو انہوں نے پکڑا۔ اس کے بعد مسلسل دس مہینے میں نظر بند رہا۔ سیاستدانوں کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا لیکن سرکاری افسران کو نہیں چھوڑا تھا۔

اصل میں پہلے تو وہ مجھے بھٹو صاحب کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ میں محمد احمد خاں کے قتل کیس میں بھٹو صاحب کے خلاف گواہی دوں۔ میں نے جو صحیح واقعات تھے وہ ان کو بتائے جو ان کو سوٹ نہیں کرتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب مجھے بطور گواہ پیش کر سکیں یا یہ کہ میں ان کی کوئی امداد کروں وہ چاہتے تھے کہ سارے کیس میں میں اگر ان کی امداد اگر نہیں کر سکتا تو کم از کم وہ مجھ پر اتنا پریشر رکھیں کہ میں بھٹو صاحب کی کوئی مدد نہ کر سکوں پھر بار بار آ کے مجھے پریشان کرتے تھے۔ پریشرائز کرتے تھے لالچ دیتے تھے پہلے محمد احمد خاں کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی جب اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تو پھر وہ بھٹو صاحب کے خلاف الیکشن میں دھاندلی کا کیس کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں بھی بڑا پریشرائز کیا کہ آپ چونکہ سب سے اہم جگہ پر تھے اور بھٹو صاحب نے دھاندلی کا جو حکم دیا تو وہ آپ کے ذریعے سے دیا ہو گا آپ بتائیے کہ کس کس کو کہا گیا اور کیا ہدایات تھیں میں نے ان کو بتایا کہ یہ آپ لوگوں کے سارے مفروضے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ بھٹو صاحب نے ہدایت یہ دی تھی کہ دھاندلی بالکل نہیں ہو گی۔ انہوں نے پنجاب میں کمشنرز کی میٹنگ کی اور انہیں واضح ہدایت دی انہیں پتہ تھا کہ دھاندلی کے کیا نتائج ہوتے ہیں تو جتنا میں انکار کرتا اتنا ہی ان کا پارہ چڑھتا جاتا تھا بہر حال اس کے بعد انہوں نے مجھے ڈسمس کر دیا جب میں قید میں ہی تھا بھٹو صاحب کے کیس کا فیصلہ ہو گیا تھا ہائی کورٹ نے انہیں پھانسی کی سزا دے دی پھر حکومت نے مجھے جیل سے چھوڑا بد قسمتی سے بھٹو صاحب نے اس کیس کا بائیکاٹ کر دیا تھا ورنہ میں نے ان کو یہ آفر بھیجی تھی کہ میں آپ کا گواہ صفائی پیش ہوں گا لیکن چونکہ انہوں نے ڈیفنس پیش نہیں کیا تو وہ مرحلہ آیا ہی نہیں بہر حال جب میں باہر آیا تو میں نے ایک بیان حلفی دیا اور سارے حالات بتائے۔ محمد احمد خاں کیس کی ساری تفصیلات بھی بتائیں تو وہ حلفیہ بیان پھر بھٹو صاحب نے اپنی اپیل کے ساتھ لگایا اس سے یہ بڑے سیخ پا ہوئے۔ انہوں نے مجھے پھر جون میں پکڑ لیا اور اس دفعہ بجائے اسلام آباد میں رکھنے کے یا گھر میں نظر بند کرنے کے مجھے انہوں نے اٹک جیل میں بھیج دیا اور سی کلاس دی وہاں بھی دھمکیوں کا اور لالچ کا سلسلہ چلتا رہا بہر حال چھ مہینے میں وہاں رہا۔ اس دوران میں بھٹو صاحب کا اپیل کا کیس چل رہا تھا۔

اس زمانے میں عدالتوں کو اختیار تھا کہ وہ اس قسم کے مقدمات کے ریویو کر سکتی تھیں چنانچہ میں نے ہائی کورٹ میں حبس بیجا کا کیس داخل کیا تھا چھ مہینے کے بعد چونکہ ان کے پاس میٹریل کوئی نہیں تھا

لہٰذا انہیں مجھے چھوڑنا پڑا اس کے بعد بھٹو صاحب کا سپریم کورٹ میں فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی بینظیر بیگم بھٹو اور مجھے انہوں نے پکڑ لیا بیگم بھٹو کو انہوں نے نظر بند کر دیا مجھے اٹک بھیج دیا تو پھر اس کے بعد کوئی چار ساڑھے مہینے کے دوران بھٹو صاحب کو انہوں نے پھانسی دے دی۔ ہنگامے بھی ہوئے میں اس وقت جیل میں تھا۔ ساڑھے چار مہینے کے بعد انہوں نے مجھے چھوڑا۔ میں لاہور آ گیا میرا ارادہ پریکٹس کا تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ اس کو لائسنس نہ ملے۔ انہوں نے میرا کیس دو سال تک روکے رکھا پھر میں نے کراچی سے لائسنس لیا جب کراچی سے لائسنس مل گیا تو ظاہر ہے کہ یہ کچھ اعتراض نہیں کر سکتے تھے تو پھر ان کو مجبوراً لائسنس دینا پڑا۔

لائسنس دینے والی کمیٹی کو پریشرائز کرتے تھے۔ کراچی میں اس لیے کہ وہاں ذاتی مخاصمت نہیں تھی اور کراچی کا ماحول پنجاب سے بڑا مختلف تھا۔ پنجاب والوں نے پیپلز پارٹی سے ایک طرح کی محاذ آرائی کی ہوئی تھی حالانکہ پیپلز پارٹی سے میرا 77ء سے پہلے تو کوئی تعلق نہیں تھا بہر حال وہ سمجھتے تھے کہ میں پیپلز پارٹی کا ہی کوئی کارندہ ہوں اور اسی بنا پر مجھ سے بھی وہ اتنی ہی مخاصمت رکھتے تھے۔ اس کے بعد 80ء کے آخر میں میں نے یہاں پریکٹس شروع کی۔

ایم آر ڈی:

81ء میں جب ہائی جیکنگ ہوگئی، فوج نے بڑا جال پھیلایا اور لوگوں کو جیلوں میں بھیجا تو پھر مجھے پکڑ کے جیل میں بھیج دیا اس وقت چھ مہینے کے لیے انہوں نے مجھے میانوالی جیل بھیج دیا۔ جب میں وہاں سے باہر آیا تو جو پریکٹس شروع کی تھی اچھی خاصی چل پڑی تھی وہ بالکل ایک طرح سے ٹھپ ہوگئی اس لیے کہ سائل تو اپنے کام کے لیے آتے ہیں۔ ان کو جب یہ ہی معلوم نہ ہو کہ ان کا وکیل موجود بھی ہوگا کہ نہیں، اگلی تاریخ پر تو پھر پریکٹس کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال جب واپس آیا تو ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) بن چکی تھی انہوں نے پھر مستقل سیکرٹریٹ بنایا۔ اس میں مجھے پنجاب ایم آر ڈی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا۔ اس سلسلے میں میں نے بھاگ دوڑ کی۔ آرگنائز کیا، دسمبر 82ء میں انہوں نے پھر پکڑ لیا۔ میرا خیال ہے پورے پاکستان میں میں اکیلا ہی تھا جس کو انہوں نے پکڑا اور مجھے ساہیوال جیل میں بھیج دیا۔ پانچ مہینے میں جیل میں رہا اپریل 83ء میں واپس آیا اس کے بعد پھر تحریک کا سلسلہ بن چکا تھا۔ ایم آر ڈی نے تحریک چلانے کا اعلان کر دیا تھا۔

5 جولائی کو یوم سیاہ منایا گیا، اس دن میں نے ہائی کورٹ سے گرفتاری پیش کی۔ پھر اگلے سال اپریل 84ء تک قید رہا۔ چھ سال میں یہ میری کوئی چھٹی قید تھی۔ اب پھر جیل جانے کی تیاریاں ہیں ایم آر

ڈی کا پروگرام الیکشن کے بائیکاٹ کا ہے۔اس سلسلے میں ہم بھرپور کام کریں گے ظاہر ہے کہ اگر یہ الیکشن ہوئے یا نہ ہوئے ہر صورت میں وہ ایم آر ڈی کے لوگوں کو ضرور جیل میں بھیجیں گے۔

محمد احمد قتل کے صحیح واقعات تو یہ تھے جو میں نے اپنے بیان حلفی میں اس کا پورا ذکر کیا ہے کہ بھٹو صاحب ملتان دورے پر گئے ہوتے تھے میں بھی ملتان میں تھا تو رات کو کوئی بارہ ایک بجے میں سویا ہوا تھا ٹیلی فون بجا میں ہمیشہ ٹیلی فون ساتھ ہی رکھتا ہوں۔ڈی آئی جی وکیل خاں نے مجھے فون کیا کہ رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے اس کے باپ کو گولی لگی ہے اور وہ مرگیا ہے اور یہ کہ ہم اس کو کہہ رہے ہیں کیس رجسٹر کراؤ۔وہ کہہ رہا ہے کہ میں تو کیس رجسٹر نہیں کراتا اس لیے کہ مجھے انصاف کی کوئی توقع نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ کا اس میں ہاتھ ہے ظاہر ہے کہ مجھے کیس رجسٹر کرانے کا کیا فائدہ؟ میں نے وکیل خاں سے کہا اس کو کہو کہ جو وہ ایف آئی آر وہ دے گا اس کا حق بنتا ہے ہم اس کو رجسٹر کریں گے اور اس کی تفتیش کریں گے کوشش ہماری یہی ہوگی کہ ایمانداری سے انویسٹی گیٹ کریں اس کو آپ کہیں کہ جو ایف آئی آر وہ دینا چاہتا ہے وہ دے چنانچہ اس نے ایف آئی آر دی جس میں بھٹو صاحب کا نام آیا اگر کوئی سازش ہوتی بھٹو صاحب نے کی ہوتی تو کیا ہم احمد رضا قصوری کو یہ کہتے کہ جو ایف آئی آر چاہو دے دو۔ اگر دل میں ہمارے چور ہوتا تو ہم یہ نہ کہتے کہ جو ایف آئی آر وہ چاہے دے دے۔ چنانچہ اس نے بھٹو صاحب کا نام دیا۔ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔اس لیے کہ قانونی طور سے یہ اس کا حق تھا ورنہ یہ بھی ہم کر سکتے تھے اگر سازش ہوتی جیسے ہی ڈی آئی جی کو اطلاع ملی تھی یا ایس ایس پی کو اطلاع ملی تھی تو وہ صرف اتنا لکھتا کہ اس طرح سے اطلاع ملی ہے کہ ایک احمد رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے اور اس کا باپ مرگیا صرف اتنا سا کیس۔صرف اتنی F.I.R کافی تھی۔

دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب کی ہدایت تھی کہ جو بھی امپارٹنٹ کیس ہوں ان کو بتائے جائیں۔صبح میں نے ان کو کہا کہ اس طرح سے رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے اس کا باپ مرگیا ہے تو بھٹو صاحب نے بڑے تعجب کا اظہار کیا۔Who Could Have Done That

یہ کس نے کیا ہوگا میں نے کہا ہم تفتیش کر رہے ہیں کوشش کریں گے پتہ کرنے کی اس کے بعد انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ اس کیس کا کیا ہوا اور کیا اس کی تفتیش ہوئی۔پہلے تو مجھے خود پتہ نہیں تھا۔بعد میں بھی میں نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ ان کا نام ایف آئی آر میں ہے لیکن ان کو یہ پتہ چل گیا کہ ان کا نام ایف آئی آر میں ہے انہوں نے نہ کبھی غصے کا اظہار کیا۔نہ اس بات پر کبھی پریشانی کا اظہار کیا نہ مجھے کچھ کہا اگر کوئی سازش ہوتی یا بھٹو صاحب کے دل میں کوئی چور ہوتا تو اس کا بھی علاج کرنے کی وہ کوئی کوشش کرتے۔

اس کے بعد پھر جب ان لوگوں نے تفتیش شروع کی۔ جو بندوق استعمال ہوئی اس کے کار توس نہیں ملتے تھے اب جب رپورٹ آئی تو اس میں کہا گیا کہ اس بندوق سے تو کار پر فائر ہی نہیں ہوا۔ اب ان کو ہوش آئی کہ اس کا کیا کریں یہ تو ایک بہت بڑی شہادت ہے بھٹو صاحب کے حق میں۔ مولوی مشتاق، ایم انور کیس کے چلنے سے پہلے ہر قدم پر مشورہ کر کے تفتیشی افسران کو ہدایات دیتے تھے یعنی یہ اتنی بڑی سازش تھی کہ لوگوں نے اپنے ضمیر اپنا ایمان ہر چیز بیچ دی اور مولوی مشتاق کے ہی زیر ہدایت ساری تفتیش ہوئی اور وہی پھر بعد میں جج بھی ہوئے یہ سارے مل بیٹھ کے ڈسکس کرتے تھے۔

چنانچہ اس نے کہا کہ اس کا کیا جواب دوں تو میرے ماتحتوں کو جو پرانے تھے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل ان کو یہ کہا گیا کہ تم کہو کہ جو کارتوس تھے وہ ہمارا ڈی ایس پی آئی جی کی کوٹھی لے گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہاں کارتوس بدلے گئے ہیں لیکن اس بات سے تو معاملہ Cover-up نہیں ہو سکتا تھا اپیل میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو جاتا ہے یہ پہلا کیس ہے جس میں ہر شک کا فائدہ گورنمنٹ کو گیا ضیاء الحق کو گیا۔ یہ تو کوئی ثابت نہیں کر سکا کہ کارتوس بدلے گئے، ثبوت مکمل ہونا چاہیے اس پر چیف جسٹس فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کارتوس بدل دیئے گئے ہوں اسی طرح یہ ہوا جس جگہ سے فائرنگ ہوئی کارتوس ملے تین جگہ سے اس پر چیف جسٹس انوار الحق اپنے فیصلے میں لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس آدمی نے ایسے فائر کر کے، پھر اس طرح کیا ہو تو پھر وہ کارتوس ادھر گر گئے ہوں ہو سکتا ہے۔ ہر کام ہو سکتا ہے۔ اس شک کا فائدہ بھٹو صاحب کے خلاف اور گورنمنٹ کے حق میں دے رہے ہیں لیکن جن واقعات کا ذاتی طور پر مجھے علم تھا میں آئی جی تھا میں کورٹ میں بتا سکتا تھا بتانا چاہتا تھا وہاں گواہیاں پیش ہو رہی ہیں۔ آئی جی نے یہ کہا آئی جی نے یہ کہا اب آئی جی موجود ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا آدمی اگر مر جائے اس کے متعلق تو آپ کورٹ میں کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کہا تھا لیکن جب آدمی موجود ہے اس کو تو بلا کے پوچھیں بھئی تم نے یہ کہا تھا یا تم نے یہ کیا تھا جن لوگوں کو انہوں نے دم دبا کے اپنے حق میں کر لیا۔ ان سب کو تو وہاں پیش کر دیا گیا۔ مگر میرے جیسے آدمی سے اس کو انہوں نے قید میں رکھا۔

افسوس کی بات ہے کہ جس آدمی کی دم پر پاؤں رکھا۔ اس نے جھوٹی سچی گواہی دینے سے گریز نہیں کیا۔ مسعود محمود، سعید احمد خاں، عبدالوکیل خاں، ہلاکو خاں بڑے بڑے جو اپنے آپ کو پھنے خان کہتے تھے۔ ہر آدمی نے وہاں آ کے اپنا ایمان بیچا۔ مجھے بھی بڑے بڑے لالچ دیئے گئے۔ یہی کہ سفیر بنا دیں گے آپکو نوکری کا کچھ نقصان نہیں پہنچے گا ہم وعدہ کرتے ہیں۔ بس بھٹو صاحب کے خلاف آپ شہادت دے دیں۔ جنرل عبدالرحمٰن کو میرے اوپر لگایا ہوا تھا اس لیے لگایا تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں برادری کی بنیاد پر، پھر ایک دن میں نے ان سے کہا جرنیل صاحب آپ یہ جو ہر روز چھڑی ہلاتے ہوئے آ

جاتے ہیں اور مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کروں گا۔ آپ مجھے پھانسی لگا دیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے ناں آپ مجھے پھانسی لگا دیں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی میں نے اپنی زندگی بھرپور انداز سے گزاری ہے تو مجھے آپ ان چیزوں سے نہیں ڈرا سکتے۔ بڑی سخت کلامی ہوئی اس کے بعد پھر وہ نہیں آئے ورنہ یہ کہ کبھی کسی بریگیڈیئر کو ساتھ لیا ہوا کبھی چھڑی ہلاتے ہوئے آجاتے ہیں کہ راؤ صاحب آپ ہماری یہ امداد کر دیں آپ ہماری وہ امداد کر دیں تو میں نے کہا آپ نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے میں کوئی دو ٹکے کا پیشہ ور گواہ ہوں۔ میں نے چالیس ہزار کی فورس کو کمانڈ کیا ہے وہ لوگ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں کسی کردار کا مظاہرہ کروں۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں پوری پولیس کا بیڑہ غرق کر دوں۔ میں یہ ثابت کر دوں کہ ان کے سربراہ ایسے بے ضمیر ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے جو چاہے ان سے کہلوا لیا جائے۔ میں نے کہا کہ میں صرف راؤ رشید نہیں ہوں۔ میں سابقہ آئی جی ہوں پولیس کا وہ میرے جوان، میرے افسر مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں کسی کردار کا مظاہرہ کروں؟ آپ میری نوکری لے لیں گے مجھے پھانسی چڑھا دیں گے مجھے قید کر لیں گے ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔

جنرل عبدالرحمٰن نے پہلی میٹنگ میں ہی کہہ دیا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا آپ کا پوری طرح سے ہم خیال رکھیں گے۔ آپ ہماری امداد کریں۔ مجھے تو پتہ تھا جس دن سے یہ آئے اس دن سے انہوں نے بھٹو صاحب کے خلاف کیس بنانا شروع کر دیا تھا یہ جو کہتے ہیں کہ مری میں گالیاں دی تھیں تو اس سے ناراض ہو گیا یہ ساری بکواس ہے انہیں تو پہلے دن سے ہی یہ ٹاسک ملا تھا کہ بھٹو صاحب کو سیاسی طور سے اور جسمانی طور سے ختم کرنا ہے۔

اصل میں بھٹو صاحب جس زمانے میں سیاست میں آئے اور وزیر بنے حکومت میں رہے وہ کالا باغ کا دور تھا اور کالا باغ کو لوگ بڑا کامیاب سمجھتے ہیں ہماری سوسائٹی کے اپنے معیار ہیں اس میں لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی جمہوریت پسند ہے کہ نہیں غریبوں کے حقوق کا خیال کرتا ہے کہ نہیں لوگوں کی پگڑی تو نہیں اچھالتا جس کا رعب و دبدبہ ہو وہ بڑا کامیاب ہے تو بھٹو صاحب نے بھی جب سیاست میں آنکھ کھولی ان لوگوں کو سیاست میں پایا کسی جمہوری آدمی کے دور میں تو انہوں نے سیاست نہیں کی اگر قائداعظمؒ کے ساتھ ہوتے اگر آل انڈیا نیشنل کانگریس کی جدوجہد دیکھتے مسلم لیگ کی جدوجہد دیکھتے قائداعظمؒ کی قسم کے لوگوں کے ساتھ رہتے تو پھر ان کا انداز تھوڑا مختلف ہوتا۔ جبکہ ایوب خان اور کالا باغ کے زمانے کی سیاست کا انداز اور تھا اس زمانے میں جو کامیاب لوگ سمجھے جاتے تھے وہ سب بھٹو صاحب کے واقف تھے اور کسی نہ کسی صورت میں بھٹو صاحب ان کو لائے خاص طور سے ان لوگوں کو جو کالا باغ کے آس پاس تھے ان کا خیال یہ تھا کہ شائد کالا باغ کی کامیابی کا راز یہ لوگ تھے حقیقت میں ایسی کوئی بات

نہیں تھی۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ حق نواز ٹوانہ ٹمن، خدا بخش بچہ، کرنل شریف، یہ سارے لوگ کسی نہ کسی صورت میں کالا باغ کے جلو میں تھے لیکن وہ بات گزر چکی تھی رات گئی بات گئی والی بات تھی۔ نہ وہ حالات رہے تھے اور نہ ہی ان لوگوں کی کوئی افادیت تھی لیکن بھٹو صاحب ان لوگوں کو لے آئے تو ان کی وجہ سے پیپلز پارٹی میں بڑا انتشار پھیلا حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی ان ہی لوگوں کے خلاف بغاوت کے طور سے وجود میں آئی تھی ان لوگوں کو وہ جڑ سے اکھاڑ کے پھینکنا چاہتی تھی بھٹو صاحب سے لوگوں کو امید یہ تھی کہ جاگیرداری نظام جو صدیوں سے چل رہا ہے وہ بدلے گا اس لیے لوگ بھٹو صاحب کے ساتھ آئے تھے جب یہ لوگ پھر واپس آ گئے پیپلز پارٹی کے جو صحیح کارکن تھے ان کو اس بات کا بڑا صدمہ ہوا اس سے پھر پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا بھٹو صاحب کو جب پارٹی کی ضرورت پڑی تو پارٹی اس شکل میں موجود نہیں تھی جس شکل میں وہ ابھری تھی اور وجوہات کے علاوہ ان لوگوں کے بھٹو صاحب کے قریب آنے اور حکومت میں شامل ہونے سے بھی بھٹو صاحب کو بہت نقصان پہنچا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں نے کوئی انٹریگ کی ہو۔ لیکن یہ کہ ان کو سازش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی انکا وجود ہی بذات خود ایک انٹریگ تھا اس لیے ان کو کیا ضرورت تھی انٹریگ کرنے کی۔

76/75ء کے زمانے میں بھٹو صاحب جہاں بھی دورے پر جاتے تھے۔ جتنے ملک اور چودھری تھے وہ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے تھے رحیم یار خاں کا واقعہ مجھے یاد ہے وہاں گجرات کے چودھری اقبال ہیں گجر برادری کے انہوں نے وہاں بھٹو صاحب کو بہت بڑا استقبالیہ دیا وہاں انہوں نے سارے پنجاب سے اپنی گجر برادری کے لوگوں کو بلایا تھا ان میں لاہور کی گجر برادری کے امپارٹنٹ لوگ بھی تھے ایک صاحب جو ایوب خان کے زمانے میں لاہور کی لوکل سیاست میں کافی کرتا دھرتا تھے وہ بھی تھے ان کا نام عید محمد تھا وہ چودھری محمد حسین ٹائپ کے لوگوں میں سے ہیں۔ جلسہ میں جب چودھری عید محمد نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا۔ تو کہا کہ جی پہلے آدھا لاہور آپ کے (بھٹو صاحب کے) ساتھ تھا میرے آنے سے پورا لاہور آپ کا ہو گیا۔ اس پر رامے نے بڑا اچھا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو چودھری اور ملک ہیں ان کی حیثیت تو 70ء کے الیکشن میں پتہ چل گئی تھی کہ کتنے لوگ ان کے ساتھ ہیں اور اب بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آدھا لاہور بھٹو صاحب کے ساتھ تھا اور باقی کا لاہور اب آ گیا ہے ان سے پوچھیں کہ پیپلز پارٹی نے الیکشن جیتے اور سارے لاہور کی سیٹیں جیت لیں بھٹو صاحب نے لاہور میں الیکشن جیتا۔ ان چودھری صاحب نے کیوں نہیں روک لیا کہ آدھا لاہور ان کے ساتھ تھا رامے صاحب نے فی البدیہہ تقریر کی اور بڑی جرات سے جواب دیا۔

رامے صاحب کی جو انتظامی قابلیت ہے اس کو تو خیر چھوڑیں لیکن یہ ہے کہ تقریر رامے

صاحب اچھی کر لیتے ہیں اور ان کو باتیں بروقت سوجھتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کیمبل پور کے ملک اللہ یار (اب صوبائی وزیر) ہیں جب میں وہاں اے ایس پی تھا اس وقت سے میرے دوست ہیں میرے ان کے ساتھ اچھے مراسم ہیں وہ بھی بھٹو صاحب سے وفد میں مل کے آئے اور انہوں نے بھی اسی دورے کے دوران پیپلز پارٹی جائن کی۔75ء کی بات ہے جب وہ باہر نکلے تو میں نے انہیں چھیڑا میں نے کہا ملک صاحب مسلمان ہو آئے ہیں پروانہ لے آئے ہیں یا کافر ہو کر آئے ہیں وہ بیچارے پشیمان سے ہوئے اس لیے کہ ایک حساس آدمی کے لیے پارٹی بدلنا ندامت ہوتی ہے۔ خاص طور سے جب وہ وہ پارٹی جائن کرے جو اقتدار میں ہو تو ہر آدمی کا ضمیر تھوڑا بہت ہوتا ہے جو اسے ملامت کرتا ہے۔

جب بھٹو صاحب نے رفیع رضا کو الیکشن کا انچارج بنایا ہے تو انہوں نے الیکشن کے کام میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا جس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ سارے عمل کو فضول سمجھتے ہیں دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے الیکشن لڑنے کے لیے ٹکٹ نہیں مانگا اور فوری طور سے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی پہلے بیوی چلی گئی پھر خود باہر چلے گئے۔ حفیظ پیرزادہ صاحب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جب الیکشن اناؤنس ہو گئے پارلیمنٹ توڑ دی گئی تو رفیع رضا نے بھٹو صاحب سے کہا کہ آپ کے خلاف تو گہری سازش ہے آپ نیوکلیئر پروگرام چھوڑیں ورنہ آپ بڑی مصیبت میں ہوں گے بھٹو صاحب نے پوچھا کیا مصیبت ہو گی اس نے اشارہ دیا کہ آپ کی اور آپ کی فیملی کی جان خطرے میں ہے پھر اس نے کہا کہ آپ اس کو سرسری نہ لیں یہ بہت ہی سیریئس بات ہے پیرزادہ باہر بیٹھے ہوئے اپنے انٹرویو کا انتظار کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے ان کو بلا لیا بھٹو صاحب نے پیرزادہ سے کہا کہ اس کی ذرا بات تو سنو رفیع رضا نے کہا میں نے یہ بات کی ہے۔ پیرزادہ نے کہا کہ تمہیں کب کا پتہ تھا اس نے کہا کہ مجھے تو چند ہفتوں سے پتہ ہے پیرزادہ نے کہا کہ پھر تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا ہم الیکشن اناؤنس نہ کرتے پارلیمنٹ نہ توڑتے ہمارے ہاتھ کٹ گئے ہیں تو اس کے بعد تم بتاتے ہو تمہارا اس سے مقصد کیا ہے؟ پیرزادہ کہتے ہیں کہ رفیع رضا مجھے سے ناراض ہو گئے، کہ تم کون ہو مجھ سے پوچھنے والے اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ میسیج بھٹو صاحب کو بھجوایا گیا تھا اور اس وقت بھجوایا گیا جب بھٹو صاحب نے الیکشن اناؤنس کر دیئے تھے پارلیمنٹ توڑ دی۔ اس وقت تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہ گیا تھا انہوں نے بڑے اچھے وقت کا انتخاب کیا کہ بھٹو صاحب پر اس وقت دباؤ ڈالا جب سیاسی طور سے وہ سب سے کمزور پوزیشن میں تھے۔

آخر کار امریکہ نے ضیاء الحق اور پی این اے کے لیڈروں سے مل کر بھٹو کو ختم کرنے کی جو سازش کی۔ اس میں وہ کامیاب رہا اس سازش میں اور جنہوں نے اپنا منہ کالا کیا۔ ان میں جسٹس مولوی مشتاق، جسٹس انوار الحق اور ان کے ساتھی جج تھے۔ بھٹو کا گناہ یہ تھا کہ اس نے پاکستان کو ایک نیوکلیئر پاور

بنانے کی بنیاد رکھی۔ اور اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ اسی بل بوتے پر آج فوج کے جرنیل پاکستان میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اگر وہ آج اس کو قوم کا محسن اور ہیرو مانتے ہیں تو پاکستانی قوم اور اس کی فوج بھٹو کے ناجائز قتل کا کفارہ اس طرح سے ادا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے گناہ پر شرمسار ہو۔ بھٹو کی عزت بحال کرے اور اسے عزت واحترام سے اور پورے اعزاز کے ساتھ دوبارہ دفن کرے۔ ہمارے سامنے ممبا آئندے اور عدنان اندریس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

❖

تبصرہ

ڈاکٹر انور سدید

زیرِ نظر کتاب "جو میں نے دیکھا" کے مصنف راؤ رشید اگرچہ پاکستان پولیس کے افسر تھے لیکن ان کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق بسر کیا اور ترقی کی وہ راہیں کھولیں جو پروفیشنل پولیس کے بیشتر خواص پر بھی بند رہتی ہیں، انہوں نے زندگی کی ابتدا ایک لیکچرر کی حیثیت میں کی اور علی گڑھ میں 1946ء میں تحریک پاکستان کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت میں کام کیا لیکن ان کا سلسلہ وار عروج وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے سپیشل سیکرٹری کی حیثیت میں ہوا اور بھٹو صاحب جنرل ضیاء الحق کے فوجی شب خون میں معزول ہو کر پھانسی کے تختے تک پہنچ گئے تو راؤ رشید پر بھی سیاسی آلام اور سماجی صعوبتوں کے کئی ادوار گزرے لیکن انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کسی قسم کی گواہی دینے سے انکار کر دیا اور جھوٹے مقدمات کی اساس پر ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے، قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر نے ایوان اقتدار کے جو مناظر اپنی آنکھوں سے جنرل ایوب خان کے دور میں دیکھے تھے، ان سے زیادہ بھیانک واقعات اور سازشیں راؤ رشید نے بھٹو دور میں دیکھیں اور ایک پولیس افسر کی حیثیت میں ان کا تجزیہ بھی کیا۔ زیرِ نظر کتاب میں پاکستانی سیاست اور حکمرانی کی اندرونی کہانی انہوں نے اپنے مشاہدات سے مرتب کی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ان شخصیات کا مطالعہ کیا ہے جو ملک کی تاریخ سے کھیل رہے تھے اور اس کا جغرافیہ بگاڑ رہے تھے۔ واقعاتی اور زمانی اعتبار سے یہ کتاب راؤ رشید کی یادداشتوں کا مجموعہ اور زندگی کے طویل دورانیئے کا ایک نقش ہے لیکن درحقیقت انہوں نے جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، حنیف رامے، جنرل ضیاء الحق، نواب صادق قریشی، ائر مارشل اصغر خان، مسعود محمود، افضل سعید اور متعدد دوسرے اہم کرداروں کے شخصی زاویوں کو اپنی آنکھ

سے دیکھا اور ان کا تجزیہ اپنے قلم سے لکھا اور تاریخ کو ایک ایسی چشم دید شہادت فراہم کر دی ہے جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اب قومی تاریخ کی سازشوں کو وہ لوگ بھی بے نقاب کر رہے ہیں جو اس ملک کی تاریخ سازی یا جغرافیہ شکنی کو اقتدار کے ایوانوں میں خود دیکھ رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اب آزادی تحریر کو وہ مقام مل گیا کہ ہر شخص اپنا سچ لکھ سکتا ہے۔ اس کتاب کے ناشر فرخ سہیل گوئندی ہیں جو خود سیاسی ورکر ہیں لیکن اقتدار حاصل کرنے اور صداقت پر جھوٹ کا پردہ ڈالنے کی خواہش انہوں نے نہیں پالی۔ انہوں نے عوام کی آگہی کے لیے ایک اشاعتی ادارہ جاری کر رکھا ہے جو بین الاقوامی اور قومی شخصیات سے کتابیں حاصل کر کے اور روشن خیالی کے اعلیٰ مقاصد کے تحت شائع کرتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو حقیقی تاریخ ہے لیکن افسانے سے زیادہ دلچسپ اور "گریک ٹریجڈی" سے زیادہ المناک ہے۔ آئندہ دور کا مؤرخ اس کتاب کے مطالعے اور حوالے کے بغیر آزادی کے بعد کی صداقت پیش نہیں کر سکے گا۔

روزنامہ "نوائے وقت"

11 جولائی 2004ء سنڈے ایڈیشن

❖ ❖ ❖